

جب مجھے انگو کیا گیا

منگنی کی انگوٹھی

زندگی کے میلے

جرم اور سرخ سائی کی تین خونچکاں داستانیں

امید خان



پیش لفظ

احمد یار خان کی کہانیوں کا تیسرا مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔
تفنیث اور سراغ رسانی کی کہانیوں میں احمد یار خان کا نام سند کی
حیثیت کا حامل ہو گیا ہے۔ جرم اور سراغ رسانی کی داستانوں میں انگریزی
کے ایک انسانی نام شرک ہو مرنے ایسی شہرت پائی تھی کہ اس کی تحریروں
کے ترجمے دنیا کی ہر اُس زبان میں ہوئے جو لکھی اور پڑھی جاسکتی ہے۔
شرک ہو مرنے کا دردِ ختم تو نہیں ہوا لیکن ہماری نئی نسلاں نے اس کا غریب
کا درد نہیں دیکھا۔

شرک ہو مرنے کی مقبولیت کئی ایک فلم کاروں کو جرم اور سراغ رسانی کی
داستان گوئی کے میدان میں لے آئی مگر ان کی تحریروں پر نقالی سے آگے نہ
بڑھ سکے۔ انہوں نے اس سنت میں جنسی لذت اور مار دھار کی پاشنی
پیدا کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنجیدہ طبقوں میں جرم اور سراغ رسانی، جرم و
جاسوسی کہلانے لگی اور قابلِ قبول نہ رہی۔ اس میں حقیقت کی بجائے

گھٹیا درجے کی لذت پرستی اور بازاری قسم کی تفریح آگئی۔

جرم و جاسوسی کی مانگ لذت پرستوں اور تفریح پسندوں میں بڑھتی گئی اور یہی بازاری قسم کے ڈائجسٹ رسالوں کی مقبولیت کا باعث بنی اور اسی نے ان رسالوں کو سنجیدہ حلقوں اور شریف گھرانوں میں ناپسندیدہ قرار دیا۔ احمد یار نمان اور شرک ہومز کی کہانیاں پڑھیں تو آپ پولیس میں ہیں یا عام شہری یا آپ معاشرے کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتے ہیں، آپ احمد یار خان کو شرک ہومز کے مقابلے میں زیادہ قبول کریں گے کیونکہ احمد یار نمان انسانے نہیں سنا بلکہ چار دیواری کی ڈھکی چھپی دنیا اور اپنے معاشرے کے وہ ڈرامے پیش کرتا ہے جو پڑھو تو سنسنی خیز لگتے ہیں، لیکن عملی زندگی میں ہر روز ہمارے سامنے، ہمارے گھروں میں کھیلے جاتے ہیں۔

فہرست

یہ کہانیاں پڑھ کر آپ محسوس کریں گے کہ ہماری ذرا ذرا سی لغزشیں اور کوتاہیاں کیسے کیسے بھیا نکال لیئے بن جاتی ہیں۔ معصوم اور پاک بیٹیاں کہاں سے کہاں جا پہنچتی اور جو چیونٹی کو بھی مارنے سے گھبراتے ہیں، وہ قتل تک کر گزرتے ہیں۔

چار دیواری کی دنیا کی ذرا جتنی غلطی کا نتیجہ جب نقصانے میں پہنچتا ہے تو یہ بڑی ہی سنسنی خیز اور چوکنا دینے والی کہانی بن جاتی ہے۔ یہ کہانیاں احمد یار نمان کی زبانی سنیں۔

© حق امتیاز

مدیر ماہنامہ ”حکایت“ لاہور

جب مجھے انوا کیا گیا

رنگین کی انگوٹھی

زندگی کے سیلے

جب مجھے اغوا کیا گیا

لڑکی نے میرا ہاتھ اپنے ماتھے
میں لے لیا۔ میں نے اس کی
آنکھیں اور مسکراہٹ دیکھی تو
میں ایک بار تو کانپ ہی گیا۔ اس
مسکراہٹ سے اور آنکھوں کی
اس چمک سے بچنا آسان کام
نہیں تھا۔ تفتیش کا یہ مرحلہ بڑا
ہی صبر آزما ہوتا ہے۔ پتھر بھی
موم ہو جایا کرتے ہیں۔

بنا دیا۔ جنگ سے پہلے کا پرسا دکا نادر جنگ کے دوسرے سال لالہ
 پرس رام ملہری کنٹرکٹر اینڈ سپلائر بن گیا۔ نئے ترکھان حاجی نبی بخش
 اینڈ سنٹر بلڈنگ کنٹرکٹر اینڈ سپلائر برائے بلڈنگ میٹریل بن گیا۔
 اتنی زیادہ دولت نے ان لوگوں کے دماغ خراب کر دیئے جن
 کے تصور میں بھی کبھی اتنی زیادہ دولت نہیں آئی تھی۔ اس قبل
 کے مسلمان، ہندو اور عیسائی دیسی انگریز بن گئے۔ انہوں نے اپنی
 بیٹیاں آزاد کر دیں اور وہ انگریز افسروں سے ملنے چلنے لگیں۔ جو
 "نور دلتنے" شادی شدہ تھے، انہوں نے پرانے ماڈل کی بیویوں
 سے بدسلوکی شروع کر دی۔ خصوصاً مسلمانوں میں طلاقوں اور دوسری
 شادیوں کے واقعات زیادہ ہوئے۔ مسلمان کے پاس جب دولت
 آتی ہے تو وہ سب سے پہلے دوسری شادی کی سوچتا ہے۔ جب
 دوسری جنگ عظیم میں ہندوستانیوں کے وارے نیارے ہو گئے تو
 جراثیم بھی زیادہ ہو گئے۔ یہ واردات جو ہیں آپ کو سناتے لگا ہوں
 جنگ عظیم کے خصوصی کیسوں میں سے ایک ہے۔ یہ واردات اُن
 لوگوں کے لیے حیران کن نہیں ہوگی جنہوں نے جنگ عظیم کا زمانہ
 دیکھا اور جنہیں اُس وقت کی ہندوستانی سوسائٹی کا انقلاب اچھی
 طرح یاد ہے۔

ہندوستان کی ایک چھاؤنی کا تھانہ میرے پاس تھا۔ ایک روز
 تھانے میں ایک کار آئی۔ اس میں سے ایک ہندو نکلا۔ وہ ایم۔ ای۔ ایس

دوسری جنگ عظیم کا دوسرا سال تھا۔ ہندوستان کی چوٹیوں
 کے پر نکل آئے تھے۔ یہ پرفوجی سامان سپلائی کرنے کی ٹھیکیداریوں
 نے مہیا کیے تھے۔ پورا ہندوستان فوجی کیمپ بن گیا تھا جس کسی
 نے فوجی نوکری کی کبھی سوچی بھی نہیں تھی وہ بھی بھرتی ہو گیا۔ فوجی بھرتی
 کا معیار صرف یہ رہ گیا تھا کہ جوان چلنے پھرنے اور رائفل اٹھانے کے
 قابل ہو۔ سپلائی کی ٹھیکیداریوں کا یہ عالم تھا کہ درزی صبح و شام
 دریاں تیار کرتے رہتے تھے۔ بڑھئی لکڑی کے کھوکھے بناتے رہتے
 تھے۔ راج مزدور چھانہریوں میں بارکیں بناتے دکھائی دیتے تھے۔ جگہ جگہ
 عارضی ہوائی اڈے بننے لگے۔ بیروزگاری ختم ہو گئی اور گھروں میں پیسہ عام
 ہو گیا۔ جن لوگوں نے دریاں، لکڑی کے یکے اور دیگر سامان سپلائی
 کرنے کے ٹھیکے لیے وہ رات ہی رات لکھ پتی ہو گئے۔ ان میں
 بل پاس کرنے والے دیسی افسروں اور کلرکوں کو رشوت نے دوات مند

کا ٹھیکیدار تھا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ایم۔ ای۔ ایس فوج کا ایک محکمہ ہے جسے ٹھیکیداروں کا محکمہ کہا جاتا ہے۔ جنگ عظیم میں جس قدر لوٹ کھسوٹ اور رشوت اس محکمے میں ہوئی تھی وہ شاید ہی کسی اور محکمے میں ہوئی ہوگی اب بھی یہ محکمہ سونے کی کان ہے۔۔۔ ہندو جنگ سے پہلے بھی پائے کا کاروباری آدمی تھا۔ جنگ میں ایم۔ ای۔ ایس کی ٹھیکیداری نے اسے کار اور بہت بڑی کوٹھی دی۔ اس نے یہ رپورٹ دی کہ اس کی جوان اور غیر شادی شدہ بیٹی جس کی عمر تیس سال تھی، گزشتہ تین دنوں سے لاپتہ ہے۔

میں نے پہلا سوال یہ کیا — ”کسی کو باہتی ہوگی؟“

”نہیں“ اس نے جواب دیا۔ ”اگر ایسی بات ہوتی تو میں رپورٹ درج کرانے نہ آتا۔ وہ آخر باغ ہے۔ مجھے کورٹ میں ذیل کر سکتی ہے۔ اسے اغوا کیا گیا ہے اور یہ بھی خدشہ ہے کہ اسے قتل کر دیا گیا ہو۔“

”اغوا اور قتل کی وجہ؟“

”میری کسی کے ساتھ دشمنی نہیں“ اس نے جواب دیا۔ ”میں نے صرت خدشے کا اظہار کیا ہے۔“

”خدشے کا کوئی باعث اور کوئی جواز ہونا چاہئے“ میں نے کہا۔ ”یادوں کریں کہ کسی پر آپ کو شک ہے تو اس کا نام پتہ بتادیں“ وہ خاموش رہا۔ بے چین معلوم ہوتا تھا۔ میں نے کہا — ”رقابت

بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ نے لڑکی کا رشتہ کہیں اور طے کر دیا ہو جو لڑکی کو پسند نہ ہو اور وہ کسی ایسے آدمی کے ساتھ چلی گئی ہو جسے آپ جانتے ہی نہ ہوں۔“

”رشتہ تو اسے کوئی بھی پسند نہیں“ اس نے رنجیدہ سے لہجے میں کہا۔ ”کہتی ہے کہ اپنی پسند کی شادی کروں گی۔ لہذا میں نے اس کے رشتے کے متعلق سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ لڑکی آزاد ہے“ میں نے کہا۔ ”بلکہ سرکش اور باغی کہا جائے تو مناسب ہوگا۔ یعنی جس لڑکی کے آگے باپ نے بھی ہتھیار ڈال دیئے ہیں، وہ سرکش ہی ہوگی۔“

”ضرورت سے زیادہ سرکش ہے“ اس نے جواب دیا۔ ”اور اس نے جھجک کر کہا۔“ اور وہ غیر معمولی طور پر خوبصورت ہے۔“

اس نے ایک لفافے میں سے دو تصویریں نکال کر میرے آگے رکھ دیں۔ دونوں لڑکی کی تھیں۔ پوز مختلف تھیں۔ ایک سامنے کا اور ایک پہلو کا یعنی پروفائل۔ وہ واقعی غیر معمولی طور پر خوبصورت تھیں۔

”میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کہاں ہے؟“ لڑکی کے باپ نے کہا۔ ”زندہ ہے؟ اور وہ جہاں کہیں ہے وہاں اگر اپنی مرضی سے گئی ہے تو میں مجبور ہوں۔ آپ بھی مجبور ہیں۔ مجھے یہ تسلی تو ہو جائے گی کہ وہ زندہ ہے اور جہاں بھی ہے وہاں خوش ہے۔“ اس کے آنسو نکل آئے۔ اس نے کہا۔ ”یہ میری پہلی بچی ہے۔ اس کے

ساتھ مجھے اتنا پیار ہے جتنا اپنے دو بیٹوں سے بھی نہیں۔
میں نے ذہن میں لوٹ کر لیا کہ لڑکی بے جا پیار سے بگڑی ہوئی
ہے۔ ایسے بچے جو ان ہو کر سن مانی کیا کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ اس
سے پہلے کبھی ایک دو دنوں کے لیے غیر حاضر رہی ہے؟
”نہیں“ اُس نے جواب دیا۔ ”سوشل لڑکی ہے۔ کبھی کبھی رات
ذرا دیر سے آتی ہے لیکن آجاتی ہے۔“

”سوشل ہے؟“ میں نے قدرے چونک کر پوچھا۔ ”اُس کی
وضاحت کر دیں۔ کس قسم کی سوسائٹی میں جاتی ہے؟“
”میرا زیادہ تر تعلق فوجی افسروں کے ساتھ ہے۔“ اُس نے
جواب دیا۔ ”میں ان کی پارٹیوں وغیرہ میں جانا رہتا ہوں۔ کچھ افسروں
کو معلوم تھا کہ میری بیٹی جو ان ہے اور بی۔ اے ہے۔ انہوں نے کہا
کہ ہر پارٹی میں عورتیں آتی ہیں ان میں انگریز عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ اس
لیے اپنی بیٹی کو ساتھ لے آیا کرو، تعلقات بڑھیں گے۔ مجھے اب اس غلطی
کا احساس ہو رہا ہے کہ میں نے اُسے پارٹیوں وغیرہ میں لے جانا شروع
کر دیا۔ لڑکی بڑی ہوشیار نکلی۔“

”پھر اُس نے خود پارٹیوں وغیرہ میں جانا شروع کر دیا؟“ میں نے پوچھا۔
”جی ہاں!“ ”اُس نے کہا۔“ اُس نے دو تین دنوں میں انگلش
ڈانس سیکھ لیا تھا۔“

مجھے اب زیادہ سوال کرنے کی ضرورت نہیں تھی اور یہ پوچھنا

تو میں نے ضروری ہی نہیں سمجھا کہ لڑکی کا چال چلن کیسا ہے۔ وہ توصات
ظاہر تھا کہ کیسا ہوگا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ مجھے یہ شک ہوا کہ کسی افسر یا
افسروں کے ساتھ کسی پہاڑی مقام مثلاً شملہ، مسوری یا ڈھوڑی چلی
گئی ہوگی۔

اس کے بعد میرے دماغ میں ایک اور جگہ آئی جہاں اُس کے جلنے
کا امکان تھا۔ یہ جگہ تھی کسی مہاراجے یا نواب کا حرم۔ آج کل نوبہ مہاراجے
اور نواب بھوکے مر رہے ہیں۔ انگریزوں کی بادشاہی میں یہ لوگ بھی
بادشاہ تھے۔ اپنی اپنی ریاست میں شہنشاہ تھے۔ ان کے پاس اندھی
دولت تھی۔ ان کے ایجنٹ گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ جہاں کوئی خوب صورت
لڑکی نظر آئی اُسے حرم کے لیے پھانسنے یا خریدنے کی کوشش کرتے تھے۔
بڑی بڑی طرح لڑکیاں کسی نواب صاحب کی چہیتی بیگم بلکہ رانی بننے کے
لیے گھر سے بھاگ جاتی تھیں۔ حرم میں جا کر انہیں پتہ چلتا تھا کہ ان جیسی
بیسویں لڑکیاں محل کی قیدی اور بے نکاحی بیویاں بنی ہوئی ہیں۔
مجھے ڈر تھا کہ اگر وہ بھی رانی بننے کے چھانسنے میں آگئی ہے تو پھر
اس کا سراغ بھی نہیں ملے گا۔ برآمدگی اور واپسی کا تو سوال ہی پیدا نہیں
ہوتا تھا۔ میں نے اس کے باپ سے اس خطرے کا ذکر کر دیا۔

اُس نے کہا۔ ”آپ یہ سراغ لگا دیں کہ کون سے مہاراجے یا نواب
کے پاس ہے۔ میں فوج کے انگریز افسروں کا اثر استعمال کر کے اُسے وہاں سے
نکالوں گا۔“ اُس نے ذرا سوچ کر کہا۔ ”آپ اگر اس میں ذاتی دل چسپی

جو ہندوستانی معاشرے میں جنگِ عظیم میں پیدا ہوئی تھی۔ یہ حرام کی دولت کی پیداوار تھی۔ جب ملک تقسیم ہوا تو یہ سوسائٹی پاکستان کے حصے میں بھی آئی۔ اس کی آمدنی کا ذریعہ سرکاری ٹھیکیداریاں اور رشوت تھی۔ اس لیے اس سوسائٹی نے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے پاکستان کی بنیاد ہی ٹھیکیداریوں اور رشوت پر رکھی۔ اب آپ اپنے ملک میں معاشرے کی اس کلاس کو دیکھ سکتے ہیں۔ ان لوگوں کے گھروں میں یہی حرکتیں ہوتی ہیں جو میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ بیٹیاں سوشل۔ ہر کسی سے ملتی ملاتی اور بدکاری کرتی ہیں۔ خاوندوں اور میوں میں ناچاتی رہتی ہے۔ لڑکیاں من مانی کرتی ہیں مگر پولیس تک کوئی واردات نہیں پہنچتی کیونکہ اس بے حیائی اور بدکاری کو ان لوگوں نے ”تہذیب“ میں شامل کر لیا ہے۔

اس ہندو ٹھیکیدار نے اپنی بیٹی کی گمشدگی کی رپورٹ اس لیے دی تھی کہ ابھی وہ لڑکی کی اس حرکت کو جرم سمجھ رہا تھا۔ ”نئی تہذیب“ نے ابھی جڑ نہیں پکڑی تھی۔ خود میرے جیسے ہی یہ حرکتیں تیری اور قابل اعتراض تھیں اور ہیں۔ مجھے جب یہ پتہ چلا ایک ہندو لڑکی کی وجہ سے ایک مسلمان گھرانہ آجڑا رہا ہے تو میں نے اس کیس میں ذاتی دلچسپی لینے کا ارادہ کر لیا۔

میں تو میں آپ کو اتنی زیادہ قیس دوں گا جتنی آپ مانگیں گے۔ میری رپورٹ رجسٹر کریں یا نہ کریں، یہ آپ کی مرضی ہے۔ اسے پرائیویٹ کیس سمجھیں۔ میں نے اُسے بتایا کہ یہ میرا فرض ہے جس کی میں کوئی قیس نہیں لوں گا۔ اُس نے کہا۔ ”مجھے ڈر ہے کہ آپ نے یہ کیس رجسٹر میں ڈال دیا تو رجسٹر میں ہی پڑا رہے گا۔ آپ کے پاس اور بھی بہت سے کیس ہوں گے“ میں نے اُسے یقین دلانے کی بہت کوشش کی کہ میں ٹال مٹول نہیں کروں گا۔ پھر اُسے کہا کہ وہ ذہن پر زور دے کر اور اچھی طرح یاد کر کے بنائے کہ لڑکی کا زیادہ تر میل جول کس کس کے ساتھ تھا اور اسے کس پر شک ہو سکتا ہے۔ اُس نے سب سے پہلے ایک مسلمان میجر کا نام لیا۔ یہ ایم۔ اے۔ ایس کا میجر تھا۔ اس کے علاوہ بھی اُس نے چند ایک نام بتائے۔ لیکن زیادہ زور اسی مسلمان میجر پر دیا اور کہا۔ ”چھاؤنی میں سیلینڈل بن گیا ہے۔ اس میجر کے در نیچے ہیں۔ اس کی بیوی اپنے والدین کے گھر چلی گئی ہے“

میرے مزید پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ میجر کی بیوی پردہ نہیں کرتی۔ امیر کبیر والدین کی بیٹی ہے۔ سوشل نہیں۔ اچھی دل کش شکل و صورت کی عورت ہے۔ میجر کی اور اس کی ناچاتی ہو گئی ہے۔ میری لڑکی کو زیادہ تر اسی کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔

بہت سی اور ضروری باتیں پوچھ کر میں نے رپورٹ درج کر لی اور ہندو ٹھیکیدار چلا گیا۔ یہ اُس لڑکی کی کلاس سوسائٹی کا ڈرامہ معلوم ہوتا تھا

آدمی عیاش تھا

چھاؤنی میں یہ سہولت ہوتی ہے کہ وہاں افسروں کے بیروں، خاندانوں اور بھنگیوں کی ایک فوج رہتی ہے۔ یہ لوگ پولیس کے لیے کاآمد ہوتے ہیں۔ میں انہیں بہترین تجربہ کراتا تھا۔ پولیس کے خلاف بھی مجری کرتے تھے اور حق میں بھی۔ دیسی افسروں اور اُن کی بیویوں کے ادھر ادھر ناجائز تعلقات میں یہ لوگ خاص پارٹ ادا کرتے تھے۔ کوٹھیوں اور بنگلوں کے اندر کی دنیا کی صحیح خبریں دیتے تھے۔ میں نے ان میں سے کم و بیش بیس آدمی اپنی ”مخبر پلٹن“ میں شامل کر رکھے تھے۔ یہ کیس چونکہ ایم۔ ای۔ ایس کے ایک ٹھیکیدار کی بیٹی کا اور ایم۔ ای۔ ایس کے ہی ایک میجر کا تھا، اس لیے میں نے ایم۔ ای۔ ایس کے آفیسرز میں سے دو خصوصی بیروں کو بلوایا۔

وہ رات کو کام سے فارغ ہو کر آئے۔ لڑکی کے متعلق انہوں نے نہایت دل چسپ اور لئیز باتیں بنائیں اور کہا کہ انگریز افسرانہی میہموں کو بھول گئے ہیں۔ ان بیروں کی اطلاع کے مطابق لڑکی آفیسرز میں سے بڑے کھانے میں ضرور جاتی ہے۔ انگریز افسروں کے ساتھ ڈانس کرتی ہے اور اس کا باپ بھی ساتھ ہوتا ہے۔ ان دونوں نے لڑکی کے حسن کی تعریفیں اپنی زبان اور اصطلاحوں میں بڑے ہی اشتعال انگیز انداز سے کیں۔

مسلمان میجر کے متعلق انہوں نے بتایا کہ اُس کی عمر تیس سال سے ادھر ہو گئی ہے۔ عیاش آدمی ہے۔ ٹھیکیداروں سے بہت ثروت لیتا ہے۔ اُس کی بیوی خوبصورت ہے اور اس کے دو بچے ہیں۔ وہ کبھی بیس میں نہیں آتی۔ وہ چھاؤنی میں ایک بنگلے میں رہتی ہے۔ ان بیروں کی معرفت اگلے روز بنگلے کے دو اور ملازم آگئے۔ یہ دونوں مسلمان میجر کے بنگلے کے پڑوس کے بنگلوں میں ملازم تھے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ ہندو لڑکی کبھی کبھی اس میجر کے گھر آتی ہے اور انہیں باہر بھی اکٹھے دیکھا گیا ہے۔ افسروں میں اکٹھے بیٹھنے والی یہ ایک بی لڑکی نہیں تھی، اور بھی بہت سی ہندو، سکھ اور عیسائی لڑکیاں ایڈوائس ہو گئی تھیں۔ مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ اُن میں مسلمان لڑکیاں بھی تھیں۔ ان سب کے باپ یا خاندان انہیں انگریز افسروں سے ملا کر بلکہ اُن کے حوالے کر کے فخر کیا کرتے تھے لیکن یہ ہندو لڑکی جو لاپتہ ہو گئی تھی بہت مشہور تھی۔ بیروں نے بتایا کہ بہت شوق اور چلبلی لڑکی ہے۔

مسلمان میجر کے متعلق انہوں نے بتایا کہ عیاش اور شرابی ہے۔ تقریباً ایک مہینے سے وہ بنگلے میں اکیلا رہتا ہے۔ اُس کی بیوی اپنے والدین کے گھر چلی گئی ہے۔ میاں بیوی میں اسی لڑکی پر جھگڑا رستا تھا۔ ایک گھروں ملازم نے یہ سچی رازوں سے بتایا کہ میجر کی بیوی کے ایک آدمی کے ساتھ تعلقات ہیں۔ بیوی اسی شہر کے مضافاتی علاقے

گھر سے نکلی ہے تو وہ کہیں اور روپوش ہے۔

مجھے یہ سوال پریشان کر رہا تھا کہ اتنی آزاد لڑکی اگر میجر کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے تو اسے گھر سے بھاگنے اور روپوش ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے باپ نے اُس کی شادی اُنسی کی مرضی پر چھوڑ دی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ باپ نے اسے یہ بھی کہا ہو کہ اگر اس نے مسلمان کے ساتھ شادی کی تو اُسے قتل کر دیا جائے گا۔ پھر یہ خیال بھی آیا کہ میجر اپنی بیوی کو طلاق دے کر شادی کرے گا اور پھر یہ خیال بھی آیا کہ یہ مسلمان میجر بالکل ہی بے قصور ہو سکتا ہے۔

چنناؤنی میں ایک گورار جمبٹ بھی تھی جس کے سپاہیوں نے تین چار بار بازار میں شراب پی کر مہل بازی کی تھی۔ ان انگریز سپاہیوں کو ہم ٹامی کہا کرتے تھے بلکہ ہندوستان میں مشہور تھا کہ گورے سپاہی اپنے باپ کی نسل سے نہیں ہوتے، سب حرامی ہوتے ہیں۔ اس رجمنٹ کے چار سپاہیوں نے ایک بار ایک دیہاتی لڑکی کو کپڑا بیا تھا۔ دیہاتیوں نے گوروں پر لائیوں سے حملہ کر دیا اور لڑکی کو بچا لیا۔ مجھے یہ خبر بھی نظر آنے لگا کہ لڑکی کہیں ان گوروں کے ہاتھ نہ چڑھ گئی ہو۔ اس صورت میں انہوں نے اسے خراب کر کے جان سے ہی مار دیا ہوگا۔ اس صورت میں ایک دیسی مختانیدار جس مجبور اور بے بس تھا۔

میں رتی تھی۔ اس کا باپ امیر قسم کا زمیندار تھا۔ اراچی مزارعوں کے سپرد تھی۔ بہر حال یہ سب حرام کی دولت بے جا آزادی اور انگریزوں کی نقل کرتے ہوئے بے حیا ہو جانے کا جگر تھا۔ میں نے اس میجر کے خانسامے کو چنناؤنی کے دوسرے ملازموں کی معرفت قابو کر لیا۔ اس نے میجر کا چال چلن وہی بتایا جو دوسرے بتا چکے تھے۔ بہت دیر تک پوچھ گچھ کرنے کے بعد نئی بات یہ سامنے آئی کہ ایک انگریز لیفٹیننٹ کرنل جس کا نام جانسن بتایا گیا، اکثر اس میجر کے گھر آتا ہے۔ دو تین بار یہ لڑکی بھی کرنل جانسن کے ساتھ آئی تھی۔ تینوں الگ کمرے میں بیٹھے شراب پیتے رہے تھے۔

خانسامے نے یہ بھی بتایا کہ میجر کی بیوی کا ایک امیر کبیر آدمی کے ساتھ دوستانہ ہے۔ اُس کا اصل نام کچھ اور تھا۔ آپ اسے ارشد کہہ لیں۔ یہ آدمی میجر کے سسرال کی برادری کا تھا۔ میجر کی بیوی کوئی دو مہینے سے میجر کے ساتھ کچی گچی رہنے لگی اور اُس نے ارشد کے ساتھ اس حد تک دوستانہ کر لیا کہ میجر کی موجودگی میں ارشد کے ساتھ باہر پہلی باقی تھی۔ یہ بھی انکشاف ہوا کہ درد دفعہ کرنل جانسن میجر کی غیر ممانعتی میں میجر کی بیوی کے پاس آیا اور بیوی نے اسے بڑے غصے سے گھر سے نکال دیا۔ خانسامے نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ گذشتہ ایک مہینے سے یہ ہندو لڑکی میجر کے پاس نہیں آئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ لڑکی اگر اس میجر کی خاطر

ہندو لڑکی کے ساتھ تعلقات

تمام امکانات پر غور کریں میں نے سب سے پہلے میجر کی بیوی سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ کورا ذہنی لے کر میجر سے ملنا بیچار تھا۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ کہہ دیتا کہ جی ہاں لڑکی میرے پاس ہے۔ میں نے اُس کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کر کے اسے گھیرنا بہتر سمجھا تھا۔ اس کی بیوی کے گھر جا کر میں اُس کے باپ سے ملا اور اُسے بتایا کہ ایک ہندو لڑکی لاپتہ ہو گئی ہے، جس کے باپ نے میجر پر شک کیا ہے اور میں میجر کی بیوی سے میجر کے چال چلن اور اس لڑکی کے ساتھ تعلقات کے متعلق کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

باپ نے یعنی میجر کے سسر نے میجر کے خلاف بہت سی باتیں کہیں جن میں سے کوئی ایک بھی بات میرے کام نہیں آ سکتی تھی۔ اپنے دل کا غبار نکال کر اُس نے مجھے اپنی بیٹی سے ملنے کی اجازت دے دی۔ اس لڑکی کو عورت کہنا زیادتی تھی۔ وہ جوان لڑکی تھی۔ دو بچوں کی ماں ہوتے ہوئے اسل عمر سے چھوٹی لگتی تھی۔ اُسے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ میجر اتنی دل کش لڑکی کے مقابلے میں کسی اور کو پسند کرتا ہے لیکن میجر عیاشیوں کا دلدادہ تھا۔ اس

کی بیوی کے متعلق میں نے یہ رائے قائم کی کہ اسے دیکھ کر کوئی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے جب میرے ساتھ باتیں شروع کیں تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ سیدھی سادی گھریلو عورت نہیں۔ باتیں پُر اثر کرتی تھی اور بولنے کا انداز بادقار تھا۔ وہ اپنی حیثیت، اپنے مَن اور اپنی قدر و قیمت سے پوری طرح آگاہ تھی۔

اُس نے بتایا کہ اُسے گھر میں روپے پیسے کی کوئی تنگی نہیں بلکہ گھر میں پیسہ ہی پیسہ تھا۔ یہ سب ٹھیکیداروں سے لی ہوئی رشوت تھی۔ اس اندھے پیسے نے اس کے خاوند کو پانی بنایا۔ رشوت کی پہلی رقم گھرائے ہی اُس نے شراب پینی شروع کر دی۔ پھر بیوی کو بھی شراب پینے پر اکسانے لگا، مگر وہ نہ مانی۔ بیوی کو وہ انگریزوں کی طرح ہر جگہ اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ بیوی نے یہ بھی پسند نہ کیا۔ اس نے صرت اتنا کیا کہ برقعہ تار دیا اور اُس کے ساتھ باہر جانے لگی لیکن صرت کچھ دیکھنے یا سیر وغیرہ کے لیے۔ یہ عورت صرت آٹھ جماعتیں پڑھی ہوئی تھی۔ میجر نے اسے انگریزی پڑھانی شروع کر دی اور اس کے ساتھ ہی گھر میں افسروں کی دعوتیں کرنے لگا جن میں بیوی کو ساتھ رکھتا تھا۔

”یہ لوگ اس قدر بے حیا اور بدنیت تھے کہ میرے خاوند کے سامنے میرے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کرتے تھے اور بیہودہ باتیں کہہ گزرتے تھے۔“ اس عورت نے کہا۔ ”میں دیکھ

دیکھ کر حیران ہوتی تھی کہ ان لوگوں کی اسلیٹ کیا ہے اور یہ کیا پنہ کی کوشش کر رہے ہیں؟
مختصر یہ کہ ناندی اسے ایڈوانس اور سوشل بنانے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ نہ مانی۔

گذشتہ چھ مہینوں سے اُس کے خاندن کے تعلقات اس ہندو لڑکی کے ساتھ شروع ہوئے۔ وہ میجر کے گھر میں ایک دعوت میں آئی تھی۔ اس کے بعد میجر نے اپنی بیوی کو سوشل بنانے کی کوششیں ترک کر دیں اور اُس کی دل چسپیاں باہر بڑھنے لگیں۔ میجر اپنی بیوی کو اس لڑکی کی طرح بننے کو کہتا تھا اور لڑکی کی تعریفیں کرتا تھا۔ لڑکی اس کے گھر کئی دفعہ آئی۔ اینڈلی میں لڑکی نے میجر کی بیوی کو اپنی طرح آزاد ہونے پر اکسایا مگر بیوی اُس کی باتوں میں نہ آئی۔ اس کے کہنے کے مطابق یہ لڑکی اور میجر یہ پاتے تھے کہ میں بھی آزاد ہو کر دوسرے مردوں کے ہاتھ ددستی کروں تاکہ میں اپنے ناندی کو عیاشی سے رد نہ سکوں۔

جوں جوں ہندو لڑکی کے ساتھ میجر کے تعلقات بڑھتے گئے، اپنی بیوی میں اُس کی دل چسپی گھٹتی گئی۔ اب یوں ہوتا تھا کہ لڑکی اُس کے گھر آتی تھی تو میجر کی بیوی سے ملتی بھی نہیں تھی۔ وہ دونوں الگ کمرے میں بیٹھے رہتے۔ پھر اس کے گھر میں ایک انگریز کرنل آنے لگا۔ وہ عموماً رات کے وقت آتا تھا۔ میجر نے اپنی بیوی کا

اُس کے ساتھ تعارف کرایا۔ کرنل اُردو بولتا اور سمجھتا تھا۔ اُس نے پہلی ملاقات میں ہی اس عورت کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔ یہ کوشش بیہودہ تھی۔ اس انگریز نے میجر کی بیوی کے ساتھ ہاتھ ملایا اور پہلے اُس کا ہاتھ چوما پھر اُس کے گال چوم کر میجر سے کہا۔ ”تم نے یہ تو نہیں بتایا تھا کہ تمہاری بیوی اتنی زیادہ خوبصورت ہے؟“

کرنل چلا گیا تو بیوی میجر پر ٹرس پڑی۔ میجر ہنستا رہا۔ اُس نے کہا کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ ہم لوگ پس ماندہ ہیں۔ انگلینڈ میں عورت کے سُن کی تعریف منہ چوم کر کی جاتی ہے۔ غرض، میجر اس بے حیائی کی تعریفیں کرتا رہا اور اُس کی بیوی اُس پر اور اُس کی تہذیب پر لعنت بھیجتی رہی۔ کرنل اس کے بعد بھی آتا رہا۔ تین چار بار یہ ہندو لڑکی بھی اس کے ساتھ تھی۔

ایک دن میجر، کرنل اور یہ لڑکی میجر کے گھر ایک کمرے میں بیٹھے۔ انہوں نے وہیں شراب منگوائی اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ تھوڑی دیر بعد بیوی نے باہر کی طرف جاکر کھڑکی میں سے جھانکا۔ پردے پر سے ہوتے تھے لیکن دپر پردوں کے درمیان ذرا سا فاصلہ تھا۔ کھڑکی اندر سے بند تھی۔ اُس نے شیشے اور پردوں میں سے جو کچھ دیکھا، اس سے اُس کا خون کھول آٹھا۔ یہ نوجوان ہندو لڑکی جس کی ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی مادرِ زاد سنگی تھی اور کرنل اور

گھر نہیں تھا۔ کرنل نے پھر وہی بیہودہ خواہش ظاہر کی اور ایک ہزار نقد کے علاوہ ریشمی کپڑوں کا وعدہ کیا۔ یہ لوگ ہندوستانیوں کو غریب اور اپنا غلام سمجھتے تھے۔

”کرنل جانسن!“ اس عورت نے اُسے کہا۔ ”میں ایک ہزار روپیہ دے کر تمہیں اس طرح قتل کر سکتی ہوں کہ تمہاری لاش بھی کسی کو نہیں ملے گی۔“ اس نے کرنل جانسن کی اتنی بے عزتی کی کہ اردلی، اور خانساں آواز سن کر دوڑے آئے۔ کرنل چلا گیا۔

بیوی نے میجر کو بتایا تو میجر نے غصے کا اظہار تو کیا لیکن ساتھ یہ بھی کہا کہ کمبخت کرنل ہے اور انگریز ہے۔ اس کے خلاف رپورٹ کرنا بھی خطرناک ہے۔ بہر حال بیوی کے بیان کے مطابق میجر بہت بے چین ہو گیا تھا مگر اس نے اپنی روش نہ بدلی۔ اس کے بعد بھی یہ ہندو لڑکی اس کے ساتھ گھر آتی رہی۔ وہ ایک کمرے میں بند ہو جاتے تھے اور بہت دیر بعد لڑکی جاتی تھی۔ بیوی کی قوت برداشت جواب دے گئی اور گھر میں جھگڑے اتنے بڑھے کہ وہ اپنے گھر آ گئی۔ اُس نے اپنا بیان یہیں پر ختم کر دیا۔

باوقار عورت عیاش لڑکی

”میجر صاحب نے آپ پر کسی کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے کا الزام

میجر وحشی بنے ہوئے تھے۔

بیوی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بہت روٹی اور سوچتی رہی کہ کیا کرے۔ اُس کا خاوند اُسے غیر مردوں کے ساتھ اسی سطح پر لانا چاہتا تھا۔ رات بہت دیر بعد کرنل اور لڑکی چلے گئے۔ میجر سونے کے کمرے میں آیا تو بیوی نے گلہ شکوہ کیا۔ میجر نے الزام کی تزدید کر دی۔ اس پر جھگڑا ہوا اور میجر بڑھکڑا آ۔ یہ دن ہونے لگا۔

انگریز کرنل دو دفعہ میجر کی غیر حاضری میں اُس کے گھر گیا اور اُس کی بیوی سے بیہودہ بے تکلفی کی۔ بیوی نے اُسے دھتکارنے کی کوشش کی تو اُس نے ایک ہزار روپیہ پیش کر دیا۔ اس عورت نے اُسے کہا کہ میں تمہیں کئی ہزار روپیہ دے سکتی ہوں۔ کرنل چلا گیا۔ میجر گھر آیا تو بیوی نے اُسے کہا کہ تم باہر سے لڑکی لا کر گھر میں بدکاری کرتے بھی ہو اور کرنل سے کراتے بھی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کرنل نے مجھے بھی طوائف سمجھ لیا ہے۔

اس واقعہ کی تفصیل سن کر میجر طیش میں آ گیا۔ اس نے کہا۔ ”میں خود بدکار ہو سکتا ہوں، بیوی کو بدکار نہیں ہونے دوں گا۔“

اس سے بیوی کو اتنا سا اطمینان ضرور ہوا کہ اس کے خاوند کے دل میں غیرت ابھی زندہ ہے۔ خاوند نے اُسے بعد میں بتایا کہ کرنل کے ساتھ اس کی اس معاملے میں بات ہوئی ہے یا نہیں۔ معلوم نہیں کرنل ڈھیٹ تھا یا میجر کی کمزوری تھی کہ ایک ہفتے بعد کرنل چھڑا گیا۔ میجر

لگایا تھا۔ یہ کہاں تک صحیح ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اُسے غالباً توقع نہیں تھی کہ مجھے اس بات کا علم ہوگا۔ عورت چونکہ ہنسیار تھی اس لیے اس نے نہایت اچھا جواب دیا۔ کہنے لگی۔ ”عورت پہاڑوں سے ٹکرا جاتی ہے لیکن مرث اتنا سا الزام کہ کسی کے ساتھ اُس کے ناجائز تعلقات ہیں اُسے گھٹنوں بٹھا دیتا ہے۔ عورت کو ذلیل کرنے اور اُس کا منہ بند کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُس پر بدکاری کا الزام عائد کر دو۔ یہی الزام مجھ پر عائد کیا گیا اور میں خاوند کے اگلے فیصلے کے انتظار میں گھر بیٹھ گئی۔“

میں نے اس عورت کے متعلق یہ رائے قائم کر لی تھی کہ یہ کوئی بدصو بیوی نہیں۔ چاہے تو کسی کو بھی انگلیوں پر سچا سکتی ہے۔

”ارشاد کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیا اُس کا آپ کے گھر آنا جانا تھا؟“

اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ مکرانی کہنے لگی۔ ”میرا خیال تھا کہ آپ کو اس کے متعلق معلوم نہیں ہوگا۔ آپ شاید میرے خاوند سے مل آئے ہیں۔ اُس نے میرے بارے میں آپ کو کیا بتایا ہے؟“

”آپ اس کی پرواہ نہ کریں کہ آپ کے بارے میں کسی نے مجھے کیا بتایا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ سمجھ لیں کہ آپ کے معاملے میں میرا ذہن بالکل صاف ہے۔ پولیس کی طرف سے آپ پر کوئی الزام عائد

نہیں کیا گیا نہ کیا جائے گا۔ آپ کے کسی کے ساتھ تعلقات ہیں یا نہیں اس کا ہندو لڑکی کی گمشدگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اگر مجھے کچھ سچی باتیں بتادیں گی تو میں آپ کا مشکور ہوں گا۔“

پھر میں نے اس کے دل پر قبضہ کرنے کے لیے کہا۔ ”آپ نے میرے دل میں اپنے خاوند کے خلاف خاصی نفرت پیدا کر دی ہے۔ وہ آپ جیسی باذتار عورت کو ایک ہندو لڑکی کی خاطر پریشان کرتا رہا ہے۔ وہ غالباً آپ کو طلاق دے کر اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے جو میں نہیں ہونے دلاں گا۔ آپ ارشد کے متعلق مجھے بتادیں کہ یہ الزام آپ پر کس طرح عائد ہوا ہے؟“

”یہ ایک نالگ تھا۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”ارشاد ہماری برادری کا ایک شادی شدہ آدمی ہے۔ آپ اُسے میرا منہ بولا بھائی کہہ سکتے ہیں۔ میں نے اُسے بتایا تھا کہ خاوند میرے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ یہ ساری باتیں جو آپ کو سنائی ہیں اُسے بھی میں سناتی رہتی تھی۔ ایک روز ہم دونوں نے یہ طے کیا کہ ارشد میرے پاس آنا شروع کر دے اور اس قسم کی المیہ کی جائے کہ ہماری دوستی ہو گئی ہے۔ ہم نے اس امید پر یہ پردہ گرام بنایا تھا کہ میرے خاوند کی غیرت جاگ اُٹھے گی اور وہ مجھے ارشد سے ملنے سے روکے گا۔ پھر میں اُسے کہوں گی کہ تم اپنی مرضی کی لڑکی کے ساتھ بدکاری کر سکتے ہو تو میں بھی اپنی پسند کے آدمی کے ساتھ من مانی کر سکتی ہوں۔ ارشد بہت

دلیر آدمی ہے۔ اُس نے میرے پاس آنا شروع کر دیا....

» ایک بار ایسے ہوا کہ ارشد میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میرا خاوند گھر نہیں تھا۔ اُس کے آنے کی آواز آئی تو میں اور ارشد ایک ہی صوفے پر ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔ خاوند کا پاؤں دروازے میں پڑا تو ہم چونک کر ادر گھبرا کر دُور دُور ہٹ کر گئے۔ خاوند کا رنگ بدل گیا مگر وہ بولا نہیں۔ ارشد چلا گیا۔ خاوند نے مجھ سے پوچھا کہ ارشد ادر تم اتنی قریب بیٹھے کیا کر رہے تھے؟ میں نے جواب دیا۔ جو تم اور وہ ہندو لڑکی کیا کرتے ہو؟ وہ چپ ہو گیا۔ اس کے بعد جو تھے پانچویں روز ارشد آ جانا اور پھر یوں بھی ہوا کہ خاوند گھر میں موجود تھا۔ ارشد آیا اور میں خاوند کو بتائے بغیر اس کے ساتھ کچر دیکھنے چلی گئی....

» خاوند کو یقین ہو گیا کہ میرے اور ارشد کے تعلقات قسائم ہو چکے ہیں۔ اُس نے ایک روز پھر مجھے ارشد سے ملنے سے روکا۔ میں نے اسے اس ہندو لڑکی سے ملنے سے روکا۔ پھر اُس نے جو کچھ کہا میں نے اسی طرح جواب دیا۔ وہ پریشان ہو گیا اور میں اپنے آئینہ ضبط نہ کر سکی۔ میرا اتنا پایا گھر بدکاری کا اڈہ بن گیا تھا۔ حالانکہ میں بدکار نہیں تھی کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ خاوند کے راستے پر چل نکلوں گی مگر اس ناک کو بھی میں بدکاری سمجھتی تھی۔ میں اپنے سہاگ کو دھوکہ دے رہی تھی۔ میں اتنی روئی کہ اپنے اوپر

تالون رہا۔ اسی کیفیت میں خاوند سے کہا کہ وہ سیدھے راستے پر آجائے، مگر شراب اور اندھی آدمی نے اُس کی عقل پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ اُس پر اس کا اثر تو بہت ہوا کہ میں نے ارشد کے ساتھ ناجائز دوستی کر لی ہے لیکن اُس نے اپنی عادت بدلنے کی ذرہ بھر کوشش نہ کی۔ یہ سلسلہ تین چار مہینے چلا۔ ہمارے جھگڑے بڑھتے گئے۔ آخر خاوند نے مجھ کو کہا کہ میں اپنے گھر چلی جاؤں۔ میں اپنے گھر آ گئی۔ دو مہینے ہو گئے ہیں۔

میں ان کے اس ناک پر تنقید کر سکتا تھا لیکن میری نفیثش کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ مجھے ہندو لڑکی کا سراغ لگانا تھا۔ اس میجر کی بیوی بدکار تھی یا نہیں اس سے میرا واسطہ ہی نہیں تھا۔ اس کی باتوں سے مجھے راہنمائی ملی کہ اپنی بیوی کو راستے سے ہٹانے کے لیے میجر کو معقول بہانہ مل گیا تھا مگر یہ سوال میرے لیے پریشانی کا باعث تھا کہ لڑکی کو گھر سے غائب ہونے کی کیا ضرورت تھی؟

میں نے ارشد کا پتہ معلوم کر لیا تھا۔ اُسے ملا۔ مجھے چند ایک باتوں کی تصدیق کرنی تھی۔ ارشد ان لوگوں میں سے تھا جو ایک ہی وقت دیہاتی بھی ہوتے ہیں اور شہری بھی۔ یعنی ان میں شہریوں والی نفاست اور فیشن بھی ہوتا ہے اور دیہاتیوں والا گنوار پن بھی۔ یہ لوگ کسی کے سر پر لٹھ مار کر ”آئی ایم سوری“ کہنے والے لوگ

ہو۔ بلاؤ تو دس منٹ بعد رہتی ہے۔ ہنسنا تو منہ بسور لیتی ہے۔
اس کے آگے روؤ تو ہنس پڑتی ہے مگر ہم ہیں کہ برادری کو خوش
رکھنے کے لیے اپنے دل پر پتھر رکھے ہوئے ہیں۔

اُس کی باتیں مجھے شک میں ڈال رہی تھیں۔ میرے دماغ میں یہ
سوچ آئی کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ میجر کی بیوی کو آباد کرنے کے لیے
ہندو لڑکی کو اسی نے غائب کر دیا ہو میں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اس
میں خطرہ مول لینے کی ہمت موجود ہے۔ میں نے اس شک کو سامنے رکھ
کر اس پر سوال کیا، لقمے دیئے، اسے دوستی اور ہمدردی کے خوبصورت
جھانسنے دیئے مگر وہ مجھے اس جرم سے صاف نفی کر دیا تھا۔ اس نے میجر
کی بیوی کی ساری باتوں کی تصدیق کی اور بتایا کہ وہ دونوں میجر کو
راہِ راست پر لانے کے لیے ناکام کھیلنے رہے ہیں۔

میرا اس ناکام کے ساتھ کوئی تعلق تو نہیں تھا پھر بھی میں
نے اُسے کہا۔ ”اس ناکام کا نتیجہ آپ نے دیکھ لیا ہے۔ میجر نے
ہر جگہ مشہور کر دیا ہے کہ اُس کی بیوی کے آپ کے ساتھ نابھتہ
تعلقات ہیں۔ اس سے بہتر یہ تھا کہ اُسے آپ لوگ برادری میں
بٹھا کر شرمسار اور ذلیل کرتے۔ اب آپ کی گردن اُس کے
پاؤں کے نیچے آگئی ہے۔ اب وہ بیوی کو طلاق دینے اور
دوسری شادی کرنے کا معقول بہانہ حاصل کر چکا ہے۔“
اُس نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ دیکھا جائے گا۔“

ہوتے ہیں۔ جوان آدمی تھا اور شادی شدہ۔
میں اسے ملا تو اُس نے پہلو انوں کی طرح جھوم کر مجھ سے
ہاتھ ملایا اور بولا۔ ”باد جی ملک صاحب!“ اور اُس نے
کسی کو آواز دے کر بڑی ہی دینگ آواز سے کہا۔ ”دورو میں
برٹ ڈال کر لے آؤ جگ ہیں۔“

اس کا انداز بتا رہا تھا کہ غیر معمولی طور پر دلیر آدمی ہے اور یہ
بھی کہ جنس مخالف کے لیے اس میں کشش تھی۔ اس کے مزاج میں
ننگشتگی بھی تھی۔ میں نے اُسے ملاقات کا مطلب بتایا۔

اس نے میرے زانوں پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”اس لڑکی کے لیے
میں اس قسم کے ایک درجن میجر قتل کر سکتا ہوں۔ یہ میجر (کالی)، اس
قسم کی وفادار اور شکل دار لڑکی کو تنگ کرتا رہا ہے۔ اُس نے
جب مجھے بتایا تو میں نے اُسے کہا کہ میں اسے سیدھا کر دیتا ہوں۔
تمہارے قدموں میں ناک کی لکیریں نکالے گا لیکن یہ لڑکی اتنے
مضبوط دل والی ہے کہ اپنے خاوند کے خلاف کوئی بات سننے کو
تیار نہیں تھی۔“

وہ میرے پوچھے اور بچے بغیر میجر کی بیوی کی تعریفوں کے پُل
باندھ رہا تھا۔ انسان کو اتنا باتونی نہیں ہونا چاہیے کہ منہ میں
جو آئے کہتا چلا جائے۔ میجر کی بیوی کی تعریفیں کرنے کرتے اُس
نے کہا۔ ”ادھر ہماری بیوی ہے جیسے کھڑی پر گائے بندھی ہوئی

میں شادی شدہ ہوں

کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔

”یہ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ میں برٹش انڈیا آرمی کا میجر ہوں“
 اُس نے کہا۔ ”میں سڑکوں پر پھرنے والا جیب کترا نہیں ہوں۔“
 ”اور جناب کو یہ علم ہو گا ہی کہ یہ خادم برٹش انڈیا پولیس کا انسپکٹر

ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ماٹری پولیس کا حوالہ دینا نہیں ہے۔“ پھر میں نے اہستگی سے کہا۔ ”میجر صاحب! میں آپ کو تھانے میں بلوا سکتا ہوں۔ آپ کو افسر اور اپنا مسلمان بھائی سمجھ کر آپ کی عزت افزائی کی ہے کہ آپ کے گھر میں آگیا ہوں۔ کرم کریں اور عینی دیر میں یہاں بیٹھا ہوں، اپنے آپ کو میجر سمجھنا چھوڑ دیں۔ اس میں آپ کا اپنا بھلا ہے۔“

مگر وہ اپنے عہدے کو ذہن سے اتارنے پر آمادہ نہیں تھا۔
 کہنے لگا۔ ”کیا آپ یہ سمجھ کر آئے ہیں کہ اس لڑکی کو میں نے کہیں میں ملنے کا بندوبست کر لیا۔ ملاقات رات کو ہوئی۔ اس نے مجھے شراب

پیش کی۔ میں نے بونل اور گلاس اٹھا کر پرے رکھ دیئے اور کہا کہ میں تفتیش کے لیے آیا ہوں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ ہوشیار ثابت کرنے آیا ہوں کہ آپ نے لڑکی کو غائب نہیں کیا۔ اس ثبوت میں رہیں۔ میں نے ہندو ٹھیکیدار کا نام لے کر کہا کہ اُس کی بیٹی لاپتہ کے لیے مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ لڑکی بالغ ہے، اگر وہ آپ ہو گئی ہے۔ آپ کے ساتھ لڑکی کے گہرے مراسم تھے۔ آخری بار د کے پاس ہے یا کسی اور کے پاس، وہ کورٹ میں جا کر بیان دے سکتی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اُس کے ساتھ گئی ہے۔ قانون اُس آدمی کا

یا آپ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔“

میں نے اس آدمی کو ذہن سے اتارا نہیں۔ امکان موجود تھا کہ اس نے لڑکی کو غائب کیا ہے۔ میں نے یہ خاص طور پر نوٹ کیا کہ وہ میجر کی بیوی میں غیر معمولی دل چسپی لے رہا تھا۔ وہ اس عورت کا بھلا یا باپ نہیں تھا لیکن بھائیوں اور باپ سے زیادہ دل چسپی ظاہر کر رہا تھا۔ اس سے میرے شک کو تقویت مل رہی تھی۔

بہر حال یہ ثابت ہو گیا تھا کہ گمشدہ لڑکی کا میجر کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ کرنل جانسن کا نام بھی سامنے آیا تھا۔ میں نے تھانے میں جا کر اس مسلمان میجر کے پیچھے خبر لگا دی ہے اور اُس کے ساتھ اُس کے بنگلے میں ملنے کا بندوبست کر لیا۔ ملاقات رات کو ہوئی۔ اس نے مجھے شراب پیش کی۔ میں نے بونل اور گلاس اٹھا کر پرے رکھ دیئے اور کہا کہ میں تفتیش کے لیے آیا ہوں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ ہوشیار ثابت کرنے آیا ہوں کہ آپ نے لڑکی کو غائب نہیں کیا۔ اس ثبوت میں رہیں۔ میں نے ہندو ٹھیکیدار کا نام لے کر کہا کہ اُس کی بیٹی لاپتہ کے لیے مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ لڑکی بالغ ہے، اگر وہ آپ ہو گئی ہے۔ آپ کے ساتھ لڑکی کے گہرے مراسم تھے۔ آخری بار د کے پاس ہے یا کسی اور کے پاس، وہ کورٹ میں جا کر بیان دے سکتی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اُس کے ساتھ گئی ہے۔ قانون اُس آدمی کا

”کب؟“

”آپ صرف جواب دیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں ابھی آپ کے

”پھر آپ تفتیش کیوں کر رہے ہیں؟“ اُس نے پوچھا۔

”اُس کے باپ نے رپورٹ درج کرائی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”مجھے لڑکی براہِ کرہ کرنی ہے۔ لڑکی پہلے دن ہی کورٹ میں بیان دے گی

تو مقدمہ خارج ہو جائے گا۔ مجھے صرف یہ بتا دیں کہ لڑکی کہاں ہے؟“

”مجھے کچھ پتہ نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔

”آپ کو کب معلوم ہوا کہ لڑکی لاپتہ ہو گئی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”پرسوں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”ٹھیکیدار نے مجھے پیغام بھیجا کہ

کہ لڑکی واپس کر دو ورنہ تمہیں گرفتار کرادوں گا۔ آپ غالباً اُسی کے کہنے

پر میرے پاس آئے ہیں۔“

”اُس نے آپ پر شک کیوں کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس لیے کہ میں نے اُس کا ایک بل روکا ہوا ہے۔“ میجر نے جواب دیا۔

”بل ستاون ہزار کا ہونا چاہیے لیکن اُس نے اٹھانوے ہزار کا بل

بنایا ہے۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ بل ستاون ہزار کا بناؤ۔ میں نے بل روک

لیا ہے۔“

”کیا ہر ٹھیکیدار کا ہر بل صحیح ہوتا ہے؟“

”یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”کہ ہمارے

محکمے میں رشوت خوری حد سے زیادہ ہے۔ کبھی کوئی بل صحیح نہیں آتا۔ بل

پاس کرنے والے افسر اور کارکن اپنا اپنا حصہ لے لیتے ہیں لیکن ستاون ہزار

کا بل ساٹھ ہزار یا اس سے کچھ اوپر کا بھی بن سکتا ہے اور ادا بھی ہو سکتا ہے۔“

اکٹھے اتنا ایس ہزار کا فرق کیسے ہضم کیا جائے؟ اب اتفاق سے اُس کی

بیٹی لاپتہ ہو گئی ہے۔ اُس نے انتقام لینے کے لیے یا مجھے ڈرانے کے

لیے میرے خلاف شک کا اظہار کر دیا ہے اور مجھ تک پیغام بھی پہنچایا

ہے کہ تمہیں گرفتار کرادوں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس لڑکی کے

ساتھ میرا کوئی ایسا گہرا تعلق نہیں ہے۔ میں شادی شدہ ہوں۔“

”آپ کے بیوی بچے کہاں ہیں؟“

”چند دنوں کے لیے اپنے گھر گئے ہوئے ہیں۔“

”کب گئے ہیں؟“

”ایسا طر صاحب!“ اُس نے تدریس سے مسکرا کر کہا۔ ”میرا خیال ہے

کہ میری فیملی کے ساتھ اس ہندو لڑکی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسے میں

بالکل ضروری نہیں سمجھتا کہ آپ میرے گھر پر معاملات میں دخل دیں۔“

”مہاجر صاحب!“ میں نے اُسے کہا۔ ”آپ نے اپنے لیے مشکل یہ پیدا

کر رکھی ہے کہ اس لڑکی کا آپ کے گھر پر معاملات میں گہرا دخل ہے۔ میں

تفتیش کر رہا ہوں۔ بڑا لمبا سکرکٹ کر آپ تک پہنچا ہوں۔ بات اتنی سی

ہے کہ اگر لڑکی آپ کے پاس ہے تو بتا دیں۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ اُسے

کورٹ میں لے جائیں اور اس کے بیان پر بیکارڈ کروادیں کہ وہ باغ ہے

اور اپنی مرضی سے آپ کے ساتھ آئی ہے۔ پھر آپ چاہیں تو اُس کے

ساتھ شادی کر لیں، چاہیں تو واپس کر دیں۔ یہ کوئی جرم نہیں ہے۔“

بیوی نے بے وفائی نہیں کی

لیکن یہ میجر کوئی بھی بات تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اُسے میری باتوں سے یہ بھی شک نہ ہوا کہ میں اس کے اور لڑکی کے تعلقات کے متعلق بہت کچھ جان چکا ہوں۔ اس کے دوسرے سے مجھے شک ہونے لگا اُس نے پھر بل کی بات کی۔ کہنے لگا۔ ”پولیس کو صرف اس بل کی وصولی کے لیے میرے پیچھے ڈالا گیا ہے۔ لڑکی کو میں جانتا ہوں۔ وہ اتنی کچی نہیں کہ اُسے کوئی اٹھا کر لے گیا ہوگا۔ وہ کم نہیں ہو سکتی۔ کسی نئے دوست کے ساتھ میرا سٹے کے لیے چلی گئی ہوگی“

اُس کے انداز میں لاپرواہی اور بے نیازی سی تھی جیسے مجھے کوئی اہمیت نہیں دے رہا۔ میں نے اس کے گرد مخروں کا جال پھیلا دیا تھا، اس لیے ہنترہ سمجھا کہ اس پر ہم چھینک رہے ہیں تاکہ میرے غمزے کا رد عمل دیکھیں اور نظر رکھیں کہ وہ کہاں کہاں جاتا ہے۔ میں نے اُس کے ساتھ بہت باتیں کیں اور جب دیکھا کہ وہ کسی بات پر نہیں آ رہا تو میں نے پوچھا۔ ”میجر صاحب! مجھے صرف یہ بتادیں کہ آپ اس لڑکی کے تعلقات سے دست بردار ہونے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟“

”کیونکہ میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔“ اُس نے

دو لڑکے جواب دیا۔

”تو پھر یوں کہہ دیں کہ وہ آپ کے گھر کرنل جانسن کے ساتھ بیکاری کرنے کے لیے آیا کرتی تھی۔“ میں نے کہا۔

”کون کرنل جانسن؟“ اُس نے پوچھا لیکن اُس کی زبان کچھ ہلکا گئی تھی۔

”وہ کرنل جانسن جس نے آپ کی شریٹ اور ونا دار بیوی کو بُری نیت سے پہچاننے کی کوشش کی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”کیا میں آپ کو آپ کے بنگے کے اُس کمرے میں لے چلاؤں جہاں آپ اور کرنل جانسن اُس لڑکی کے ساتھ بیکاری کیا کرتے تھے؟“

وہ گہری سوچ میں کھو گیا۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”میرے محترم دوست! آپ کے بنگے کے جو درخت ہیں وہ بھی پولیس کے انفارمر (خبرچی) ہیں۔ میں آپ کے پاس خالی ذہن لے کر نہیں آیا۔۔۔۔۔ اُس لڑکی کو کہیں چھپانے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ بالغ اور آزاد خیال لڑکی ہے۔ آپ کسی بھی وقت اُس کے ساتھ شادی کر سکتے ہیں۔ اپنی بیوی کو آپ بلاوجہ طلاق دے سکتے ہیں۔“

”بلاوجہ نہیں۔“ وہ تو جیسے مرہی گیا تھا۔ مری ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں نے اپنی بیوی کو بلاوجہ گھر نہیں بھیجا۔ اس کے ایک آدمی کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں۔ اُسے گھر بھیجنے کا لڑکی کی کشیدگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے کچھ علم نہیں کہ لڑکی

کہاں ہے آپ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ لڑکی کے باپ نے مجھ پر کیوں شک کیا ہے؟

”کیا آپ اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتے ہیں؟“

”میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔“

”اب میں آپ سے جو بات کرنے لگا ہوں، یہ پولیس انکوائری کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مسلمان کی حیثیت سے کروں گا۔“ میں نے اسے خلوص دل سے کہا۔ ”اگر میں ثابت کر دوں کہ آپ کی بیوی نے ارشد کو ساتھ ملا کر محض ناٹاک کھیلا ہے تو آپ اپنی بیوی کو واپس لے آئیں گے؟“

”کیسا ناٹاک؟“

”آپ کی بیوی آپ کو شراب خوری اور بدکاری سے ہٹانے کے لیے آپ کو یہ دکھانا چاہتی تھی کہ آپ بدکار ہو سکتے ہیں تو میں بھی ہو سکتی ہوں۔“ میں نے اُسے بتایا۔ ”آپ کی بیوی نے آپ کے ساتھ بے وفائی نہیں کی۔“

اس نے کچھ حیرت زدہ سا ہو کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔

”کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ ہندو لڑکی آپ کے ساتھ دغا کرے گی؟ کسی بھی وقت یہ ہندو آپ کو رشوت کے الزام میں پکڑوا کر آپ کی زندگی اور حیثیت تباہ کر سکتے ہیں۔“

”مجھ سے قسم لے لیں۔“ اُس نے بغور داروں کی طرح کہا۔

”میں اُس لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کروں گا۔ وہ بدکار ہے، دولت زبورات اور نہایت اعلیٰ لباس کا اسے نشہ ہے۔ میں ایسی لڑکی کے ساتھ کیسے شادی کر سکتا ہوں جسے شادی کی ضرورت ہی نہیں اور جو انگریز، ہندو اور مسلمان انسروں کی مشترکہ بیوی بنی ہوئی ہے؟ میرے بھی اس کے ساتھ تعلقات ہیں لیکن میں نے کبھی سوچا بھی نہیں کہ اس کی خاطر اپنی بیوی اور اپنے دو ننھے ننھے بچوں سے دست بردار ہو جاؤں گا مگر....“ وہ رُک رُک کر بولا۔ ”مگر آپ نے ایک نئی بات بتائی ہے۔ میری بیوی نے ارشد کے ساتھ مل کر مجھے سبق دینے کی کوشش کی ہے۔ مجھے اس کے متعلق سوچنے دیں۔ میری بیوی مجھے دھوکہ نہیں دے سکتی۔ اُس نے ضرور ڈرامہ کھیلا ہے۔“

مجھے خوشی ہوئی کہ میں نے ایک مسلمان گھرانہ آباد کرنے کی جو تلاش کی تھی وہ کامیاب ہو رہی تھی اور مجھے یہ یقین بھی آنے لگا تھا کہ لڑکی کی گمشدگی کے ساتھ اس میجر کا کوئی تعلق نہیں۔ پھر بھی میں نے غمزوں کو دماں سے نہیں ہٹایا۔ میں نے میجر سے کرنل جالنسن کے بنگے کا نمبر پوچھا۔ اُس نے فوراً بتا دیا۔

میرا خیال تھا کہ یہ انگریز کرنل بھی ایم۔ای۔۱۰ ایس کا ہوگا لیکن میجر نے بتایا کہ وہ ٹینک رجمنٹ کا کمانڈنگ آفیسر ہے۔ میں اس کے بنگے میں گیا۔ دماں اُس کا خائساں ملا۔ اُس نے بتایا کہ کرنل سات روز کی چٹھی کیا ہوا ہے۔ روانگی کی تاریخ پوچھی تو یہ وہی تاریخ تھی

”نہیں حضور!“ خالسا ماں نے جواب دیا۔ ”کرنل صاحب اکیلا رہتا ہے۔ اس کی میم صاحب ولایت میں ہے“

انٹیلی جنس کا سو بیار اور ہندو لڑکی

میں خالسا ماں کو منہ بند رکھنے کی تنبیہ کر کے نکالنے گیا۔ کرنل کو تیسرے روز واپس آنا تھا۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ لڑکی اسی کرنل کے ساتھ ڈھوڑی گئی ہے اور اُس کے ساتھ واپس آ جائے گی۔ میری مجبوری یہ تھی کہ لڑکی کی کشدگی کی رپورٹ رجسٹر کرائی گئی تھی۔ مجھے لڑکی کا سراغ لگانا تھا ورنہ یہ کوئی واردات نہیں تھی۔ شام کو لڑکی کا باپ آ گیا۔ پوچھنے لگا کہ تفتیش کہاں تک پہنچی ہے؟

میں نے اُسے کہا۔ ”جناب لالہ صاحب! مجھے صاف یہ بتا دیں کہ آپ نے اس میجر پر کیوں تھپک کیا ہے؟ کرنل جانسن پر کیوں نہ کیا؟ ان انسروں پر کیوں نہ کیا جن کے ساتھ آپ کی بیٹی شاہیں گزارتی ہے؟ کیا آپ میجر کو مشتبه لکھوا کر اور اُسے گرفتاری کی دھمکی دے کر اُس سے اٹھانوے ہزار روپے کا وہ بل منظور کر سکتے ہیں جو درمل شانوں ہزار کا ہونا چاہیے؟ آپ نے ان تمام ہندو، انگریز اور اینگلو انڈین انسروں کو مشتبه کیوں نہیں کہا جن کے ساتھ آپ کی بیٹی

جس روز ہندو لڑکی (اپنے باپ کے بیان کے مطابق) لاپتہ ہوئی تھی۔ مجھے فوراً یہ خیال آیا کہ لڑکی اسی کے ساتھ گئی ہے۔ خالسا ماں نے بتایا کہ وہ ڈھوڑی گیا ہے۔ ڈھوڑی ہندوستان کا ایک پہاڑی صحت افزا مقام ہے۔ وہی سے زیادہ بلند اور خوبصورت۔ میں نے خالسا ماں کو سختی سے کہا کہ میں اس سے جو کچھ پوچھوں اُس کا ذکر وہ صاحب سے نہ کرے۔ یہ لوگ پولیس سے بہت ڈرتے تھے، کیونکہ پولیس کسی بھی وقت کسی بھی ملازم کے خلاف رپورٹ دے کر کہ اس کا چال چلن اچھا نہیں لڑکی سے الگ کر سکتی تھی۔ خالسا ماں کو میں نے ہندو لڑکی کی دونوں تصویریں دکھا کر پوچھا کہ اُس نے اس لڑکی کو کبھی دیکھا ہے؟

”بہت دفعہ دیکھا ہے حضور!“ اُس نے جواب دیا۔ ”صاحب کے پاس آتی رہتی ہے“

”آخری بار کب آئی تھی؟“

”صاحب جس روز مجھے لیا اُس سے ایک روز پہلے آئی تھی۔“

اُس نے جواب دیا۔

”اکیلی آتی تھی؟“

”کبھی اکیلی آتی ہے اور کبھی ایم۔ ای۔ ایس کا ایک انڈین میجر کے ساتھ ہوتا ہے“

”کرنل صاحب کی میم صاحب ہیں؟“

”محبہ یہ بھی شک ہے کہ لڑکی کو آپ نے کہیں چھپا دیا ہے اور میرے پاس آیا کرتی تھی؟“

میں نے اُسے کہا۔ ”میں پولیس انسپکٹر ہوں“۔ میں نے اُسے کہا۔ ”میں
میں دراصل یہ کوشش کر رہا تھا کہ وہ گھبرا کر کیس واپس لے لے۔ ایسی بات آپ کو کبھی نہیں بتا سکتا کہ کس نے مجھے کیا بتایا ہے۔
مگر وہ ہندو تھا۔ ہندو میں یہ وصف نہ ہوتا ہے کہ آپ کے پاؤں میں آپ کے پاس بلاوجہ نہیں آیا“

سر رکھ دے گا لیکن اپنی ہٹ سے باز نہیں آئے گا۔ یہی مظاہرہ
ہندو نے کیا۔ گھبراہٹ سے اس کی زبان کانپ رہی تھی۔ وہ ہاتھ
بھی جوڑ رہا تھا مگر مسلمان میجر کا ہی نام یہے جابرا تھا۔ مجھے تو
تھی کہ مجھ پر وہ الزام عائد کرے گا کہ میں مسلمان ہوں اس لیے مسلمان
میجر کو بچانا چاہتا ہوں لیکن اُس نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔
کنرل جانسن کے واپس آنے میں دو دن باقی تھے۔ میں نے اسے
کنرل کہیں باہر جارہا تھا۔ اُس نے وردی پہن رکھی تھی۔ وہ
دو باتیں کہہ کر چلا گیا۔ ایک یہ کہ وہ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کا نفرنس میں
جا رہا ہے اور دوسری یہ کہ اگر میں اُسے تفنیش میں شامل کرنا
چاہتا ہوں تو مجھے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے اجازت لینا پڑے گی۔
وہ مجھے اپنے بنگلے کے برآمدے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ اُس کا
اردلی آگیا۔

کیس کو اٹک رکھ دیا اور قتل کے ایک کیس میں مصروف ہو گیا۔
دو دن گزر گئے۔

ان حضرات کے لیے جو فوجی امور سے واقف نہیں، میں یہ
وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ ہر فوجی افسر کو ایک سپاہی ارملی

میں شام کے وقت کرنل جانسن کے بنگلے پر گیا۔ وہ بڑے اپنے کے طور پر ملا ہوا ہوتا ہے۔ اسی طرح کرنل جانسن کے بنگلے میں بھی انداز سے ملا۔ میں نے اُسے ہندو لڑکی کی تصویریں دکھا کر پوچھا کہ وہ ایک اردلی تھا۔ مجھے برآمدے میں کھڑا دیکھ کر وہ آگیا۔ میں وہاں جانتا ہے یا نہیں؟ اُس نے صاف انکار کر دیا اور پوچھا کہ کیا باز کھڑا سوچ رہا تھا کہ ایک انگریز کرنل کو تفتیش میں شامل کر کے اس

نے اُسے یقین دلایا کہ میں اُسے گواہوں میں شامل نہیں کروں گا۔ وہ پنجابی ہونے کی وجہ سے اور میرے دوستانہ رویے سے متاثر ہو کر رات بھر تھاٹھانے میں آنے پر رضا مند ہو گیا۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ سپاہی اُن پڑھ نہیں ہو سکتا۔ کبھی بھولی باتیں کرتا تھا اور اس کے انداز میں خود اعتمادی اور وقار سا تھا۔ اردلی عموماً اُس سپاہی کو بنایا جاتا تھا جو فوجی لحاظ سے نکمّا اور نالائق ہو۔ یہ نالائق نہیں لگتا تھا۔ میں نے سوچا کہ کرنل نے اپنے لیے فہین اور ہوشیار سپاہی منتخب کیا ہے۔

رات دس بجے کے قریب اردلی آ گیا۔ مجھے اس کا اصلی نام چھپانے کی ضرورت نہیں۔ وہ تحصیل چکوال کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کا نام محمد خان تھا۔ وہ میرے پاس آیا تو مجھ سے پوچھا کہ یہ کیس کیا ہے؟ میں نے مختصراً بتا دیا۔ اُس نے مجھ پر ایک سوال کیا پھر دوسرا سوال کیا اور پھر وہ مجھ سے اسی انداز سے سوال پر سوال کرتا گیا جیسے میں نہیں بلکہ وہ پولیس انسپکٹر ہے اور کسی واردات کی تفتیش کے لیے مجھ سے پوچھ گچھ کرنے آیا ہے۔ میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ”گراہیں! میں نے تم سے کچھ پوچھنے کے لیے نہیں بلایا تھا مگر تم نے مجھے ملزم سمجھ لیا ہے۔ میں تفتیش کر رہا ہوں۔“

”میں بھی تفتیش کر رہا ہوں۔“ اُس نے مسکرا کر کہا۔ ”میں

سے کس طرح کام کی باتیں اگراؤں گا۔ انگریز ہمارے بادشاہ تھے یہ کرنل ملازما اچھے طریقے سے تھا لیکن میرے سوالوں کا جواب شاید ایسے رخی سے دیا اور چلا گیا۔ یہ تجربہ میرے لیے نیا نہیں تھا۔ اردلی نے اگر مجھے ہمارا دیا۔ اُس نے میرے ساتھ اردلی کی بات کی تو میں سمجھ گیا کہ وہ پنجابی ہے۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کس کام سے آیا ہوں میں نے اُسے پنجابی زبان میں جواب دیا اور اس سے تعاون کی درخواست کی۔ مجھے بالکل توقع نہیں تھی کہ اردلی صاحب کا کوئی راز مجھے بتائے گا۔ یہ لوگ انگریز افسروں کے زرخ غلام ہوتے تھے۔ انگریزوں کی خوشنودی کی خاطر اپنوں کا گلا کاٹے ہیں فخر محسوس کرتے تھے۔ تاہم میں نے اُسے بتا دیا کہ میں کیوں آ ہوں۔ اُسے بند لڑکی کی تصویریں دکھا کر پوچھا کہ یہ لڑکی یہاں کب آئی ہے؟ اُس نے بتایا کہ کئی بار آئی ہے۔

بندوستان میں اتنی دُور پنجابی بنگلہیر ہو کر ماکرتے تھے کیونکہ ہمارے لیے پردیس تھا۔ اس ادیبڑ عمر اردلی نے مجھے سہرڈ کوڑا میں چلنے اور چائے پانی کی دعوت دی جو میں نے بھدشکر یہ ٹال دی۔ اردلی سے کہا کہ وہ میری مدد کرے اور رات کو کام سے فار ہو کر بھانے میں آ جائے۔ میں نے اُسے بتایا کہ ایک دو باتیں پوچھیں۔ اُس نے کہا کہ چوری چھپے آنا پڑے گا کیونکہ تفتیش کے لیے سوال میں کسی بھی کام کے لیے جانا ہو تو اجازت لینی پڑتی ہے۔

ادھر کرنل جانسن اُسی روز چھٹی گیا جس روز آپ بتاتے ہیں کہ لڑکی غائب ہوئی۔ اس سے مجھے شک ہوتا ہے کہ لڑکی اسی کے ساتھ گئی تھی اور یہ عیاشی اور بدکاری کا معاملہ نہیں ہے۔ میں نے ملٹری انٹیلی جنس کی ٹریننگ انگریزوں سے لی ہے۔ بال کی کھال اتار کر آپ کو اندر کا حال بتا سکتا ہوں۔ یہ لڑکی آپ نے دیکھی نہیں۔ آپ نے بڑی بڑی خوبصورت لڑکیاں دیکھی ہوں گی مگر اس لڑکی کی مسکراہٹ اور آنکھوں میں ایسا جادو ہے کہ آپ کے سامنے آئے تو آپ اُس کے پاؤں میں بیٹھ کر پوچھیں گے کہ میرے لیے کیا حکم ہے؟ ایسی لڑکیاں جاسوسی کے لیے فٹ ہوتی ہیں۔ جاپانی اور جرمن اس قسم کی ہندوستانی لڑکیوں کو جاسوسی کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔“

انگریز کرنل اور ہندو لڑکی کی منزل ایک تھی

میں سارا معاملہ سمجھ گیا۔ ایک انگریز کرنل کا جاسوس ہونا کوئی حیرت والی بات نہیں تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران متعدد انگریز فوجی افسر پکڑے گئے تھے جو جرمنوں کے جاسوس تھے۔ ان میں سے زیادہ تر تو جرمن تھے جو پہلی جنگ عظیم کے فوراً بعد انگریزوں کے بہروپ میں انگلینڈ چلے گئے اور فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کو شکست ہوئی تھی شکست

سپاہی نہیں ہوں۔ میں ملٹری انٹیلی جنس (جاسوسی اور سرائے سازی کے محکمے) کا صوبیدار ہوں۔ کرنل جانسن کو میری اصلیت کا علم نہیں۔ رجمنٹ کے سیکنڈ ان کمانڈ اور ایجوٹنٹ کے سوا میری اصلیت کا کسی کو بھی علم نہیں۔ آپ ہندو لڑکی کی کششگی کو اغوا کا کیس سمجھتے ہوں گے لیکن مجھے شک ہے کہ یہ معمولی سا کیس نہیں ہے۔ یہ مجھے اُس کیس کی لڑی معلوم ہوتی ہے جس کی سرائے سازی کے لیے مجھے اس کرنل کا اردلی بنایا گیا ہے۔ اس کے متعلق شک ہے کہ یہ جاسوس ہے۔ مجھے اس کے بنگلے میں یہ خبر دینے کے لیے اردلی لگایا گیا ہے کہ کیا یہ واقعی جاسوس ہے؟ اور اگر جاسوس ہے تو جاپان کا ہے یا جرمنی کا؟ میری ڈیوٹی یہ ہے کہ دیکھتا رہتا ہوں کہ بنگلے میں آکر کیا کرتا ہے، کہاں جاتا ہے اور اس کے پاس رسول کا کون کون آدمی آتا ہے....

”میں نے اب تک جو رپورٹیں دی ہیں ان سے اس کرنل کو جاسوس ثابت کرنا ممکن نہیں۔ اس کے پاس اپنی یونٹ کے افسروں کے علاوہ ایم۔ ای۔ ایس کا ایک مسلمان میجر آتا ہے اور یہ ہندو لڑکی آتی ہے۔ میں ان دونوں کی رپورٹ دے چکا ہوں مگر میں یہ نہیں دیکھ سکتا کہ وہ بند کرے میں کیا کرتے ہیں۔ اندر دھسک جاتی ہے جو میں ہی لے کے جاتا ہوں لیکن شک والی کوئی حرکت نظر نہیں آتی۔ اب آپ نے بتایا ہے کہ یہ لڑکی لاپتہ ہو گئی ہے۔“

کو فتح میں بدلنے کے لیے جرمنی کی حکومت نے اُسی وقت اپنے رٹکیاں بھی استعمال کی جاتی ہیں۔

جاسوس یورپ اور انگلینڈ میں پھیلا دیئے تھے۔ دوسری جنگ کزنل جانسن ایک رسالے کا مائنڈنگ آفیسر تھا۔ رسالے میں عظیم تک جرم کے اُن جاسوسوں کو جو انگریزوں کی فوج میں افسر گھوڑے ہوا کرتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں گھوڑوں کی جگہ بن چکے تھے انگریز ہی سمجھا جاتا تھا۔ جنگ کے دوران ان جاسوسوں بکتر بند گاڑیاں اور ٹینک آگئے تھے۔ کزنل جانسن کے رسالے کے نے اپنے کمالات دکھائے اور ابتدا میں یورپ میں انگریزوں اور گھوڑے واپس لے لیے گئے تھے اور اب اُسے ٹینک دیئے جا رہے فرانسیسیوں کی شکست فاش کا باعث بنے۔

یہ کزنل انہی جاسوسوں میں سے ہو سکتا تھا لیکن جاسوس کو عین موقع پر گرفتار کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جاسوس اپنا کام نہایت خوبی سے ڈھکے چھپے طریقے سے کرتے ہیں۔ اگر ان پر شک کا اظہار کیا جائے تو وہ بچنے کے طریقے جانتے ہیں۔ انہیں صرف شک میں پکڑ لیا جائے تو اس کے دو نقصان ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ عدالت میں اُن کے خلاف الزام ثابت نہیں کیا جاسکتا اور دوسرا یہ کہ ان کی پارٹی کے دوسرے جاسوس جو کئے ہو کر ثبوت اور شہادت غائب کر دیتے ہیں۔ جاسوس نظام ہر ایک اکیلے ہوتے ہیں لیکن ان کی ایک پارٹی ہوتی ہے۔ ہر پارٹی کے جاسوس اپنے مشن کے مطابق پھیل جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے رابطہ بھی رکھتے ہیں۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک پارٹی کا ایک جاسوس کلکتہ میں ہوتا ہے اور دوسرا پشاور میں۔ تیسرا مدراس میں اور چوتھا سرینگر میں۔ جاسوسی کے لیے مقامی

محمد خان نے ایسا کرنے سے روک دیا اور کہا — ”میری ترقی کا دار و مدار اس کیس پر ہے۔ اگر میں ثابت کر دوں کہ کزنل جانسن ایم۔ اے۔ ایس کا میجر اور یہ مندر لڑکی جاسوس ہیں تو مجھے ملٹری انٹیلی جنس کا ماہر سرل غزراں تسلیم کر لیا جائے گا۔ ترقی بھی ملے گی اور ہو سکتا ہے انعام بھی مل جائے۔“ اُس نے مجھے مشورہ دیا — ”آپ اس کیس سے دست بردار ہونے کی کوشش نہ کریں۔ اگر ہم دونوں مل کر ان تینوں کے خلاف شہادت مہیا کر دیں تو اس میں آپ کو

تو یہی ہے کہ اس کی بیوی یہاں نہیں ہے۔ اس کے زیر اثر کرنل جانشن تنہائی میں بھی محسوس کرتا ہوگا۔ اُس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔

رات کو ہی صوبیدار محمد خان ملٹری انٹیلی جنس کے دفتر میں گیا اور میری تفتیش کی رپورٹ دے دی۔ دوسری صبح مجھے وہاں سے بلاوا آیا۔ میں نے تمام تفصیلات بتا دیں۔ ایک انگریز کرنل نے مجھ پر بے شمار سوال دائے۔ وہ شاید مطمئن ہو گیا تھا۔ اُس نے پوچھا کہ کیا میں اس کیس کو سنبھال سکوں گا۔ میں نے اُسے تسلی دی اور محمد خان کی ذہانت کی بھی تعریف کر دی۔ اس کرنل نے مجھے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے تحریری اجازت نامہ لے دیا کہ میں کرنل جانشن اور مسلمان میجر (جس کا میں نام ظاہر نہیں کرنا چاہتا) کے سرکاری کاغذات کسی بھی وقت دیکھ سکتا ہوں اور ان سے کُلی بھی وقت اور کسی بھی جگہ پوچھ گچھ کر سکتا ہوں۔

میں نے کرنل جانشن کی غیر حاضری میں اُس کے دفتر سے جا کر معلوم کیا کہ وہ چھٹی گزارنے کے لیے کہاں گیا تھا۔ وہاں ڈھونڈ لکھا ہوا تھا۔ یہ چونکہ جنگ کا زمانہ تھا اس لیے فوجی انسر جہاں چھٹی جاتے تھے وہاں کا پورا ایڈریس دے جاتے تھے۔ کرنل جانشن نے یہ ایڈریس دیا تھا — ”معرفت پوسٹ ماسٹر ڈھونڈی“

میں ریلوے سٹیشن گیا۔ وہاں سے معلوم کیا کہ فلاں تاریخ کو

بہت فائدہ ملے گا۔ انعام کی توقع بھی رکھی جاسکتی ہے۔“

میں نے اس کا مشورہ مان لیا۔ اس میں انعام کا لالچ بھی تھا۔ لیکن صوبیدار محمد خان نے جس طرح میرے ساتھ تعاون کیا تھا میں اس کا صلہ دینا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اپنے علاقے کا آدمی ہے اسے فائدہ پہنچ سکتا ہے تو اس کی مدد کیوں نہ کروں۔ میرے لیے مشکل یہ تھی کہ ملٹری انٹیلی جنس میری لائن نہیں تھی۔ جاسوس، چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ غیر معمولی طور پر ہوشیار اور ذہین ہوتے ہیں۔ ان کے خلاف شہادت حاصل کرنا جو بے شیر لانے کے برابر ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ انٹیلی جنس کی ٹیکنیک ہی مختلف ہوتی ہے۔ تاہم میں نے فیصلہ کیا کہ کچھ اپنی عقل سے کام لوں گا کچھ صوبیدار سے رہنمائی لوں گا اور اس کیس کو چھوڑوں گا نہیں۔

میں نے محمد خان سے کہا کہ وہ اپنے ہیڈ کوارٹر میں میری تفتیش کی اطلاع دے دے۔ اُسے میں نے دوسرا مشورہ یہ دیا کہ کرنل جانشن کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرو اور صرف ان پڑھ اردلی نہ بنے رہو۔ اُس کی ذاتی کمزوریوں کو استعمال کرتے کی کوشش کرو۔ محمد خان بہت ہی دانشمند آدمی تھا۔ اُس نے کہا کہ کرنل جانشن کو ہندوستان میں آئے چار سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ یہ اکیلا رہتا ہے۔ شاید اس کی بیوی ہے ہی نہیں۔ اس کی ایک کمزوری

اُس کی بکنگ بھی اسی سٹیشن تک تھی جہاں اگلے روز کرنل جانن گیا تھا۔

کرنل گھبرا گیا

میں اپنی سوچی ہوئی لائن کے مطابق مسلمان میجر کے بنگے پر چلا گیا۔ اُس کے متعلق مجھوں نے کوئی ایسی رپورٹ نہیں ملی تھی جو میرے کام آ سکتی ہو۔ اس کے کہ وہ ایک شام پیشتر کرنل جانن کے پاس گیا تھا۔ وہ زیادہ تر دفتر سے آکر بنگے میں ہی رہا۔

میں میجر سے ملا تو اُس نے پہلا سوال یہ کیا — ”لوٹکی کا کچھ پتہ چلا؟“

میں نے اُسے کہا — ”یہی سوال میں آپ سے پوچھنے آیا ہوں“ اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں نے دھیمی سی آواز میں رازداری کے لہجے میں اس سے پوچھا — ”لوٹکی کب واپس آرہی ہے؟ وہ واپس آئے گی یا نہیں؟“

”آپ نے پھر دہی رٹ شروع کر دی ہے“ — میجر نے کہا۔ ”اُس روز آپ مان گئے تھے کہ لوٹکی کا میجر سے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے“

”اُس روز اس کی صورت کچھ اور تھی“ — میں نے کہا۔ ”آج کچھ اور ہے۔“ وہ کچھ کہنے ہی لگا تھا، میں غصے سے اسے بولنے

کرنل جانن کی فٹ کلاس سیٹ کون سی گاڑی میں بک ہوئی اور کہاں تک ہوئی تھی۔ اُن کے پاس ریکارڈ موجود تھا۔ جس سٹیشن تک اُس کی سیٹ بک ہوئی، اس کا ڈیپوزی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ اگر وہ ڈیپوزی ہی گیا تھا تو وہ اسی چھاؤنی سے موٹر ٹرانسپورٹ پر گیا ہو گا مگر جس سٹیشن تک اُس کی سیٹ بک ہوئی تھی وہاں سے کوئی موٹر ٹرانسپورٹ ڈیپوزی نہیں جاتی تھی۔

ریلوے سٹیشن کے اسی ریکارڈ کو بھر دیکھا۔ میں اس ہندو لڑکی کا نام تلاش کر رہا تھا۔ کرنل جانن کی روانگی سے ایک روز پہلے ایک عورت کے نام سے فٹ کلاس کی ایک سیٹ بک ہوئی تھی مگر نام کچھ اور تھا۔ میں نے متعلقہ بابو سے پوچھا کہ کیا وہ اس عورت کو پہچان سکے گا؟ فٹ کلاس کے مسافر زیادہ تر فوجی انسپورٹ کرتے تھے امیر کبیر شہری انٹریا سینٹر میں سفر کیا کرتے تھے۔

بابو نے مسکرا کر کہا — ”بد تمیزی کی معافی چاہتا ہوں۔ اس عورت کو کوئی دیکھ لے تو ساری عمر نہیں بھولے گا“

میں نے دونوں تصویریں (ہندو لڑکی کی) اُس کے آگے رکھ دیں۔ بابو نے بد تمیزی کی معافی تو مانگ لی تھی لیکن بد تمیزی سے باز نہ آیا۔ دونوں تصویریں ساتھ میں لے کر نمونوں کے مسخروں کی طرح بولا — ”ہائے خالصے حضور! یہی تھی۔ یہ ہے کون حضور؟“

سوچ میں پڑ گیا کہ کیا یہ میجر جاسوسی کا مجرم ہے؟ صوبیدار محمد خان نے، ریلوے ریکارڈ نے اور لڑکی کے فرضی نام سے باہر جانے نے مجھے یقین دلادیا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے مگر کیا میجر بھی اس رنگ کا ممبر ہے؟ تاہم میں نے اُسے آگ لگا دی تھی۔ اب میرے مجبوروں کو یہ دیکھنا تھا کہ وہ اس آگ کو سرد کرنے کے لیے کیا کرتا ہے اور کہاں جاتا ہے۔ میں نے یہ کامیابی بھی حاصل کر لی کہ میجر کے خانسائے کو بھی مجبوروں میں شامل کر لیا اور اُسے دھکی دی کہ اس کا میجر سیدھا جیل جا رہا ہے، اگر اُس نے (خانسائے نے) غدار کی نوادہ بھی جیل میں جائے گا۔

رات کو محمد خان آگیا۔ وہ کرنل جانسن کا جانناز معتمد بن گیا تھا۔ میں نے اُسے ریلوے کی تفتیش کے متعلق بتایا جو اس نے اپنے روزنامے میں بھی لکھ لیا۔ ہم دونوں اگلی کارروائی کے لیے پلان بناتے رہے۔

دوسرے دن شام کے وقت میں کرنل جانسن کے پاس بنگلے میں گیا۔ محمد خان نے میرے سامنے کوئی بات نہ کی۔ اندر کرنل کو اطلاع دی۔ پھر مجھے بلایا۔ محمد خان باہر نکل گیا۔ میں نے کرنل جانسن کو بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کا اجازت نامہ (برائے نفیض) دکھایا۔

”تم نے کسی ہندو لڑکی کے متعلق مجھ سے پوچھا تھا“ اُس نے کہا۔ ”اُس کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا“

نہ دیا اور کہا۔ ”سنو میجر صاحب! میری نیت اور میرے غلوں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ پیشتر اس کے کہ میں تمہیں گرفتار کروں، میں مسلمان کی حیثیت سے تمہاری بیوی اور دو معصوم بچوں کا خیال کرتے ہوئے یہ موقع دیتا ہوں کہ اقبال جرم کرو۔ میں تمہیں سلطانی گواہ بناؤں گا۔ ہو سکتا ہے اس کے بعد تم سروس میں نہ رہ سکو لیکن بڑی لمبی قید سے چھج جاؤ گے اور شاید....“ میں نے آگے جھج کر کہا۔ ”شاید سزائے موت سے بچ جاؤ۔ بہر حال تم جیل تک نہیں جاؤ گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں“

اُس نے مسکانے کی کوشش کی اور اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ سوچ میں کھو گیا۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ وہ اتنی دیر میں سنبھل گیا اور بولا۔ ”کیا ایسی لڑکی کی کشدگی مجھے پھانسی کے تختے تک پہنچا سکتی ہے جسے میں صرف اتنا ہی جانتا ہوں کہ امیر کبیر اور گریجویٹ سوسائٹی گول ہے؟“

”وہ اس سے زیادہ بھی کچھ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس سے آگے میں کچھ نہیں جانتا۔“ اس نے کہا۔ ”آپ جو کارروائی کرنا چاہتے ہیں کریں۔“

”میں تمہیں سوچنے کا موقع دیتا ہوں۔“ میں نے کہا اور اُس کے بنگلے سے نکل آیا۔

میں نے اُسے سوچنے کا موقع دے دیا تھا لیکن میں خود اس

”کرنل صاحب!“ میں نے اُس سے پوچھا۔ ”آپ نے ٹھہری کہا گزاری ہے؟“

”ڈھوڑی“

”قیام کس ہوٹل میں کیا؟“ میں نے پوچھا۔ ”ریسٹ ہاؤس میں رہے یا کہیں اور؟“

”دیکھو انسپکٹر!“ اُس نے کہا۔ ”بریکڈ سیڈ لوارٹر کا یہ اجازت نامہ تمہیں بالکل اجازت نہیں دیتا کہ تم میری پرائیویٹ زندگی کی باتیں بھی پڑھ سکتے ہو۔“

”کرنل صاحب!“ میں نے کہا۔ ”میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے ساتھ تعاون کریں۔ میں آپ کا نوکر ہوں۔ آپ کے شہنشاہ کے قانون کے تحفظ کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔ کیا آپ اپنے قانون کا احترام نہیں کریں گے؟ آپ یہ بتادیں کہ ڈھوڑی جانے کے لیے آپ کون سے ریلوے سٹیشن پر اترے تھے اور کون سی روڈ ٹرانسپورٹ سے ڈھوڑی پہنچے تھے؟“

وہ اتنا کچا آدمی نہیں تھا۔ جانتا تھا کہ روانگی کے سٹیشن۔ مکنگ اور آخری سٹیشن کی پڑتال کی جاسکتی ہے۔ اُس نے آخری سٹیشن صبح بتایا اور پھر یہ بتایا کہ وہ ایک دن وہاں رہا۔ وہاں سے سٹیشن تک گیا اور ایک دوست کی کار سے ڈھوڑی گیا۔ میں نے اپنا یہ سوال دہرایا کہ وہ ڈھوڑی کہاں ٹھہرا تھا۔

اُس نے جواب دینے کی بجائے ٹال مٹول کی۔ میں نے مسلسل ایک گھنٹہ اُس کے ساتھ منظر کھپائی کی مگر اُس نے ایسے ایسے پتیزرے بدلے کہ مجھے پریشان کر دیا۔ کمرے کے اندرونی دروازے کا پردہ گرا ہوا تھا۔ پردے کے نیچے مجھے دو پاؤں نظر آئے۔ یہ محمد خان کے پاؤں تھے۔ وہ چھپ کر ہماری باتیں سن رہا تھا۔ یہ عزری نہیں تھا کہ کرنل جانسن مجھے ہر سوال کا صحیح جواب دیتا اور نہ ہی مجھے امید تھی کہ وہ صحیح جواب دے گا۔ مجھے اس کا صرت رویہ دیکھنا تھا وہ میں نے دیکھ لیا تھا۔ کرنل جانسن نے ڈھوڑی تک کے سفر کو پراسرار بنا دیا تھا۔ میں اصرار کرتا ہی رہا کہ وہ مجھے بتا۔

”میں شکار کھیلنے گیا تھا!“ اُس نے جواب دیا۔ ”باہر کمپ کرتا رہا ہوں۔“

”مجھے وہ علامت بتادیں جہاں آپ نے شکار کھیلا ہے۔“ میں نے پوچھا۔ ”آپ نے قلی تو مزدور لیے ہوں گے۔“

اُس نے زبرج ہو کر جواب دیا۔ ”میں یہاں بیٹھا اُس علاقے کی نشاندہی نہیں کر سکتا۔“

”مجھے اپنے کارٹوسوں کا ریکارڈ دکھادیں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ نے کتنا ایمونیشن فائر کیا؟ کتنا خریدا؟ کہاں سے خریدا؟“ وہ غصے سے اچھل پڑا۔ کہنے لگا۔ ”میں بریکڈ کمانڈر سے بات

کر کے تمہارے ساتھ بات کروں گا۔ میں برداشت نہیں کر سکتا
ایک انڈین انسپکٹر مجھے کھٹیا قسم کا ملزم سمجھ لے۔ تم جاسکتے ہو“
”اور آپ نے مان لیا کہ وہ سہیلیوں کے ساتھ گئی تھی؟“ میں
نے پوچھا۔ ”اور وہ ڈھونڈی ہی گئی تھی؟“

لاپتہ لڑکی خود آگئی

”بہر حال وہ واپس آگئی ہے“ اُس نے شکست کھائے ہوئے

لہجے میں دبی دبی زبان سے کہا۔ ”یہ تو میری بد قسمتی ہے کہ میں اس
قسم کی لڑکی کا باپ ہوں۔ میں مانوں یا نہ مانوں، اس سے اُسے کیا
فرق پڑتا ہے۔ بہر حال آپ کا کیس ختم ہو گیا ہے“

”جی نہیں ہمارا ج!“ میں نے اُسے کہا۔ ”کیس اب شروع ہوا
ہے۔ آپ لڑکی کو یہاں لے آئیں؟“

وہ پس و پیش کرنے لگا۔ لڑکی کو تھانے میں نہیں لانا چاہتا تھا۔

میں نے اُسے کہا۔ ”اگر آپ لڑکی کو میرے پاس نہیں لائیں گے تو

میں آپ کے خلاف مقدمہ کھڑا کر دوں گا کہ آپ نے ایک مسلمان

میجر کو ایک غلط بل پاس کرنے پر مجبور کرنے کے لیے اپنی لڑکی

کو گھر میں چھپائے رکھا اور میجر کے خلاف شک کا تحریری طور

پر اظہار کیا“

وہ سخت گھبرایا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”آپ جتنی رقم

مانگتے ہیں ابھی دے دوں گا۔ یہ کیس فائل کر دیں۔ میں اس لڑکی

کے ہاتھوں پہلے ہی بہت پریشان ہوں“

مجھے خیال آیا کہ اگر اسے لڑکی کو لانے کے لیے بھیج دیا تو یہ لڑکی

کو کہیں غائب کر کے کہہ سکتا ہے کہ معلوم نہیں کہاں چلی گئی ہے۔ میں

میں وہاں سے یہ یقین لے کر تھانے چلا گیا کہ کرنل جانسن اور

ہندو لڑکی اگر جاسوس نہیں تو جاسوسی کی حد تک پراسرار مزور ہیں

مگر مجھے تفتیش کے لیے کوئی ایسا زاویہ نظر نہیں آ رہا تھا جس طرح

سے حملہ کروں اور کامیاب ہو جاؤں۔ رات صوبیدار محمد خان نے اُس

بتایا کہ مسلمان میجر کرنل جانسن کے گھر گیا تھا اور بہت دیر رہا۔

میرے جنرل نے صبح آکر مجھے بتایا کہ رات گیارہ بجے میجر بارہ

اُس کا تعاقب کیا گیا لیکن آبادی میں کہیں غائب ہو گیا۔ سارا

بارہ بجے واپس آیا۔ اُس کے ساتھ دو آدمی تھے جنہیں اندھیرے

کی وجہ سے پہچانا نہ جاسکا۔ کرنل جانسن اپنے بنگلے میں رہا۔ مجرانی

رپورٹ دے کر رخصت ہوئے ہی تھے کہ ہندو لڑکی کا باپ آگیا۔

میں سوچنے لگا کہ یہ بھی جاسوسوں کے رنگ کا ممبر ہو سکتا ہے اور

یہ اپنی بیٹی کو استعمال کر رہا ہے۔۔۔

”جناب کیس ختم کر دیں“ اس نے کہا۔ ”لڑکی رات واپس آگئی

ہے۔ کہتی ہے کہ سہیلیوں کے ساتھ ڈھونڈی چلی گئی تھی“

آپ کے سامنے کپڑے اتار دوں گی

نے اپنے اے۔ اسی۔ آئی سے کہا کہ لڑکی کو یہ بنا کر لے آئے
تمہارا باپ بخانے میں بیٹھا ہے اور تمہیں بلارہا ہے۔ وہ چلا گیا
وہ لڑکی کو ایک گھنٹے بعد لے آیا۔

وہ واقعی غیر معمولی طور پر خوبصورت تھی بلکہ اُس کا حسن
خطرناک تھا۔ میں نے اُس کے باپ کو باہر نکال دیا اور لڑکی
پوچھا کہ وہ کہاں گئی تھی۔ اُس نے جواب دیا کہ سہیلیوں کے
ڈلہوزی چلی گئی تھی۔ میں نے پوچھا کہ وہ سہیلیاں کون کون
ہیں؟ اُن کے نام کیا ہیں؟ اور وہ ڈلہوزی کون سے ہوٹل یا
ٹھہری تھی؟

”میں بالغ ہوں۔ جہاں چاہوں جاسکتی ہوں اور جہاں
چاہوں ٹھہر سکتی ہوں“ اُس نے جواب دیا۔

”بالغ ہو جانے سے لڑکی کو یہ اجازت نامہ نہیں مل جاتا کہ
وہ اپنے والدین کو اور پولیس کو پریشان کر سکتی ہے“ میں نے
اسے کہا۔ ”تمہارے باپ نے رپورٹ رجسٹر کرائی تھی کہ تم لاپتہ
ہو گئی ہو۔ پولیس کئی دنوں سے تفتیش کر رہی ہے اور تم نے آ
کے کہہ دیا ہے کہ میں بالغ ہوں۔ اب تمہیں یہ ثابت کرنا پڑے گا
تم اپنی سہیلیوں کے ساتھ ڈلہوزی گئی تھیں۔ مجھے اُس گھر کا
یا ہوٹل کا نام بتاؤ جہاں تم ٹھہری تھیں اور سہیلیوں کے نام
بتاتے بھی لکھاؤ۔“

پولیس کے ساتھ اُسے پہلی بار پالا پڑا تھا۔ اُس پر خاموشی
باری ہو گئی۔ کبھی بے چین نظروں سے مجھے دیکھتی تھی اور کبھی
مرحکھا لیتی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ ”تم کون سی گاڑی
سے گئی تھیں اور کس تاریخ کو گئی تھیں؟“
اُس نے کہا کہ وہ بس سے گئی تھیں اور تاریخ بھی غلط بتائی۔
میں نے اُسے کہا۔ ”تم فلاں تاریخ فلاں گاڑی سے فیسٹ
کلاس میں گئی تھیں۔ کہو تو میں یہ بھی بتا دوں کہ تم نے کس سٹیشن پر
گاڑی چھوڑی اور وہاں سے کہاں گئیں؟“

اُس کی آنکھیں ابل کر باہر آنے لگیں۔ میں نے اُسے سنبھلنے
نہیں دیا اور پوچھا۔ ”اگر تم بتا دو کہ کرنل جاسن کے ساتھ تم
کہاں کہاں گئی تھیں تو میں تمہیں سلطانی گواہ بنا لوں گا۔“
”میں کرنل جاسن کو نہیں جانتی؟“ اُس نے ذرا سنبھل کر کہا۔ ”وہ
کون ہے؟“

”جس کے سامنے تم فلاں میجر کے بنگے میں تمام کپڑے اتار دیا
کرتی ہو۔“ میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”وہ
تمہارے جسم کے ایک ایک بال سے واقف ہے اور تم کہتی ہو کہ

تم اُسے جانتی ہی نہیں۔

وہ ڈھیٹ ہو گئی۔ کہنے لگی: ”اگر ایسی بات تھی تو آپ نے موقع پر گرفتار کر لیتے۔“

اس کے بعد اُس کا خوف ختم ہو گیا اور وہ سنبھل سنبھل کر بات کرنے لگی۔ میں نے اُسے پھرنے کے لیے اننی باتیں کیں کہ میرے جڑ تھک گئے۔

”انسپکٹر صاحب!“ اُس نے کہا۔ ”آپ کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ چلئے اپنے کو اڑیں۔ میں آپ کے سامنے بھی کپڑے اتار دوں گی۔ چلئے ختم کیجئے اس چکر بازی کو۔“ اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میں نے اس کی آنکھیں اور مسکراہٹ دیکھی تو میں ایک بار تو کاغذ ہی گیا۔ اس مسکراہٹ سے اور آنکھوں کی چمک سے بچتا آسان کام نہیں تھا۔ نفسیاتی کا یہ مرحلہ بڑا ہی صبر آزما ہوتا ہے۔ پتھر بھی موم ہو جایا کرتے ہیں۔ بڑے بڑے جابر تھانیداروں کی تھانیداریاں ریت کی ڈھیریاں بن جاتی ہیں اور زنجیریں لپکھل جاتی ہیں۔ میں فرشتہ نہیں تھا لیکن اللہ نے مجھے بچا لیا کہ لڑکی باپ اندر آ گیا۔ میرا اے۔ ایس۔ آئی اُسے پیچھے گھسیٹ رہا تھا۔ میں کمرے سے نکل گیا اور لڑکی کے باپ کو اس قدر ڈانٹ

پلائی کہ لڑکی کے حُسن کا جادو اتر گیا۔ لڑکی کے باپ کو میں نے تھانے سے نکال دیا۔ میں ایک خطرہ مول لے رہا تھا۔ لڑکی میری نگاہ میں

مشتبہ تھی مگر کوئی شہادت نہیں تھی، سوائے اس کے کہ اس نے اپنے خلاف شک پختہ کر دیا تھا۔ میں اُسے آزاد نہیں چھوڑ سکتا تھا اور اُسے حراست میں بھی نہیں لے سکتا تھا۔ خطرہ یہ تھا کہ اُس کا باپ میرے خلاف اپنی بیٹی کو جس بیجا میں رکھنے کی فوری چارہ جوئی کر سکتا تھا۔ معاملہ حوالہ اور خوبصورت لڑکی کا تھا۔ کوئی مرد ہوتا تو میں نہ ڈرتا۔ لڑکی مجھ پر محض جھوٹا الزام عائد کر سکتی تھی کہ میں نے اُس کی عزت پر حملہ کیا ہے۔ یہ ثابت تو نہ ہو سکتا تھا لیکن جج لڑکی کو دیکھ کر میرے خلاف شک کر سکتا تھا۔

میں نے یہ بھی سوچا کہ اسے ملٹری انٹیلی جنس کے حوالے کر دوں لیکن میرے پاس کوئی مٹھوس جواز نہیں تھا اور حقیقت یہ ہے کہ لڑکی میں واقعی ایسا جادو تھا کہ میرا ایمان لڑھک سکتا تھا۔ شام ہو گئی۔ اُس کا باپ پھر آ گیا۔ میں نے اُس کی تحریری ضمانت پر لڑکی اُس کے حوالے کر دی اور سختی سے ہدایت دی کہ لڑکی ہر وقت گھر میں رہے اور جب بھی طلب کی جائے فوری طور پر پیش کی جائے۔ باپ کو میں نے خبردار کر دیا کہ اس نے ذرا سی بھی ہیرا پھیری کی تو اُسے گرفتار کر دیا جائے گا۔ لڑکی چلی گئی۔

میں صوبیدار محمد خان کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آیا۔ دوسرے دن میں نے آزمائش کے طور پر لڑکی کو بلایا۔ اُس کا باپ اُسے فوراً لے آیا۔ میں نے لڑکی کو اکسیا کہ وہ اقبالیہ جرم کر کے سلطانی گواہ

بن جائے۔ اُس نے اپنا جرم پوچھا لیکن میں نے اُسے نہیں بتایا۔ کچھ دیر بعد میں نے اُسے واپس بھیج دیا اور سوچنے بیٹھ گیا کہ کون سی لائن اختیار کروں۔ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

میجر لبل رہا تھا۔ اُس نے کہا۔ ”آپ نے مجھے سلطانی گواہ بننے کی پیش کش کی تھی۔ میں نے اُس پر غور کیا ہے اور فیصلہ کیا ہے کہ آپ کے مشورے پر عمل آؤں۔ آپ مجھے کس طرح یقین دلا سکتے ہیں کہ مجھے یہ سانس ڈرا، غرر بنا لیا جائے گا؟..... اگر پسند کریں تو رات ساڑھے دس بجے میرے بنگلے میں آجائیں تفصیلی بات کریں گے۔ میں احتیاط کی غرض سے تھانے میں بیٹھ آنا چاہتا۔ متعلقہ لوگ دیکھ لیں گے پھر انہیں پکڑنا آپ کے لیے مشکل ہو جائے گا“

میجر کے بنگلے میں

میں بہت خوش ہوا۔ سلطانی گواہ مل جانے سے تفتیش کی سروردی ختم ہو جائے گی۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں رات ساڑھے دس بجے آ جاؤں گا۔ میں خوش تو ضرور تھا لیکن جیسا کہ میں نے آپ کو پہلی کہانیوں میں بتایا ہے کہ ملزم کے اقبال جرم سے کیس مکمل نہیں ہو جایا کرتا۔ یہاں بھی یہ خطرہ تھا کہ ایک ملزم اقبال جرم کرنے کا

تو کیا مجھے شہادت بھی مل جائے گی؟ یہ تو اکثر ہوتا تھا کہ ایک ملزم کو سلطانی گواہ بنا کر اس پر اعتماد کیا اور نامکمل سی شہادت لے کر کورٹ میں پہلے گئے۔ وہاں سلطانی گواہ منحرف ہو گیا اور کہہ دیا کہ لالچ دے کر مجھ سے اقبال جرم کرایا گیا ہے۔ یہاں یہ خطرہ زیادہ شدید تھا کیونکہ یہ جاسوسی کا معاملہ تھا۔ جاسوسی کی شہادت فراہم کرنا بعض حالات میں ناممکن ہو جاتا ہے۔ تاہم میجر سے ملنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

میں صوبیدار محمد خان کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ آ جاتا۔ تو میں جاسوسی کے متعلق دو چار باتیں پوچھ لیتا مگر وہ نہ آیا۔ شام بڑی پھر رات کے نو بج گئے۔ میں میجر کے ہاں جانے کی تیاری کرنے لگا۔ ریوالور پنکھون کی جیب میں ڈال لیا اور کسی حد تک فاسٹمانہ انداز سے چل پڑا۔ میں بہت خوش تھا کہ جاسوسی کا پہلا ہی کیس ہاتھ میں لیا ہے اور کامیاب رہا ہوں۔

میں میجر کے بنگلے سے ذرا دُور تانگے سے اُترتا تاکہ اپنے کسی منجر کو پتہ چل جائے کہ میں اندر جا رہا ہوں۔ ایک آدمی مل گیا۔ اُس نے بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے ایک آدمی اندر گیا ہے۔ اُس سے پندرہ منٹ بعد ایک کار اندر گئی ہے جس میں چار آدمی تھے۔ منجر ان آدمیوں کے چلے نہ بتا سکا کیونکہ روشنی دُور تھی۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اندر جاؤں یا نہ جاؤں۔ مجھے معلوم نہیں

اُس نے کہا۔ ”اندر چلے جائیں“ میں اندر گیا تو میرے پیچھے دروازہ بند ہو گیا۔ کمرہ وسیع تھا۔ میں اس کمرے میں پہلے بھی آچکا تھا۔ اب دیکھا کہ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک کونے میں فلور میپ جل رہا تھا۔ میں سمجھا کہ میجر در سے کمرے میں ملاقاتوں کے ساتھ مصروف ہو گا۔ میں ایک صوفے پر بیٹھنے ہی لگا تھا کہ مجھے خون کی بو محسوس ہوئی۔ میں اس بو سے واقف تھا۔ کئی تازہ لاشیں اور زخمی میرے ہاتھوں سے گزر چکے تھے۔ انسانی خون کی بو کو میں دو میل دُور سے بھی سونگھ سکتا تھا۔ میجر کا ڈرائنگ روم بھی تازہ خون کی بو سے بھرا ہوا تھا۔

میں بیٹھتے بیٹھتے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ مجھے کچھ ایسے محسوس ہونے لگا جیسے کوئی اُن ہونی بات ہو چکی ہے یا ہونے والی ہے۔ تھا پلارای کی چھٹی حس بیدار ہو گئی۔ میری نگاہیں فرش پر نیڑی سے گھومنے لگیں۔ مجھے بڑے صوفے کے پیچھے سے خون کی لکیر سامنے آتی نظر آئی۔ فرش پر درمی یا تالین نہیں تھا۔ سینٹ کا چمکیلا فرش تھا۔ میں نے صوفے کے پیچھے جا کر دیکھا۔ وہاں میجر کی لاش پڑی تھی۔ لاش پیٹھ کے بل تھی۔ دائیں ٹانگ بائیں کے اوپر تھی۔ دایاں ہاتھ سینے پر رکھا تھا۔ دوسرا بازو فرش پر تھا اور خون اتنا زیادہ کہ میجر کے تمام کپڑے لال سرخ تھے۔ اُسے منہ پر یاچا توڑ کے متعدد وار کر کے ہلاک کیا گیا تھا۔

تھا کہ یہ لوگ جاسوسی کے کردہ کے تھے یا مجر کے ملاقاتی تھے۔ میں اندر میں ہاتھ مار رہا تھا اور اِن اُن دیکھے چار آدمیوں کو شناخت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بہت سوچا اور آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ میجر کے ملاقاتی ہوں گے۔ اندر اطلاع کرا دیتا ہوں۔ میجر باہر آ جائے گا۔

میں بنگلے کے چھانک میں داخل ہو گیا۔ برآمدے کے ساتھ کمرہ کھڑی تھی۔ یہ پرانے دور کا بنگلہ تھا۔ ارد گرد کھلی جگہ تھی، اور چاروں طرف در اُرسی لُڑاؤچی فیصل تھی۔ ایک طرف باغیچہ تھا اور درخت بھی تھے۔ میں برآمدے میں داخل ہوا اور دروازہ پر دستک دی۔ اندر سے ایک آدمی باہر آیا۔ نوکر لگتا تھا۔ اس نے ہراسے کی جی نہیں بھائی۔

اُس نے آہستہ سے پوچھا ”آپ طرود غمہ ہیں؟“ میں نے ہاں کہی تو اُس نے کہا۔ ”آئیے، میجر صاحب آپ انتظار کر رہے ہیں۔“

میجر قتل اور میں اغوا ہو گیا

وہ میرے آگے آگے چل پڑا۔ یہ ایک کمرہ تھا۔ جی نہیں جل رہی تھی۔ اُس نے اگلے کمرے کا دروازہ کھولا۔ وہ کمرہ رشتہ تھا۔

دو منٹ بھی عرصہ نہیں ہوئے ہوں گے۔

وہ مجھے اٹھا کے لے چلے تو پہلا خیال یہ آیا کہ یہ رات میری زندگی کی آخری رات ہے۔ یہ سوچنا کہ یہ لوگ مجھے کہیں لے جا مجبور کریں گے کہ میں جاسوسی کا کیس دباؤں تو میں راضی ہو جاؤں گا اور یہ لوگ مجھے آزاد کر دیں گے محض خوش فہمی تھی۔ وہ مجھے قتل کر کے لاش کہیں دبا دینے یا دبا (جو قریب ہی تھا) میں بھا دینے کے لیے لے جا رہے تھے۔ مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ جاسوس بہت ہی خطرناک ہوتے ہیں اور وہ قتل تک کر گزرتے ہیں مگر یہ احساس میرے اندر اُس وقت پیدا ہوا جب دقت گزر چکا تھا۔ اب یہ احساس میرے ساتھ اُس قبر میں جا رہا تھا جسے کوئی دیکھ بھی نہ سکے گا۔ اگر مجھے دو سیکنڈ کا بھی موقع مل جاتا تو میں ان لوگوں کا مقابلہ کرتا۔ پھر وہ میری لاش اٹھا کے وہاں سے نکلے اور ایک لاش اُن کے اپنے سانھی کی بھی ہوتی مگر خدا کو یہی منظور تھا کہ میرا انجام یہی ہو۔ مجھے نظر نہیں آتا تھا کہ مجھے کس طرف لے جایا جا رہا ہے۔ وہ لوگ بالکل خاموش تھے۔ اُن کی ہلکی سی سرگوشی بھی نہیں سنائی دیتی تھی۔ وہ اس کام کے تربیت یافتہ اور تجربہ کار نظر آتے تھے۔ اُس دور میں یعنی دوسری جنگ عظیم کے آغاز میں ابھی کمانڈو اور گوریلا جیسے الفاظ سے کوئی واقف نہیں تھا۔ یہ لوگ ہندوستانی ہی ہوں گے، لیکن وہ جرمنی کے تجربہ کار کمانڈو اور گوریلا لگتے تھے۔ میں پیشہ ور

میں ابھی سوچنے بھی نہ پایا تھا کہ یہ کیا واقعہ ہے کہ مجھے اپنے پیچھے ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دی۔ میں پیچھے دیکھنے ہی لگا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے دو بازو جکڑ لیے۔ اس کے ساتھ ہی پیچھے سے کسی نے میرے منہ پر اناٹا پکڑا پھینکا جس میں میرا سالا چہرہ، سر سے ٹکڑی تک ڈھک گیا۔ کپڑا موٹا تھا۔ نہایت پُھرتی سے کپڑا میرے سر کے پیچھے باندھ دیا گیا۔ اس دوران کسی کے ہاتھ نے میری پنلون کی جیب سے ریوالور نکال لیا۔ جسمانی لحاظ سے میں گیارہ گزرا تو نہیں تھا۔ میں نے جسم کو پوری طاقت سے دائیں سے بائیں کو جھٹکا دیا۔ ایک آدمی میرے جسم سے الگ ہو کر گرا مگر بڑی تیزی سے میرے ایک ٹخنے سے مضبوط رسی باندھ دی گئی۔ رسی کھینچی گئی تو میں پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ ٹخنہ دوسرے ٹخنے سے جاملایا۔ میں ایک پہلو کی طرف گرنے لگا تو دو آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا۔ فوراً ہی دوسرا ٹخنہ بھی رسی میں بندھ گیا۔

میری آنکھیں بند تھیں، منہ بند تھا۔ دونوں بازو پیچھے کو جکڑے ہوئے تھے۔ فوراً ہی میری کلاسیاں بھی رسی سے باندھ دی گئیں۔ میرے اندازے کے مطابق وہ چار آدمی تھے۔ انہوں نے مجھے لاش کی طرح اٹھا لیا۔ یہ سالا کام حیران کن تیزی سے ہوا۔ خون کی لکیر دیکھنے سے لے کر اٹھائے جانے تک پورے

مجرموں کے کمالات سے اچھی طرح آگاہ تھا لیکن اُن میں یہ تیزی اور
استادی نہیں تھی جو میں نے ان میں دیکھی۔

مجھے بھی قتل ہونا تھا

انہوں نے مجھے کار کی پچھلی سیٹ پر پھینکا پھر سیٹ سے نیچے
لڑھکا کر میری ٹانگیں دوسری کر دیں۔ سیٹ پر دو یا شاید تین آدمی
بیٹھ گئے۔ انہوں نے پاؤں میرے جسم پر رکھ دیئے۔ یہ دو آدمیوں
کے پاؤں تھے۔ کار کے دروازے بند ہو گئے۔ انجن سٹارٹ ہوا اور
کار چل پڑی۔ میں نے دل میں دعا کی کہ مجھ نے جو بنگلے کے باہر کھڑا تھا
مجھے دیکھ لیا ہو مگر توقع کم ہی تھی۔ کار بنگلے سے ذرا آہستہ نکلی۔
میں نہیں سمجھ سکا کہ وہ کس طرف مڑی۔ اچانک اس کی رفتار تیز ہو گئی
میں سوچنے لگا کہ یہ سب کیا ہوا ہے۔ میجر نے اتنا جرم کرنے
اور سلطانی گواہ بننے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اُس نے میرے ساتھ
ٹیلی فون پر بات کی تھی۔ اُس کے کسی ملازم نے سُن لیا ہوگا اور یہ
ملازم بھی اسی گروہ کا آدمی ہوگا۔ اُس نے کرنل جانسن یا اپنے گروہ
کا جو کمانڈر تھا اُسے بتا دیا ہوگا۔ یہ لوگ چونکہ تربیت یافتہ تھے،
اس لیے انہوں نے ایک پتھر سے دو شکار کیے۔ میں نے وہ وقت
بیش نظر رکھا جب مجھے میجر کے بنگلے میں جانا تھا۔ میرے لیے انہوں

نے حال بچھا رکھا تھا۔ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے میجر کو قتل کیا گیا۔ انہوں
نے اُسے کہا ہوگا کہ وہ اتنا جرم نہ کرے۔ وہ نہیں مانا ہوگا، لہذا
اُسے قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہ میرے انتظار میں بیٹھ گئے، اور
اُن کی سکیم سو فیصد کامیاب رہی۔

اس میں ہندو لڑکی کا بھی عمل دخل ہوگا۔ اُس نے اپنے گروہ
کو بتایا ہوگا کہ اُسے باپ کی شخصی ضمانت پر رہا کر کے پابند کر لیا
گیا ہے اور یہ انسپکٹر اُسے چھوڑے گا نہیں۔ گروہ میں کوئی ایسا
ذہین آدمی بھی تھا جسے معلوم تھا کہ تھانے میں اُن کے خلاف کوئی
رپورٹ درج نہیں کرائی گئی، اس لیے انسپکٹر کو غائب کر دینے سے
یہ کیس بھی غائب ہو جائے گا۔ یہ صحیح تھا کہ یہ کیس میرے سینے میں
تھا کا غذات پر نہیں تھا یا صوبیدار محمد خان اور ملٹری انٹیلی
جنس کے دو انگریز افسر آگاہ تھے کہ میں اس سلسلے میں تفتیش
کر رہا ہوں۔

میں نے ایک ٹیکنیکی غلطی کی تھی۔ مجھے چاہئے تھا کہ ملٹری انٹیلی
جنس سے یہ رپورٹ لکھوائیں کہ فلاں فلاں افراد پر جاسوسی کا شک
ہے۔ ان کے خلاف تحقیقات کی جائے۔ میں نے اس کا غدی
کارروائی کی طرف توجہ ہی نہیں دی اور محمد خان کی باتوں میں آ
کر تفتیش شروع کر دی، مگر کاغذی کارروائی ہوتی یا نہ ہوتی، میں
ایسے ماہر جاسوسوں کے قبضے میں آ چکا تھا جنہیں کچھ پرواہ نہیں تھی

کار کی رفتار اور تیز ہو گئی لیکن اتنی نہیں جتنی سڑک پر تھی۔
ڈرائیور نے گیسر بدلا اور کار دائیں بائیں ہونے اور اچھلنے لگی۔

تعاقب اور فائرنگ

پچھلی سیٹ سے ایک آدمی اٹھا۔ اُس کے پاؤں میرے اوپر
تھے۔ اُس کے جسم کا سارا بوجھ میرے سینے پر آ گیا۔ میں نے محسوس
کیا کہ وہ آگے کو جھک گیا ہے۔ اچانک کار کا انجن بند ہو گیا۔ اگلی
سیٹ سے انگریز کی آواز آئی۔ "WHAT IS IT؟" "یہ کیا ہے؟"
کار کو کچھ زمین نے روک لیا۔ میں نے کار کا دروازہ کھلتا سنا۔
میرے اوپر جو آدمی کھڑا تھا وہ میرے اوپر سے ہٹ گیا۔ باہر سے
آواز آئی۔ "ہینڈ اپ۔ جو پلے جلے گا، مارا جائے گا۔" یہ آواز صوبیدار محمد خان
کی طرح لگتی تھی۔

فوراََ بعد کسی دوسری گاڑی کی بریکیں لگیں۔ پھر دوڑتے قدموں
کی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے ساتھ کسی انگریز کی بلند آواز
سنائی دی۔ "SHOOT HIM. BELOW THE BELT۔ اس پر گولی چلاؤ۔ کمر سے نیچے"

کوئی جھگ گیا تھا۔ اُسے زندہ پکڑنے کے لئے ٹانگوں پر گولیاں
چلائی جا رہی تھیں۔ ادھر سے یکے بعد دیگرے ریولور کی تین

کہ اُن کے خلات کوئی کاغذی کارروائی ہوئی ہے یا نہیں۔ اُن کا
اپنی کارروائی ہر لحاظ سے کامیاب تھی۔ وہ مجھے ختم کر کے کہیں
دینے کے لیے جا رہے تھے۔ کوئی معجزہ ہی مجھے بچا سکتا تھا
میں نے خدا سے یہی التجا کی کہ یہ لوگ مجھے مارنے سے پہلے ایک
آدھ منٹ کے لیے آزاد کر دیں۔ میں مردوں کی طرح مرنا چاہتا
کار کی رفتار بہت تیز تھی۔ باہر کی کوئی آواز نہیں سنا
دیتی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ کار اب موڑ نہیں مڑ رہی
شہر کے موڑ ختم ہو گئے تھے۔ کار یقیناً شہر سے باہر نکل گئی تھی
کار کی رفتار اچانک اس طرح کم ہوئی جیسے ڈرائیور نے ایکسیلیٹر
سے ہلکتے پاؤں اٹھا لیا ہو۔
مجھے کار میں کسی کی آواز سنائی دی:

THEY HAVE BLOCKED THE ROAD

"انہوں نے سڑک بند کر رکھی ہے۔" یہ آواز کسی انگریز کی تھی
میرے اوپر سے یعنی پچھلی سیٹ سے کسی نے کہا: "LEAVE
THE ROAD... RIGHT" "سڑک کو چھوڑ دو۔ دائیں" اس
آواز کا لب و لہجہ ہندوستانی تھا۔ اس کے ساتھ کار دائیں کو مڑ رہی
میں نے اسے نیچے اتارنے محسوس کیا۔ یہاں کوئی راستہ نہیں تھا
کار اچھل رہی تھی۔ میری ہڈیاں ٹوٹنے لگیں۔ مجھے پھر آواز سنائی دی
"THEY ARE CHASING" "وہ ہمارا تعاقب کر رہے ہیں"

پر بیٹھ گیا۔ اُس کے ساتھ ایک گوراسار جنبٹ بیٹھا۔ پچھلی سیٹ پر مجھے اور صوبیدار محمد خان کو بیٹھایا گیا۔

کار چلی تو محمد خان نے مجھے کہا ”گراہیں! تمہارے ٹخنے اور ہاتھ میں نے باندھے تھے؟“ میں نے اُسے حیران ہو کر دیکھا تو اُس نے کہا ”ہین بھی ان لوگوں میں تھا جو تمہیں میجر کے بنگلے سے اٹھا لائے تھے۔ ابھی چُپ رہو۔ کل ساری بات بتاؤں گا“

”میجر کو قتل کس نے کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”معلوم نہیں۔“ اُس نے کہا۔ ”ہمارے وہاں جانے سے پہلے قتل ہو چکا تھا۔ ابھی زیادہ نہ بولو“

انٹنے میں انگریز میجر نے ہمارے ساتھ باتیں شروع کر دیں۔ کار چھاؤنی میں داخل ہوئی۔ دوسری گاڑی فوجی ہسپتال کی طرف چلی گئی۔ ہماری کار مسلمان میجر کے بنگلے میں داخل ہو گئی۔ انگریز میجر کو ابھی غالباً یہ نہیں بنایا گیا تھا کہ مسلمان میجر قتل ہو چکا ہے۔ ہم سب کار سے اترے اور بنگلے کے اندر چلے گئے۔ انگریز میجر موقعہ واردات دیکھنا چاہتا تھا۔ ڈرائنگ روم میں گئے تو میجر آگے آگے تھا۔ صوبیدار محمد خان اُس سے آگے ہو گیا اور میجر کو ڈرائنگ روم میں صوفے کے پیچھے لے گیا جہاں مسلمان میجر کی لاش پڑی تھی۔ انگریز میجر نے گھبرا کر پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”ہم جب بنگلے کے پھاٹک میں داخل ہوئے تو ایک آدمی اندر

گولیاں فائر ہوئیں۔ اُدھر سے چار گولیاں فائر ہوئیں۔ کار میں بیٹھ ہوئے آدمیوں کو باہر نکالا گیا۔ باہر بھاگ دوڑ تھی۔ میں ابھی اندر پڑا تھا۔ مجھے ڈر یہ تھا کہ بندھے بندھے ہی مجھے گولی لگ جائے۔

آخر مجھے باہر نکالا گیا۔ میرے ہاتھ اور پاؤں کھل گئے۔ چہرے سے کپڑا بھی مہٹ گیا۔ بہت سے آدمی بیک وقت بولا رہے تھے۔ زیادہ تر انگریزی بولی جا رہی تھی۔ یہ سب انگریز تھے۔ پچھلی گاڑی کی بتیاں جل رہی تھیں۔ میں نے سب سے پہلے صوبیدار محمد خان کو دیکھا۔ اُس نے میرے ساتھ بغلیگر ہو کر پوچھا ”گراہیں ٹھیک ہو؟“ پھر مجھے دو بار دوی انگریز انسپٹر آئے اور پھر میں نے چار گوروں کو دیکھا۔ یہ سب ملٹری پولیس کے تھے۔ سب سے آخر میں مجھے کرنل جانن نظر آیا۔ اُسے ملٹری پولیس کے دو گورے بازوؤں سے پکڑے ہوئے لارے تھے۔ وہی کار میں بھاگا تھا۔ اُس کی ایک ٹانگ سے خون اُبل رہا تھا۔ اُس نے انگریزی میں پہلی بات یہ کہی کہ مجھے ہسپتال لے چلو۔

اُسے ملٹری پولیس کی گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ دو اور آدمی تھے جو میرے والی کار میں تھے۔ وہی مجھے اٹھا کر لائے تھے۔ انہیں ایک ہی ہتھکڑی میں باندھ دیا گیا اور انہیں بھی ملٹری پولیس کی گاڑی میں لے گئے۔ ایک انگریز میجر کار کے سٹیئرنگ

کہا میا بی سے کر لیا۔ اُس نے ایک نو جوان اور تعلیم یافتہ طوائف کرنل جانسن کو پیش کی۔ دوسرا کام یہ کیا کہ میں کرنل جانسن دوسری بار تحقیقات کرنے گیا تو محمد خان ہماری باتیں دوسرے میں کھڑا سنتا رہا۔ اُس نے دیکھا کہ کرنل غصے میں آ گیا۔ میں وہاں سے واپس آیا تو محمد خان نے کرنل کے ساتھ میرے خلات باتیں کیں اور کہا۔ ”صاحب بہادر! میں آپ کی بے برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اس انسپٹر کو قتل کر دوں گا۔“ مختصر یہ کہ اُس نے نہایت تھوڑے سے دقت میں کرنل جانسن پر اعتماد جما لیا۔ یہ کامیابی اُس نے کیسے حاصل کی؟ ان کی تفصیلات بہت طویل ہیں۔ محمد خان غیر معمولی طور پر ذہین تھا۔ کرنل جانسن نے اسے کسی طریقے سے آزمایا بھی تھا۔ دو دنوں میں محمد خان کرنل کے جاسوسی رنگ کا ممبر بن چکا تھا۔ کرنل نے اسے پانچ سو روپیہ نقد دیا اور اُسے بتایا کہ ایک مشن کا ایک ہزار روپیہ ملے گا۔

میرے متعلق ان لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ میں نے ان کی دھوکہ رگ پکڑ لی ہے اور انہیں نہیں چھوڑوں گا۔ مسلمان میجر نے کرنل جانسن کو میرے متعلق بتایا کہ اس انسپٹر کو راستے سے ہٹانا ضروری ہے اس کے دوطریقے ہیں۔ ایک رشوت اور دوسرا یہ کہ اسے خائب کر دیا جائے۔ صوبیدار محمد خان کے دماغ نے کام کیا۔ اس نے شواہد

دیا کہ انسپٹر کو اغوا کر کے قتل کیا جائے اور لاش دریا میں پھینک دی جائے۔ کرنل جانسن کے تجربہ کار دماغ نے اسی طریقے کو بہتر سمجھا اور کہا کہ اگر اس انسپٹر کو رشوت دی گئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے اُسے یقین دلادیا ہے کہ ہم جرم کر رہے ہیں۔ پھر یہ شخص ہم سے آٹے دن رشوت طلب کرے گا اور بلیک میلنگ جاری رکھے گا۔ اس کا واحد علاج یہی ہے کہ اسے گم کر دیا جائے۔ صوبیدار محمد خان نے اس سیکم میں سب سے زیادہ دل چسپی کا اظہار کیا اور پیش کش کی کہ اس کام میں وہ سب سے آگے رہے گا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ کرنل جانسن نے کہا تھا کہ اُس نے پولیس سٹیشن سے معلوم کر لیا ہے کہ ان کے خلات کوئی رپورٹ رجسٹر نہیں کی گئی۔ اس لیے انسپٹر کے لاپتہ ہو جانے سے کیس بھی لاپتہ ہو جائے گا۔ صوبیدار محمد خان یہ معلوم نہیں کر سکا کہ پولیس سٹیشن میں کرنل کا کون ایجنٹ تھا جس نے اسے یہ بتا دیا کہ کوئی کیس رجسٹر نہیں ہوا۔ ہو سکتا ہے باہر کے کسی ایجنٹ نے پولیس سٹیشن کے کسی ذمہ دار فرد سے دوستی کر رکھی ہو۔ جاسوسوں کے ہاتھ بڑے لمبے ہوتے ہیں۔

پھر ہندو لڑکی کو میں نے نھانے میں بلا لیا۔ اس کی رپورٹ مسلمان میجر اور کرنل جانسن کو مل گئی۔ پھر میں نے لڑکی کو شخصی ضمانت سے پابند کر کے گھر بھیجا تو یہ اطلاع بھی کرنل جانسن کو

جانسن اس سکیم کی کمانڈر خود کرنا چاہتا تھا۔ اُسے پائے جانے کا شہرہ
 نہیں تھا۔ اُس نے کہا کہ کار وہ خود چلائے گا۔ یہ ہوا تھا کہ
 مجھے اغوا کر کے دریا تک لے جائیں گے۔ میرا گلا گھونٹ دیا جائے
 گا اور میری لاش کے ساتھ بڑے بڑے درخت پر باندھ کر دریا کے
 ریلوے میں اُس جگہ پھینکا جائے گا جہاں سرویوں میں بھی پانی گہرا
 رہتا ہے۔ مسلمان میجر کا کام اتنا ہی تھا کہ مجھے اپنے بنگلے میں
 بلائے گا اور شام سے پہلے وہ اپنے اردلی اور خاندان کو چھٹی
 دے دے گا تاکہ گھر میں وہ اکیلا رہے۔

قاتل جاسوس تھے یا سسرال داے؟

مجھے ٹیلیفون پر میجر نے بلایا۔ میں نے کہہ دیا کہ آؤں گا۔ صوبیدار
 محمد خان نے مجھے بتایا کہ میجر نے انہیں اطلاع دے دی تھی۔ یہ پارٹی
 میرے وہاں پہنچنے سے تقریباً نصف گھنٹہ پہلے بنگلے کے احاطے
 میں پہنچ گئی۔ انہوں نے اندر سے ایک آدمی کو برآمدے میں
 آنے دیکھا۔ روشنی نہیں تھی۔ اس آدمی نے بنگلے میں کار داخل
 ہونے دیکھی تو وہ پھاٹک کی طرف آنے کی بجائے بائیں طرف کو
 دوڑا اور فصیل پھلانگ کر غائب ہو گیا۔ ان لوگوں نے کار روک
 لی۔ سکیم کے مطابق اس وقت بنگلے میں میجر کے سوا کسی اور کو

پہنچ گئی۔ اس صورت حال میں ان لوگوں کے لیے ضروری ہو گیا
 مجھے قتل کر کے میری لاش غائب کر دیں۔ محمد خان کو یہی طریقہ کار
 پسند تھا کیونکہ وہ اس گروہ کو مجرم کرتے ہوئے عین موقع پر گرفتار
 کرنا چاہتا تھا۔ مسلمان میجر (مقتول) نے بڑی مسرت سے کرنل
 جانسن کو بتایا کہ میں نے اُسے اقبال جرم کرنے اور سلطانی گواہ
 بننے کے لیے کہا ہے۔ اسی پیش کش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے
 طے پایا کہ میجر مجھے اقبال جرم کے متعلق بات چیت کے لیے گھر
 بلائے گا اور وہاں سے مجھے اغوا کر لیا جائے گا۔

صوبیدار محمد خان نے مجھے بتایا کہ کرنل جانسن اس قدر دشمنہ
 آدمی تھا جتنا کوئی انسان تسلیم بھی نہیں کر سکتا لیکن خدا نے اس
 کی عقل پر ایسا پردہ ڈالا کہ وہ محمد خان کی باتوں میں آ گیا۔ اُسے
 یہ تو علم ہی نہیں تھا کہ محمد خان انٹیلی جنس کا صوبیدار ہے۔ کرنل
 اسے رسالے کا پرانا سوار (سپاہی) سمجھ رہا تھا اور اُس نے محمد خان
 کے متعلق یہ رائے قائم کی تھی کہ پرانا سپاہی ہونے کی وجہ سے وہ
 تجربہ کار اور عقلمند ہو گیا ہے۔ یہ کرنل جانسن کی پہلی اور آخری
 غلطی تھی۔

آخر اغوا پارٹی میں تین آدمی رکھے گئے۔ ایک صوبیدار محمد خان
 تھا۔ باقی دو محمد خان کے لیے نئے چہرے تھے۔ وہ فوجی نہیں تھے۔
 ایک ہندو اور دوسرا اینگلو انڈین تھا۔ دونوں جوان تھے۔ کرنل

ایک کارساز کی طرز چلے گی۔ اس میں وہ خود جاسوسوں کی پارٹی کے ممبر کی حیثیت سے پارٹی کے ساتھ ہوگا۔ اس کار میں چھادنی کے عقائد کا اسیں۔ (پیشہ) احمد یار خان رستوں میں بندر سوارے جایا جا رہا ہوگا اور کار کا ڈرائیور کرنل جانسن ہوگا۔ ملٹری انٹیلی جنس نے ملٹری پولیس کے گورے، ایک خاص مقام پر شہر سے باہر کار روکنے کے لیے تیار کر لیے تھے۔

محمد خان کو معلوم تھا کہ ملٹری پولیس اس مقام پر پہنچ چکی ہوگی، اس لیے یہ سکیم رکنی نہیں چاہیے۔ کرنل جانسن اسے ملتوی کرنے کی سوچ رہا تھا لیکن محمد خان نے غیر معمولی دیری کا مظاہرہ کر کے اسے اپنے ساتھ گھسیٹ لیا۔ میں نے بنگے کے دروازے پر دستک دی، دروازہ کھولنے والا اس پارٹی کا ہندو ممبر تھا۔ اس نے مجھے ڈرائنگ روم تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ آپ کو سننا چکا ہوں۔

اُس مقام پر جہاں ملٹری پولیس نے راستہ روک رکھا تھا، کار نیچے اتر گئی۔ محمد خان نے جب دیکھا کہ ملٹری پولیس کی ٹاٹن تقاب میں تزیین آگئی ہے تو وہ پچھلی سیٹ سے اٹھا اور ہاتھ لمبا کر کے کار کی چابی کھینچ کر انجن بند کر دیا۔ کرنل جانسن نے گھبرا کر پوچھا: ”یہ کیا ہے؟“ انہوں نے کار رک گئی اور محمد خان نے ریوالور نکال کر سب کو بینڈز آپ کا چیلنج کیا۔ کرنل جانسن اسے

نہیں ہونا پائیے تھا۔ یہ حیرت والی بات تھی کہ یہ کون تھا اور بھاگ کیوں گیا؟

کرنل جانسن نے یہ خطرہ ظاہر کیا کہ شاید میجر خود بھاگ گیا۔ اور یہ اس پارٹی کو بھانسنے کا اہتمام ہو رہا ہے۔ کار بھاگ کر قریب ہی روک لی گئی۔ بہت سوچ بچار کے بعد صوبیدار محمد نے پیش کش کی کہ وہ اندر جا کے دیکھتا ہے کہ اندر کیا ہے۔ اُس اکیلے اندر جا کر دیکھا۔ اُسے میجر مراٹھرا نظر آیا۔ اُس نے باہر آکر جانسن کو بتایا۔ وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر دیں کھڑے رہے کہ آگے باتیں یا نہیں ایک تانکے کی آواز سنائی دی۔ یہ میرا تھا۔ میں نے تانکے بنگے سے در در رکوا لیا تھا۔ وہاں میرا ایک گھوم پھر رہا تھا۔ میں اُس سے رپورٹ لینے کے لیے رُک گیا تھا۔ صوبیدار محمد خان نے چٹانک میں آکر مجھے دیکھ لیا کہ میں آدمی کے ساتھ باتیں کر رہا ہوں۔ وہاں سڑک کی بتی روشن تھی۔ خان نے مجھے سپان کر کرنل جانسن سے کہا: ”انپیکٹر رہا ہے۔ جو ہوتا ہے دیکھا جاتے ہیں۔ اسے اڑاؤ۔“ کرنل جانسن نے چلائی اور برآمدے کے قریب جا کر روکی۔ یہ چاروں کار سے نکل کر چلے گئے اور ڈرائنگ روم کے ساتھ والے کمرے میں رُک گئے۔

صوبیدار محمد خان اس سکیم کو ملتوی نہیں کرتا چاہتا تھا کیونکہ اُس نے ملٹری انٹیلی جنس کو اطلاع دے رکھی تھی کہ رات نفلان

نکل کر آئے۔ اُس پر ریوالور کی گزیاں فائر کی گئیں۔ اُس نے جراب اٹھایا لیکن اُنک میں گولی لگنے سے اُس نے ہتھیا ڈال دیئے اور درگزر سے اُسے پکڑا لے۔

موسو بیدار محمد خان کی سکیم بے مثال اور کامیاب تھی۔ کرنل جاکے متعلق پتہ چلا کہ وہ جرمن تھا اور ۱۹۲۲ء میں انگلینڈ میں غیر قانونی طور پر داخل ہوا اور پھر وہیں رہا۔ اُسے لوگ انگریز سمجھتے رہے غیر معمولی ذہانت کے بردار اُسے برطانوی فوج میں کمیشن کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ وہاں اس کا رابطہ جرمن جاسوسوں کے ساتھ تھا۔ چار سال گزرے اُسے ہندوستان بھیج دیا گیا تھا یہاں اُس نے جاسوسی کا ایک منظم گروہ بنایا جس میں مسلمان میجر اور یہ ہندو لڑکی بھی شامل ہو گئے۔ کرنل جانسن کا کورٹ مارشل ہوا۔ اُسے عمر قید دے کر انگلینڈ بھیج دیا گیا تھا۔ ہندو لڑکی، اینگلو انڈین اور ہندو کا مستند گھر بھی کورٹ میں نہیں گیا۔ میرٹھ میں ہے کہ تحقیقات میں انہیں اذیتیں دے دے مار دیا گیا ہوگا۔

مگر یہ اندام مجھے بہت مہنگا پڑا کیونکہ یہ کیس تو ختم ہو گیا۔ لیکن اس سے ایک اور کیس نکلا، آیا جس نے میری جان بھی کھالی۔ یہ تھا مسلمان میجر ناتھ۔ میں نے اس کی نشیتش سے جان چھڑانے کی ایک کوشش کی کہ ملٹری ایٹلی تنیس داروں سے کہا کہ مجھ پر یہ مہر بانی کرو۔ کہ مجھ سے تین ہزار روپیہ واپس لے لو، اس کے عوض یہ لکھ دو کہ اس میجر کو اس کے ساتھی جاسوسوں نے قتل کیا ہے مگر انگریز قانون کے معاملے میں دیبا تدار سرتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ نقیش کرچکے ہیں۔ قتل کا ربا سوزی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

میرے لیے درسوں میں یہ پیدا ہو گئی کہ میجر مفتقران کے باپ نے تھانے میں آکر رپورٹ درج کرا دی کہ میرا بیٹا قتل ہو گیا۔ ہے۔ اُس نے مفتقران کے مسلمان پر سچتہ شک کا اظہار کیا۔ ان حالات میں مجھے قتل کی نقیش کرنی پڑی۔ یہ ایک ڈرامہ تھا جس نے مجھے جذباتی طور پر ہلاک رکھ دیا۔

موسو بیدار محمد خان کو پنجاب کے نہری علاقے میں ایک مربع زمین اور درہزار روپیہ نقد انعام دیا گیا۔ مجھے فوج کی طرف سے ایک تشریفی خط کے ساتھ تین ہزار روپیہ نقد انعام دیا گیا اور درہزار روپیہ اپنے گھر کے لئے انعامات

منہ بولے بہن بھائی —

ایک کہانی ایک گناہ

اُسے ابھی معام نہیں تھا کہ مجھ پر کیا گزری ہے۔ ملٹری انٹیلی جنس کے انگریز افسروں کو اور میجر کی لاش دیکھ کر رہ گھبرایا۔ میں نے اُسے بتایا کہ مجھے صبح آٹھ بجے ملٹری پولیس کے ہیڈ کوارٹر میں جانا ہے جہاں سارا دن گزر جائے گا اس لیے وہ مقتول کی لاش کا پوسٹ مارٹم کرائے اور دیگر ابتدائی کارروائی مکمل کرے۔ اُس نے میری بات کاٹ کر مجھ سے پوچھا — ”ان افسروں نے کیس سول پولیس کو دینے کے متعلق کوئی تحریر دی ہے؟“ یہ کیس اُن کا ہے ہمارا نہیں۔ مقتول فوجی ہے اور فوجی جنگلے میں قتل ہوا ہے۔ یہ ملٹری پولیس کا کیس ہے۔ میں نے کیس کا یہ پہلو تو سوچا ہی نہیں۔ میری جان میں جان آئی۔

میں نے انگریز میجر سے کہا — ”یہ فوج کا کیس ہے۔ اس کی تفتیش ملٹری پولیس کرے گی۔ میں اس کی لاش نہیں اٹھاؤں گا۔“ ”یہ کیس آپ کو ہی لینا پڑے گا۔“ انگریز میجر نے کہا — ”ہم لوگ بہت مصدق ہیں۔ صبح یہ کیس تمہیں سرکاری طور پر مل جائے گا۔“

”ایف۔ آئی۔ آر (ابتدائی رپورٹ) پر اس کا نام ہوگا؟“ ”میرا۔“ میجر نے جواب دیا — ”رپورٹ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کی طرف سے ہوگی۔ تمہیں رپورٹ اور سرکاری چھٹی صبح نو بجے

ملٹری انٹیلی جنس اور ملٹری پولیس کے گورے اپنے ملازموں کے لیے اور میرے لیے مسلمان میجر کی لاش چھوڑ گئے۔ انہوں نے آٹھ بجے صبح اپنے دفتر بلایا تھا۔ مجھے اتنی سی مہنت نہ دی کہ میجر کی لاش کے متعلق ضروری کارروائی کر لیتا اور جائے واردات کا اور اس ارد گرد کا مسائنہ کر لیتا۔ یہ بہت ضروری تھا۔ موقع واردات پر فوراً پہنچ کر کوئی اشارہ اُکھرایا سرخا مل ہی جاتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ واردات پر تیزی سے پردے پڑتے چلے جاتے ہیں۔

میں نے اپنے اے۔ ایس۔ آئی کو میجر کے جنگلے پر بلایا تھا۔ وہ رگھویر سنگھ نام کا ایک راجپوت تھا۔ تفتیش کے معاملے میں دیا تدار تو نہیں تھا لیکن تفتیش کی باریکیوں کو خوب سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ میری عادات اور اصول سے بھی واقف تھا۔ میں نے اُسے ”چائے پانی“ سے کبھی نہیں روکا تھا لیکن سنگیز وارداتوں میں اسے بیرونی پھیری اور مستی کی اجازت کبھی نہیں دی تھی۔ مسلمان میجر کا قتل ایک سنگین واردات تھی۔ وہ فوراً جنگلے میں آگیا۔

تک مل جائے گی۔ تفتیش فوراً شروع کر دو۔“

تو پھر ملا نہیں کرتے۔

وہ سارا دن مائٹن انٹیلی جنس کے : ہیڈ کوارٹر میں گزر گیا۔ میرا بیان بڑا ہی طویل تھا۔ رات کو میں بخانا گیا۔ لاش کا پوسٹم ہو چکا تھا۔ مقتول کے وارنوں کو اطلاعات دی جا چکی تھی۔ لاش اُن کے حوالے کر دی گئی تھی۔

بخانے میں مقتول کا بوڑھا باپ اور چھوٹا بھائی میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔

میں بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے رپورٹ لے آیا تھا۔ فوج سے کیس لینے کی کاغذی کارروائی مکمل کر لی تھی۔ میں نے ملٹری پولیس سے یہ ضمانت بھی لے لی تھی کہ مجھے کسی بھی وقت کتنے ہی بڑے انگریز یا ہندوستانی فوجی افسر کی ضرورت برائے تفتیش پڑے تو کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ کرنل جانسن کے ساتھ میرا تجربہ تکلیف دہ ثابت ہوا تھا۔ ملٹری پولیس نے مجھے یقین دلایا کہ اگر میں بریگیڈ کمانڈر کو بھی بخانے میں بلانا چاہوں تو وہ آئے گا۔

ملٹری پولیس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ جاسوسی کے ملزموں یعنی کرنل جانسن، ہندو لڑکی، اُن کے ایک ہندو اور ایک اینگلو انڈین ساتھی سے مقتول کے قتل کی تفتیش بھی کریں گے مگر وہ وثوق کے ساتھ کہتے تھے کہ قتل کی واردات کا تعلق جاسوسی کے ساتھ معلوم نہیں ہوتا۔

میں اس کیس سے جان چھڑانے کی سرت نکال سکنا نہ لیکن ایک دس گنا بیدار انگریز بادشاہ کے سکرم کوٹانے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ دراصل یہ انگریز میجر میرن ہی طرح اس کیس سے جان چھڑا رہا تھا۔ اُس کے سامنے جاسوسی کی اس وارد کی بڑی لمبی اور پیچیدہ تفتیش تھی۔ کرنل جانسن اور اُس کے ایک ہندو اور اینگلو انڈین ساتھی کو ملٹری پولیس نے میرے اغوا میں پکڑا تھا، جاسوسی کی تفتیش انہیں ابھی کرنی تھی۔ اے بے وہ سب کے قتل کی تفتیش میرے سر ڈال رہا تھا۔

میں نے سرکاری حکم نامے کے انتظار میں وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ رگبیر سنگھ سے کہا کہ وہ لاش کے ارد گرد غور دیکھے۔ تمام کمروں کو دیکھے۔ سو بیڈا محمد خان کے بیان کے مطابق ایک آرمی انڈرسے نکالا اور دائیں طرف دوڑ کر ذیل پھیلاؤنگا تھا۔ رگبیر سنگھ کو میں نے ہدایت دی کہ وہ کھرے تلاش کرے جہاں سے وہ آدمی فیسبل کوڑا تھا اس جگہ کو دیکھے۔ کوئی پتہ نہ کتنی ہی بیکار کیوں نہ نظر آئے، اٹھا لے۔ اس طرح کی کئی اور ہدایات دے کر میں نے کیس رگبیر سنگھ کے حوالے کر دیا۔ وہ میرا انداز اور طریقہ تفتیش سمجھتا تھا۔ پھر بھی مجھے ڈر تھا کہ وہ کسی اہم سراغ کو نظر انداز نہ کر دے۔ ایسے سراغ ایک باگم ہوتا

شراب نہیں پیتا تھا؟

”وہ تو جی بڑے ہی اچھے پال چلن کا آدمی تھا۔“ باپ نے جواب دیا۔ ”نورنگا ریٹ بھی نہیں پیتا تھا۔ آپ شراب کی بات کرتے ہیں؟“

”تا نگے میں کون آیا؟“ گیا کہاں؟

میں مقتول کو اچھی طرح جانتا تھا۔ آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس کا چال چلن کیسا تھا۔ میں نے اس کے باپ کی الزام تراشی پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔ البتہ ارشد اور مقتول کی بیوی کے تعلقات کے متعلق اس نے جس رے کا اظہار کیا تھا وہ میں نے ذہن میں نوٹ کر لی۔ اس سے چند اور ضروری باتیں پوچھیں اور رات کو نہایت احتیاط سے ایف۔ آئی۔ آر تیار کی۔ باپ اور بھائی کو کسر بھیج دیا اور رگھیر سنگھ سے رپورٹ لینے بھیج گیا۔

اُس نے میری ہدایات پر نہایت چابکدستی سے عمل کیا تھا۔ لاش پر تیز دھار آئے (خنجر یا چاقو) کے چھ ابرے زخم تھے۔ تین سینے میں جس سے پھیپھڑے کٹ گئے تھے، ایک جگر میں، ایک معدے میں اور چھٹا زخم ناف سے ایک انچ بائیں طرف

مجھے ملٹری پولیس پر انحصار نہیں کرنا چاہیے تھا اور نہ ہی میں نے کیا کیونکہ ان کی توجہ جاسوسوں کے گروہ پر مرکوز تھی۔ یہ نے مقتول کے باپ اور بھائی سے اپنی تفتیش کی بسم اللہ کر دی دونوں اُس وقت جذبات کے غلبے میں تھے۔ رورہے تھے۔ اسر ذہنی حالت میں اُن کی ہر بات کو اہمیت نہیں دی جاسکتی تھی وہ قتل کا تمام تر الزام مقتول کے سسرال پر اور ارشد پر عائد کر رہے تھے۔ مجھے جہاں تک علم تھا، ارشد اور مقتول کی بیوی نے دوستی کا ڈرامہ کھیلا تھا تاکہ میجر (مقتول) راہ پر آجائے اور ہندو لڑکی سے تعلقات توڑے لیکن مقتول کا باپ یقین سے کہتا تھا کہ بیوی دو اڑھائی مہینوں سے اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھ ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ارشد نام کے ایک آدمی کے ساتھ اس کے ناجائز تعلقات ہیں۔ ساری برادری جانتی ہے ارشد کے متعلق مقتول کے باپ نے بتایا کہ اچھے کردار کا آدمی نہیں۔ اس کا بیوی سے اکثر جھگڑا چلنا رہتا ہے۔ وہ بیوی کو پسند نہیں کرتا۔ مقتول کے سسرال کے متعلق اُس نے بتایا کہ وہ مقتول پر بدکاری اور شراب خوری کے جھوٹے الزام عائد کر کے اپنی بیٹی کی طلاق لینا چاہتے تھے۔ مقتول طلاق نہیں دینا چاہتا تھا اس لیے قتل کر دیا گیا۔

”کیا مقتول کا چال چلن اچھا تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”وہ

رگبیر ننگہ زمین پائیاں، مایاں برابر ایک چپٹے میں تھیں۔ کھڑکی کے مطابق تاس آٹھ دس قدم نہیں کے ساتھ ساتھ کیا۔ وہاں بھی زمین کچی تھی اور رات کو اوس بھی خرب پڑی تھی جس نے کھڑوں کو راسخ کر دیا تھا۔ رگبیر ننگہ نے کسی کھرجی کی مدد کے بغیر کھڑا خود ہی اٹھالیا تھا۔

قاتل نہیں۔ یہ کھڑکی تک آیا جہاں اس نے کمرے ختم ہوتے دیاں ایک تانگے کے پہیوں کے نشان تھے۔ کھڑے کے کھڑے بناتے تھے کہ یہاں تانگہ کھڑا رہا ہے۔ وہ تانگوں کا زانہ تھا۔ تانگے کے پیڑوں اور گھوڑے کے کھڑوں کے ہی نشان سڑک کے پار بھی تھے۔ وہاں بھی تانگہ سڑک سے اتر کر کھڑا رہا تھا۔ رگبیر ننگہ نے صبح سویرے سورج نکلنے سے پہلے ہی اس سڑک کی ناکہ بندی کر لی تھی۔ کسی کو ادھر سے گزرنے نہ دیا، اس لیے کھڑے محفوظ رہے۔

تانگے کے پہیوں کے نشان اتنے صاف تھے کہ ایک نشان میں ایک بڑی واضح چیز نظر آئی۔ وہ یہ تھی کہ پیچھے پر جو ربرٹ چڑھا ہوا ہوتا ہے اس میں تقریباً پون اپنے خلا تھا یعنی ربرٹ کے سرے آپس میں ملے ہوتے نہیں تھے۔ قاتل کے کھڑوں اور تانگے کے پہیوں نے اپنی خاموش شش زبان میں بتایا کہ قاتل فصیل مچھلا ناک، کمر سڑک کی طرف گیا تو تانگہ جو سڑک

تھا جس نے اس پر ایک کھڑکی تھیں۔ اس رات مشغول نے اپنے ارادے اور زمانہ ان کے بچھلے دے دی تھی اس لیے یہ معلوم کرنا ممکن نہ تھا کہ مقتول اس رات بنگلے میں راسخ ہو یا اتر ناکہ بندی بنگلے میں کیا۔

رگبیر ننگہ کے جاننے کے مطابق بنگلے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اسی کمرے میں کوئی شخص نہ تھا۔ البتہ باہر سے کچھ کامیابی پزیر مل گئی۔ ان میں ایک تر قاتل کا کھڑا تھا۔ وہ بنگلے سے داییں طرف گھبرا کر زمین بھلائی تھی۔ بنگلے اور فصیل کے درمیان بیس گز کا فاصلہ تھا۔ راستے میں باغیچہ تھا۔ تقریباً دیوان تھا۔ اس کی زمین کچی تھی۔ کھڑے رپڑوں کے نشان، اس کے نشان تھے۔ یہ شوز تھے۔ داییں پاروں کی ایڑی کے داییں طرف، تھوڑے پچھلے انک بگا ہوا تھا جو ناکہ برکتا تھا کہ وہاں سے ایڑی گھس گئی تھی۔ ایڑی ایڑی تھیں۔ بعض رپڑ، داییں یا بائیں پاؤں ٹیڑھا رہتے ہیں۔ یہ آرمی دایاں پاروں ٹیڑھا رکھنے والا تھا۔ رگبیر ننگہ نے دونوں پاروں کے کمرے کے ناکہ بند کرنے پر غور کیا تھا۔

فصیل یعنی بنگلے کے ارد گرد کی دیوار ڈیڑھ گز اونچی تھی۔ کمرے رگبیر ننگہ کو اس جگہ سے گئے جہاں سے قاتل نے نہیں بھلائی تھی۔ دوسری طرف، جس کمرے سے قاتل تھے۔ وہاں سے

مجھے پریشان دیکھا تو بنس کر بولا۔ ”ملک صاحب! سلبے افریقہ کے جادوگر کچھ پڑھتے ہیں اور ملزم کھپا ہوا سامنے آجاتا ہے۔ مجھے افریقہ بھجوادیں۔ وہ علم سیکھ آؤں گا۔“

حقیقت یہی تھی کہ مجھے حبشیوں کے کالے علم کی ضرورت تھی۔ جسے انگریزی میں ”ویج کرافٹ“ کہتے ہیں۔ میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ دن بھر ملٹری پولیس بیان ریکارڈ کرتی رہی تھی۔ دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ جسم اس لیے دکھ رہا تھا کہ جاسوسوں کا ٹولہ میرے ماتحت پاؤں باندھ کر کاریں اس طرح ڈال کر دریا میں پھینکنے کے لیے لے گیا تھا جیسے میں بریکار سامان سے بھر ہوا کس تھا۔ میں کار کے فرش پر پڑا تھا اور جب کار کچے میں گئی تو اچھل اچھل کر اُس نے میری ہڈیاں توڑ دی تھیں۔ اب دوسری رات بھی جاگتے گزر رہی تھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے رکھیر سنگھ سے کہا کہ آؤ یہ سمجھ کر سو جائیں کہ کوئی میجر قتل نہیں ہوا۔ میں نے سب سے کہا۔ ”اگر ایک درجن میجر قتل ہو جائیں تو بھی مجھے نہ جگانا۔“

میں گھر جا کر سو گیا۔ صبح سویرے ہی آنکھ کھل گئی۔ ذمہ داری کا احساس سونے کہاں دیتا ہے۔ میرے سامنے جو ممکنہ ملزم تھے، ان کی ترتیب یوں بنتی تھی۔ سب سے پہلے جاسوسوں کا ٹولہ تھا مجھے ملٹری انٹیلی جنس اور صوبیدار محمد ثانی نے یہ یقین دلانے

کے پارکچے میں کھڑا تھا گھوم کر اس طرف آ گیا۔ تاتل تانگے بیٹھا اور سپلا گیا۔ وہیں سے تانگے پر چڑھ گیا تھا، اس لیے اس کے پسپوں کے نشان بھی غائب ہو گئے۔ مجھے اب یہ معلوم تھا کہ تانگہ کہاں گیا اور اس میں کون آیا اور گیا۔

ضرورت یہ تھی کہ اس تانگے کو تلاش کیا جانا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ اس کے ایک پیچے کے ربڑ نہیں یوں اپر خملہ لیکن یہ کام پچھتر سے دودھ نکالنے کے برابر تھا۔ تانگوں کے ربڑوں میں اتنے خملے تو ہوتے ہی ہیں۔ اس کے علاوہ انہی بڑی چھانڈنی اور شہر میں تانگوں کا کوئی سسٹم نہ تھا ایک نو شہر اور چھانڈنی کے تانگے تھے۔ دوسرے مضافات علاقوں سے آنے جانے والے تانگے تھے اور میسرے پر میسرے تانگے تھے۔ میں بتا چکا ہوں کہ اس زمانے میں ٹیکسیاں عام نہ ہوئی تھیں اور پبلک ٹویٹ کاریں بھی تھوڑی تھیں۔ زیادہ لوگ تانگہ سواری کرتے تھے۔ بڑے بڑے انسر بھی سوار کے لیے تانگہ استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ میں ایسے تانگے کی تلاش میں دقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا جس کی کوئی واضح نشانی نہیں تھی۔

میرے پاس نہیں چائیاں، ملزم کا کھڑا اور تانگے کے رہا نشان رہ گیا تھا۔ باقی سب اندھیرا تھا۔ رکھیر سنگھ

تھی اور ارشد زندہ دل انسان تھا۔

مجھے ہندو لڑکی پر بھی شک تھا۔ وہ اپنے حسن اور اثر و رسوخ کی بدولت مقتول کو اس بنا پر قتل کرا سکتی تھی کہ اس کے پیچھے مقتول نے پولیس کو ڈالا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کرنل بانسن اور ہندو لڑکی نے اپنے گروہ کے کسی اور ممبر کو بنائے بغیر مقتول کو قتل کرا دیا ہو۔

پھر مجھے ہندو لڑکی کے باپ پر بھی شک تھا۔ اس ہندو کے دل میں مقتول میجر کے غلامت عناد موجود تھا جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مقتول نے اس کا اٹھانوے ہزار کابل روک رکھا تھا جو تادم ہزار کا ہونا چاہیے تھا۔ اس ہندو ٹھیکیدار کو یہ ڈر ہو گا کہ میجر (مقتول) اس کی بددیانتی کی رپورٹ کر کے اس کی ٹھیکیداری بلیک لسٹ کرا دے گا۔ عناد کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اُس کی بیٹی کے ساتھ مقتول کے ناجائز تعلقات تھے اور اس نے لڑکی کی کشمکش کی رپورٹ میں جس واحد شخص پر شک کا اظہار کیا تھا وہ مقتول تھا حالانکہ اس کے پاس اس شک کا کوئی جواز نہیں تھا۔

میں نے سب سے پہلے ہندو ٹھیکیدار کو تختانے بلایا۔ یہ تو میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ قتل اس نے خود نہیں کیا نہ ہی ہندو میں اتنی جرات ہوتی ہے۔ اس نے کرائے کا قاتل استعمال کیا ہو گا۔ میں نے چار گھنٹے اس پر ایسی جرح کی کہ اُس نے فی الواقع میرے

کی پوریں کرکٹ ش کی تھی کہ قتل کی واردات کا سیاسی سوسوں کا ساتھ کوئی متعلق نہیں مگر میں اس گروہ کو نظر انداز نہیں کرتا تھا۔ کچھ وجوہات ایسی تھیں جن کی بنا پر یہ گروہ میجر کو قتل کر سکتا تھا۔ میجر نے مجھے بذریعہ ٹیلیفون اطلاع دی تھی کہ اقبال جرم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے عوض اُس نے سلفانی گواہ بننے کی میری پیش کش قبول کی تھی۔

سہویدار محمد خان نے مجھے بتایا تھا کہ مقتول نے مجھے یہ اس سازش کے سلسلے میں دیا تھا کہ میں مقتول لے بنگلے میں جاؤ گا تو مجھے اغوا کر لیا جائے گا۔ اس کے باوجود مجھے شک تھا کہ بانسن نے اس شک کی بنا پر کہ میجر اسے دیکھ کر نہ دے بہا اسے قتل کرا دیا ہے اور سہویدار محمد خان اس سے بے خبر ہے اپنا شک رفع کرنے کے لیے مجھے جاسوسی کے چاروں طریقوں سے پرچھ کچھ کرنی تھی۔

مشتبہ نمبر ست میں ارشد اور مقتول کی بیوی کو میں نے دوسرے نمبر پر رکھا۔ انہوں نے یہ بیان دیے تھے کہ وہ بوئے بہن جانی ہیں۔ انہوں نے مقتول کو راہ راست پر لانے کے لیے اسے یہ جھوٹا تاثر دیا ہے کہ ان کا ناجائز ارشتانہ ہے مگر اب مجھے شک ہونے لگا تھا کہ تاںک حقیقی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے مقتول کی بیوی جو ان تھی اور اس میں عجیب سی کشمکش

مزید ضرورت نہ ہو تو اسے لے جائیں۔
وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے۔

اُس کی بیٹی جاسوسی کے الزام میں پکڑی ہوئی تھی۔ لہذا اس سے پوچھ گچھ لازمی تھی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میجر کے قتل کے ساتھ اس شخص کا کوئی تعلق نہیں۔ پھر بھی میں نے اپنے اسے۔ اس۔ آئی رکھیرنگھ سے کہا کہ وہ اس ٹھیکیدار کی فرم کے تمام ملازمین کی فہرست دیکھے۔ خصوصاً مزدور درں کی فہرست۔ پھر ان سب سے مل کر یہ معلوم کرے کہ ان میں کوئی ہسٹری شیطری یعنی عادی جرائم پیشہ تو نہیں جس پر یہ شک کیا جاسکے کہ وہ کرائے کا قاتل ہو سکتا ہے۔
رکھیرنگھ اسی ذمت روانہ ہو گیا اور میں مقتول کے بنگلے میں چلا گیا۔ میں مقتول میجر کے اردلی اور خانساں سے ملنا چاہتا تھا۔ وہاں مقتول کے کچھ لواحقین موجود تھے۔ میں نے اردلی اور خانساں کو آگ کر لیا۔ خانساں سے میں قتل سے پہلے بھی مل چکا تھا۔ اردلی کو میں نے پہلی بار دیکھا۔ انہوں نے بتایا کہ میجر (مقتول) نے انہیں شام کا کھانا جلدی دینے کو کہا اور پانچ پانچ روپے دے کر انہیں کہا کہ ان میں کھانا کھا چکوں تو وہ رات بھر کے لیے چھٹی کریں۔ لڑکر چاکر چھٹی اور انعام سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ ان کی بلا سے انہیں چھٹی کیوں دی جا رہی ہے۔ وہ چلے گئے۔ صبح واپس آئے تو میجر قتل ہو چکا تھا۔

پاؤں پکڑیے اور بچوں کی طرح رونے لگا۔ میں نے اسے یہ شک نہیں ہونے دیا کہ مجھے اس پر قتل کا شک ہے۔ اس نے اس جرح کے دوران کوئی بیس مرتبہ پوچھا۔ ”یری بیٹی کہاں ہے۔ میں نے ہر بار اُسے ٹان دیا۔

اُس نے سرت یہ اعتراف کیا کہ مقتول نے اس کا جوبل روکا ہوا تھا وہ واقعی ستاون ہزار کی بجائے اٹھانوے ہزار روپوں کا تھا لیکن میجر نے یہ بل دیا نہ لاری کی وجہ سے نہیں روکا تھا۔ وہ رشوت بہت زیادہ آگاہ رہا تھا اور ہندو ٹھیکیدار اتنی زیادہ رشوت نہیں دینا چاہتا تھا۔ ہندو نے یہ بھی تسلیم کیا کہ اس نے لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ میں مقتول کا نام شامل کر کے اسے دھکی دی تھی کہ وہ مقتول کو گرفتار کرا دے گا۔ اس سے بڑھ کر اُس نے کچھ اور نہیں سوچا تھا، نہ کیا تھا۔ اپنی بیٹی کے متعلق اس نے بتایا کہ اس لڑکی کا دوستانہ کچھ ایک انگریز نو بی افسروں کے ساتھ تھا۔

یہ ہندو ابھی تھا نے میں ہی تھا کہ ملٹری پولیس کا ایک کمیشن اور پارا گورے آگئے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ ہندو ٹھیکیدار کون سا ہے۔ وہ اس کے گھر گئے تھے۔ دہاں سے انہیں پتہ چلا تھا کہ ہندو کو تھانے میں بلایا گیا ہے چنانچہ وہ میرے پاس آگئے اور مجھ سے یہ پوچھ کر کہ اگر مجھے اس کی

کر اور میرے منہ پر کپڑا باندھ کر وہ لوگ اٹھالے گئے تھے۔
 اس کمرے کی چیزیں یہ بتانے سے عاری تھیں کہ یہاں کے
 رہنے والے کو کس طرح قتل کیا گیا ہے۔ کیا اُس نے قاتل کا مقابلہ
 کیا تھا؟ کیا قاتل نے اُسے بے خبری میں دیوبچ لیا تھا؟ قاتل کون
 تھا؟ کیسا تھا؟ اُس کی کوئی نشانی، کوئی سراغ؟ کمرے میں موت
 کی دہشت اور خون کی بو تھی۔

میں یہ سوچنے لگا کہ اس کمرے میں رشوت کی دولت اور شراب
 نے نہ جانے کتنے گناہ کرائے ہوں گے۔ وہاں مجھے اس ڈرامے کا
 آخری منظر سنانے والا کوئی نہ تھا۔ ساتھ والے کمرے میں کوئی
 عورت بین کر رہی تھی۔ شاید مقتول کی ماں تھی۔ فلور لیمپ کا بلب
 ابھی تک جل رہا تھا۔ فرش پر میجر کا خون جم گیا تھا۔ یہ اُس مسلمان
 کا خون تھا جس نے ایک انگریز کرنل اور ایک ہندو لڑکی کے ساتھ
 دوستانہ کیا تھا۔

میں اس کمرے سے نکلا۔ کانسیبل سے کہا کہ وہ تھانے چلا جائے۔
 مقتول کے لواحقین سے کہا کہ وہ اب کمرے میں جا سکتے ہیں اور اس
 کی صفائی بھی کر سکتے ہیں۔ پولیس کو اس کی ضرورت نہیں۔ میں بنگلے
 سے نکلا اور ملزم کے بھاگنے کا راستہ فحش تک دیکھا اور پھر شام
 ہو گئی۔ تھانے گیا اور سوچنے لگا کہ کون سی لائن اختیار کروں۔ بار بار
 ذہن جاسوسی کے ملزموں کی طرف جاتا تھا۔

میں نے اُن کے کوارڈر میں جا کر اُن کے جوتے دیکھے۔ وہاں
 جتنے تالے تھے وہ دیکھے۔ ان میں کوئی جوتا ملزم کے کھڑے سے
 نہیں ملتا تھا اور نہ ہی اُن کے کسی تالے میں اُن نین چابیوں میں
 سے کوئی چابی لگتی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ میجر عیاش آدمی تھا۔ ہندو
 لڑکی اس کے پاس اکثر آتی تھی۔ وہ شراب پیتے تھے۔ میجر کی بیوی
 بُرا مانتی تھی۔ پھر ایک آدمی (ارشند) میجر کی غیر حاضری میں اس کی
 بیوی کے پاس آئے لگا۔ نرس اردو اور خاندانوں نے کوئی نئی بات
 نہیں بتائی۔ انہوں نے جو بتایا وہ میں آپ کو اس سے پہلے تفصیل
 سے سنا چکا ہوں۔ ارشند اور میجر کی بیوی کے تعلقات کے متعلق
 دونوں نے یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں بتایا، سوائے اس کے کہ
 ایک بار ارشند اور میجر کا زبانی جھگڑا ہوا تھا۔

بارود خانے کا بھید۔ جرمن کرنل اور ہندو لڑکی

میں نے واردات کا کمرہ دیکھا۔ رگھیر سنگھ نے کمرہ بند کر وار کھا
 تھا اور وہاں ایک کانسیبل کی ڈیوٹی لگا دی تھی۔ کسی کو اندر جانے
 کی اجازت نہیں تھی۔ میں اس کمرے میں داخل ہوا تو میرے
 جسم نے جھنجھری سی لی۔ یہیں میں نے میجر کو زندہ اور سلامت دیکھا
 تھا۔ یہیں اس کی لاش دیکھی تھی اور یہیں سے مجھے رستوں میں جکڑ

رہے، نہ ہی وہ یہ بتاتے ہیں کہ وہ کس قسم کی جاسوسی کر چکے ہیں اور نہ ہی اپنے پورے گروہ کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ملٹری پولیس کو یہ شک تھا کہ یہ گروہ جاپانیوں کے لیے بھی جاسوسی کرتا ہے۔ اسی عرصہ میں جاپان نے ایسا زوردار حملہ کیا تھا کہ بحر الکاہل کے تمام جزیروں پر قبضہ کر کے اُس کی فوجیں براہ میں داخل ہو گئی تھیں۔ ہندوستان خطرے میں آ گیا تھا۔ ملٹری انٹیلی جنس جانتی تھی کہ جاپانیوں نے ہندوستان میں جاسوسوں کا جال بچھا رکھا ہے اور اس سلسلے میں جاپانیوں کو جرمنی کی مدد حاصل ہے۔ یہ تو انگریز تسلیم کرتے تھے کہ جرمنوں کا جاسوسی کا نظام اس قدر اعلیٰ اور مستحکم ہے کہ جاسوسوں کے کسی رنگ کے ایک یا دو ممبر گرفتار کئے جاسکتے ہیں مگر پورے رنگ کو توڑنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔

کرنل جانسن کا گروہ بھی کسی بہت بڑے رنگ کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔ ملٹری پولیس مجھ سے صحت سوال وجواب نہیں کرتی تھی بلکہ یہ انگریز افسر تفتیش اور سرانظرسانی میں مجھ سے راہنمائی بھی لیتے تھے۔ میں انہیں تفتیش کے بنیادی اصول اور اپنا طریقہ کار بتاتا تھا مگر میری مجبوری یہ تھی کہ ملٹری انٹیلی جنس کی مجھے ذرہ بھر ٹرننگ نہیں ملی تھی۔ تاہم میں ان کی مدد کرتا رہا اور میرا اپنا کیس یعنی مسلمان میجر کا قتل چوپٹ ہوتا رہا۔ بہر حال یہ گورے

میں جاپانیوں کا پھلہ جس میں تین چابیاں تھیں اور جو فیصل کے قریب سے برآمد ہوا تھا، جیب میں ڈال کر کرنل جانسن کے بنگلے میں چلا گیا۔ کرنل جانسن خود تو قائل نہیں ہو سکتا تھا، مجھے اس کے خاندان پر شک تھا۔ بنگلے میں فوجی گارڈ ڈیوٹی پر تھی۔ میرے پاس بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کا اجازت نامہ تھا کہ میں چھاؤنی میں ہر جگہ، ہر دفتر اور ہر لٹ میں جاسکتا ہوں اور جسے چاہوں تفتیش کے لیے پاؤں ملتا ہوں۔ گارڈ کمانڈر نے چھٹی دیکھ کر مجھے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ میں نے خاندان کے کوارٹر میں جا کر اس کے جوتے دیکھے۔ اس کے پاس دو تالے تھے۔ میں نے اس سے سوال پوچھا۔ وہ بالکل صاف نظر آتا تھا۔ میں نے اس سے یہ بھی پوچھا کہ کرنل کے پاس اور کون کون آتا تھا اور کیا ان میں کوئی مشکوک قسم کا آدمی بھی ہوتا تھا؟ خاندان نے بتایا کہ کرنل کے پاس متعدد لوگ آتے تھے۔ خاندان ان میں سے کسی کو بھی نہیں جانتا تھا۔

اس کے بعد ملٹری پولیس نے میرے تین دن ضائع کر دیے۔ تین دن انگریزی بولتے گزر گئے کیونکہ ملٹری پولیس کے افسر انگریز تھے۔ کبھی وہ مجھے اپنے دفتر میں بلا لیتے اور کبھی تھانے میں آ جاتے۔ انہوں نے بتایا کہ کرنل اور ہندو لڑکی نے یہ اعتراف کر لیا ہے کہ وہ جرمنی کے لیے جاسوسی کرتے تھے لیکن وہ جاسوسی کا طریقہ نہیں بتا

در بچوں سمیت یہاں لا کر بند کر دیا تھا۔ پھر یہ عمارت کبھی بھی
ہیں کھولی گئی۔ بد نصیب اور معصوم قیدی اندر بھوکے پیاسے
رکھے اور اب اندر ان کی ہڈیاں پڑی ہیں۔ قیدیوں کی کم سے
کم تعداد تین سو بتائی جاتی تھی۔ بعض لوگ ایک ہزار بھی بتاتے
تھے۔ بہر حال یہ عمارت شہریوں کے لیے معمہ اور پراسرار بنی
ہوئی تھی۔

مجھے جب وہاں لے جایا گیا تو اسرار کا دروازہ کھلا تھا۔ بڑے
لیٹ پر ایک گورا سپاہی رائفلیے کھڑا تھا۔ خاردار ناروں کے
اندر ملٹری پولیس کی گاڑی کھڑی تھی۔ بہت سے فوجی گورے
ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے۔ باہر ایک پنج پر پانچ سویلین آدمی
بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے ایک گورا سپاہی رائفلیے کھڑا تھا۔
یہ جاسوسی کے مشتبہ افراد تھے۔ میں نے انہیں غور سے دیکھا۔
پانچوں چہرے میرے لیے اجنبی تھے۔

میری آمد کی اطلاع اندر گئی تو وہ انگریز میجر اندر آیا جس نے
میرے انوکھے دوران کرنل جانسن اور اس کے گروہ کو کپٹا تھا۔
وہ مجھے دوستانہ طریقے سے ملا۔ اُس نے مجھے کہا۔ ”تم چاروں
سے مل سکتے ہو لیکن یہاں تمہیں جو کچھ نظر آئے اس کا ذکر اس گیت
سے باہر کسی سے نہ ہو۔“ اندر لے جا کر اس نے مجھے ایک کمرہ دکھایا
اور کہا۔ ”اس میں کرنل ہے۔ اس سے مل کر میرے پاس آ جانا“

کوئی ایسے انٹری تو نہیں تھے۔ ان میں ایک سکاٹ لینڈ یارڈ کا
تربیت یافتہ تھا مگر ان کے لیے مشکل یہ تھی کہ ہندوستانی ماحول کو
اچھی طرح نہیں سمجھتے تھے۔

انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ ان چاروں ملزموں سے میجر کے
قتل کا سراغ لینے کی بھی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ
وہ مجھے ان چاروں سے ملنے کی اجازت دیں۔ وہ سوچ میں پڑ گئے
لیکن میں نے ان کی جومد کی تھی، اس کے عوض انہوں نے مجھے
اجازت دے دی اور اگلے روز آنے کو کہا۔

میں گیا تو مجھے چھاؤنی کی ایک ایسی عمارت میں پہنچا دیا گیا
جسے شہر کے لوگ بارود خانہ کہا کرتے تھے۔ یہ انگریزوں کی تعمیر
کی ہوئی بہت پرانی عمارت تھی۔ بارشوں نے اس کی دیواریں سیاہی
مائل کر دی تھیں۔ یہ کئی کمرے تھے۔ درمیان میں ایک گنبد سا
بنایا ہوا تھا۔ ارد گرد خاردار تار تھے۔ لوہے کا گیت تھا جو ہمیشہ
منقل رہتا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ اس کے اندر بارود ہے۔ اسی لیے
اسے بارود خانہ کہا جاتا تھا۔ ظاہر تھا کہ اس میں ریزرو ایمونیشن
ہوگا مگر جنگ کے دوسرے سال تک بھی اس پراسرار عمارت
سے بارود نہیں نکالا گیا تھا۔

ایک روایت یہ بھی مشہور تھی کہ ۸۵ء کی بغاوت میں
انگریزوں نے مسلمانوں کے بہت سے لیڈروں کو ان کی بیویوں

میں کمرے میں داخل ہوا۔ چھت جالوں میں چھپی ہوئی تھی۔
 صرت ایک کھڑکی تھی جو بند تھی۔ یہ بھی جالوں سے ڈھکی ہو
 دیواریں سیاہی مائل تھیں۔ کمرے میں عجیب سی بدبو تھی۔ فرس
 سیم زدہ تھا۔ یہ کمرہ یقیناً ایک صدی بند رہا تھا۔ کمرہ فرار
 ایک دیوار کے ساتھ لکڑی کا پنج پڑا تھا جس پر کرنل جانسن
 تھا۔ اُس کے جسم پر وہی کپڑے تھے جو اُس نے میرے اغ
 رات پہنے ہوئے تھے۔ اس کی پتلون خون آلود تھی۔ اس
 ٹانگ میں ریوالتور کی گولیاں لگی تھیں۔ اُس رات جب وہ پکڑا
 تھا اسے ہسپتال لے گئے تھے لیکن معلوم ہوا کہ اُسے ہسپتال
 میں داخل نہیں کیا گیا۔ پٹی باندھ کر اُسے اس کمرے میں لے گئے
 تھے۔ یہی وہ کرنل جانسن تھا جسے میں اُس کے بنگلے میں پہلی
 ہندو لڑکی کے اغوا کے سلسلے میں ملنے گیا تو اس نے مجھے دھت
 کر بنگلے سے باہر نکال دیا تھا۔ اُس نے بادشاہوں کی طرح میر
 ساتھ بات کرنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

اب میں اس بادشاہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ لکڑی کے پنج پر
 بیٹھا تھا۔ داڑھی بڑھی ہوئی اور سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔
 کپڑے غلیظ تھے۔ پتلون خون آلود تھی اور اس کا چہرہ سوکھ کر
 زرد ہو گیا تھا۔ اس نے دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا رکھی تھی اور یوں
 معلوم ہوتا تھا جیسے مر چکا ہو یا مر رہا ہو۔ اس کی آنکھیں بند

ہیں۔ یہ بھوک، پیاس، شب بیداری اور جسمانی اذیت (تھوڑ
 سی) کے اثرات تھے۔ مجھے دیکھ کر اُس نے آنکھیں ذرا سی
 دلیں۔
 میں نے اُس کے پاس بیٹھ کر کہا۔ ”آپ کو اس حالت میں
 بھکر مجھے افسوس ہو رہا ہے۔“
 اُس نے سر دیوار کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ ذرا سا چہرہ گھما کر اُس نے
 دیکھا اور پوچھا۔ ”تمہیں بھی ان لوگوں نے بلایا ہے؟ تم کیا
 چننا چاہتے ہو؟ مجھے جو کچھ معلوم تھا بتا چکا ہوں۔“
 ”ملٹری پولیس کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔“ میں نے اُسے
 ”میں مسلمان میجر کے قتل کی تفتیش کے لیے آیا ہوں۔“
 ”پوچھو، کیا پوچھتے ہو؟“
 ”اُسے کس نے قتل کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”کسی ایسے تائل نے جسے میں نہیں جانتا۔“ کرنل جانسن
 جواب دیا۔

چند اور سوال جواب ہوئے۔ آخر کرنل جانسن نے کہا۔ ”ملٹری
 پولیس ہر تین گھنٹے بعد مجھ سے یہی سوال پوچھتی ہے جو تم نے پوچھا
 ہے۔ مسلمان میجر کو میں نے قتل کیا ہے نہ کرایا ہے۔ ایسے اقدام کی
 کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں تمہارے اغوا میں موقع پر گرفتار ہوا تھا۔
 ہندو لڑکی کو بھی گرفتار کر لیا گیا اور میرے گردہ کے دو اور آدمی

بھی پکڑے گئے۔ لوکی نے سب سے پہلے انبال جرم کیا جو مجھ د
 تو میں نے بھی انبال جرم کر لیا۔ میں نے مان لیا کہ میں جرمنی
 ہوں۔ اب میرے لیے سزائے موت ہے جو ٹل نہیں سکتی۔ اگر
 کے قتل کا بھی اعتراف کروں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے
 قتل کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو میرا نادار ساتھی تھا۔ اُس
 میری سیکم کے مطابق تمہیں اپنے گھر لانے کے لیے انبال
 اور سلطانی گواہ بننے کا جھانسنہ دیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میر
 محمد خان نے برباد کر دی۔ میں یہ رائے بھی نہیں دے سکتا کہ
 کس نے قتل کیا ہے۔ بہر حال یہ ہمارا کام نہیں تھا۔۔۔“
 وہ بڑی ہی سنجیدہ آواز میں بول رہا تھا۔ اُس نے مجھ سے
 مانگا۔ میں نے کبھی سگریٹ یا سٹشہ پیا ہی نہیں۔ میں نے اُٹھ
 کہا کہ لا دنیا ہوں۔
 اُس نے مجھے ردک دیا اور کہا۔ ”یہ لوگ تو مجھے پانی بھی نہ
 ان سات دنوں میں انہوں نے مجھے صرف تین دفعہ بندوستان
 دیا ہے؟“
 میں بھر بھی میجر کے پاس چلا گیا اور اُس سے سگریٹ مانگا
 نے پوچھا کہ خرید پیڑ گے یا کرنل کو درگے؟ میں نے اُسے بتا دیا
 کو پلاؤں گا۔ میجر نے مسکرا کر ایک سگریٹ اور ماچس مجھے دے
 اور کہا۔ ”یہ تمہاری خاطر ہے؟“
 کوئی جانسن سگریٹ دیکھ کر حیران ہوا۔ میرے منہ کی طرف دیکھنے
 ۱۔ میں نے اُسے کہا۔ ”تم میرے ساتھ تعاون کرو۔ میں تمہیں
 ن اذیت اور توہین سے آزاد کرادوں گا۔“
 اُس نے انہی میں سر ہلا کر کہا۔ ”تمہارے ساتھ تعاون کر چکا
 ل۔ میجر کے قتل کے سلسلے میں میرے ساتھ وقت ضائع نہ کرو۔
 بھتم اذیت سے آزاد نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ مجھے کہہ رہے ہیں کہ
 اپنا تمام تر مشن انہیں بتا دوں اور اپنا سارا گردہ پکڑا دوں۔ یہ
 کبھی بھی نہیں کروں گا۔ میں اپنے ملک سے اپنے ملک کی خاطر نکلا
 گا۔ میرے ملک کے سپاہی جنگ میں مر رہے ہیں۔ ان کی لاشیں
 مارے یورپ میں بکھر رہی ہیں۔ میں اپنے محاذ پر لڑ رہا ہوں۔ میں
 اپنے ملک کے ان جان نثاروں کو دھوکہ نہیں دوں گا جو جانشین فرما
 چکے اور کر رہے ہیں۔ میری قوم پہلی جنگ عظیم کی شکست کا انتقام
 لے کے رہے گی۔ سارے یورپ پر، برطانیہ اور افریقہ پر جرمنی کا جھنڈا
 ہرائے گا۔ میں اپنے سپاہیوں کی طرح جان دے دوں گا۔ جرمنی
 نے نام پر مرجاؤں گا، اپنے گروہ کو بے نقاب نہیں کروں گا۔ میرا رنگ
 مارے ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے۔ میں اپنے محاذ کو صرف اپنی
 جان بچانے کی خاطر تباہ نہیں ہونے دوں گا۔ میں جرمن خون کی توہین
 نہیں ہونے دوں گا“
 اُس کی آواز ابتدا میں بالکل مری ہوئی تھی۔ اُس نے جب اپنے

ملک کی بات شروع کی تو اُس کی آواز میں جان آگئی جو میں نے پہلے میں اُس کے بٹکے میں دیکھی تھی۔ وہ جو ایک لاش کی طرح بے حیا تھا، جوانوں کی طرح سیدھا ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ”اسپیکٹر! تم بائیں نشا بد سمجھ نہ سکتے۔ تم غلامی میں پیدا ہوئے ہو۔ تم نہیں جا۔ قومی وفار کیا سوتا ہے۔ تم کوئی قوم نہیں ہو۔ تمہارا کوئی ملک نہیں ہے۔“

ہے۔ ہم ایرانیوں جوڑ کر بلیوٹ کرے یا جھک کر سلام کرنے کے عادی
اس لیے اس ہندو لڑکی نے ادر میرے ان دونوں ہندوستانی سات
نے اقبال جم کر لیا ہے۔ میں نے انہی کی وجہ سے اقبال جرم کیا۔
لیکن اس میں مرث اپنی ذات کو بے نقاب کیا ہے۔ اپنے گروہ کا
بھر نقصان نہیں پہنچاؤں گا.... تم ان انگریزوں کے خلاف کہ
نہیں اٹھتے؟ کیا تم بالکل نہیں جانتے کہ آزادی کیا ہوتی ہے؟
خان نے مجھے اردلی بن کر دھوکہ دیا ہے۔ اس نے انگریزوں سے ان
حاصل کرنے کے لیے یہ کام کیا ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ میرا گروہ اسے زند
نہیں چھوڑے گا۔ میرے گروہ کو جب پتہ چلے گا کہ ہمیں محمد خان نے گرفتار کر
ہے تو وہ اسے ایسے طریقے سے قتل کریں گے کہ قاتل کا سراغ نہیں ملے گا

یہ سار جنت مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس سے پہلے اُس کے
ماقتلین ملاقاتیں سوچکی تھیں۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو سار جنت
نے مجھے کہا۔ ”پہلے درزیہ کسی سوال کا جواب ہی نہیں دیتا تھا۔

مجھے لڑکی کے کمرے میں داخل کیا گیا

ایسی بہت سی باتیں ہوئیں۔ مجھے

پیٹھ کے بل پڑی تھی۔ اُس کے جسم پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ اُس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں سمجھا وہ مرجی ہے اور میں یہ بھی سمجھ گیا کہ یہ ساندل جیسے گورے اس کے ساتھ کیا سلوک کر گئے ہیں۔

اُس نے مجھے دیکھا۔ اس میں شاید لوہے کی بھی لماعت نہیں رہی تھی۔ اُس نے اٹھنے کی بھی کوشش نہ کی۔ اُس میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی۔ اتنی خوبصورت اور جوان لڑکی بڑیوں کا پنجر بن چکی تھی۔ عورت کا عورت ہونا اُس کی بہت بڑی بد نصیبی ہوتی ہے اور محبوبہ یا محرم عورت کی خوبصورتی تو اُس کے لیے لعنت بن جاتی ہے۔ اس لڑکی کو پہلے حد شرمناک اذیت دی جا رہی تھی۔

برہمنہ لڑکی — باپ کا گناہ

میں باہر نکل آیا اور میجر سے جا کر کہا کہ ایک کبیل وہاں میں اس حالت میں لڑکی کے پاس ایک سیکنڈ کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ میجر نے قہقہہ لگا کر کہا — ”تم مردہ دل ہندوستانی ہو“۔ اُس نے ایک کبیل منگوا دیا جو میں لڑکی کے کمرے میں لے گیا۔ وہ ابھی تک چیت لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے کبیل اُس پر ڈال کر اُسے اٹھنے کو کہا۔ اگر میں اُسے سہارا نہ دیتا تو وہ اٹھ نہ سکتی۔ اُس نے کبیل اوڑھ لیا اور وہیں بیٹھی رہی۔

میں اُس کے پاس فرش پر بیٹھ گیا۔ تب میں نے دیکھا کہ اُس کے کندھوں پر،

مقررہ ڈگری (ڈائجسٹ) سے گزارا جا رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ انگریز افسر کو کردار گورے سپاہیوں سے بہت بلند ہوگا لیکن اس میجر نے آنکھ ما مجھے کہا — ”لڑکی کو اپنی تحویل میں سمجھو۔ نفیش کے علاوہ جتنا وقت اس کے ساتھ گزار سکتے ہو؟“

مجھے اس کا مذاق کچھ اچھا نہیں لگا۔ پھر بھی میں صاحب بہادر کو دینے کے لیے غلامانہ ہنسی ہنس بٹا۔ اُس نے مجھے اشارے سے بتایا جو تھا کمرہ ہے۔ اس کے سامنے کھڑے ہو جاؤ۔ اندر سے جب دو سپاہی باہر آجائیں تو تم اندر چلے جانا۔

میں اُس کا شکریہ ادا کر کے چوتھے کمرے کے دروازے کے سامنے ہو گیا۔ دروازہ بند تھا۔ اندر سے لڑکی کی دبی دبی، گھٹی گھٹی آوازیں رہی تھیں۔ وہ انگریزی میں کہہ رہی تھی — ”خدا کے لیے مجھے چھوٹے مجھے گولی مار دو“۔ وہ بڑی ہی سخت اذیت میں مبتلا تھی۔ میں اُس آوازیں برداشت نہ کر سکا اور برآمدے میں ٹپکنے لگا۔ یہ برآمدہ نہیں سامنے کمرے کے دربان کا ریڈر تھا۔ تاریک اور بدبو دار۔

چند منٹ بعد دو قوی سپاہی کمرے سے نکلے۔ ان جسم ہندوستانی سپاہیوں کی طرح ساندل جیسے تھے۔ وہ جھمکتے ہوئے چلے گئے۔ میں کمرے میں گیا۔ یہ کمرہ بھی جالوں کی چھت سے ہولناک ہلکی سی روشنی کا ایک بلب جل رہا تھا۔ دروازے کی نسبت یہ کمرہ چھوٹا ایسے شک ہونے لگا جیسے یہ کمرہ نہیں بنا رہا ہے۔ لڑکی اینٹوں کے فرش

کہتا تھا کہ میں اردو کے سوا اور کوئی زبان ہی نہیں جانتا۔ اسے گا۔ اس پر سب کی ڈیوٹیاں مقرر ہوئی تھیں۔ یہ لوگ جنگ میں انگریزی بھی بولتا ہے اور کہتا ہے کہ تھوڑی تھوڑی جرمن بھی جانتا ہوں۔

میں ایسے تشدد کا قائل نہیں تھا لیکن جاسوسی کی واردات کی سراغ رسانی بڑا ہی دشوار کام ہے۔ اس میں تشدد لازمی سمجھا ہے مگر اتنے زیادہ تشدد کے باوجود یہ ہندو ملزم اس سے کچھ بھی نہیں بتا رہا تھا جو اس نے (قبائل جرم میں لکھوایا تھا۔ ابھی یہی کہسا جا رہا تھا کہ پورے گروہ کی نشاندہی کرو، اس مشن بیان کرو اور جاسوسی کا طریقہ بتاؤ۔ وہ کہتا تھا کہ کرنل کے سوا کسی اور کو معلوم نہیں اور اُسے گروہ کے کسی اور پر واقفیت نہیں۔

میں نے اس سے میجر کے قتل کے متعلق پوچھا۔ بہت جرح کی مگر نے رورور کر لایا اور دیہی بانیں بتائیں جو کرنل جانسن بتا رہا تھا اس نے بتایا کہ انہوں نے شہر کے ایک ہوٹل میں چائے کی دعوت بہانے میٹنگ کی تھی جس میں کرنل جانسن، مقتول میجر، ہندو لڑکی اور اینگلو انڈین (ایک اور ملزم) شامل تھے۔ صوبیدار محمد خان اس میٹنگ میں نہیں تھا۔ اُسے اس گروہ نے اپنا آدمی سمجھا تھا۔ میٹنگ میرے اغوا اور قتل کی سکیم تیار ہوئی تھی۔ مقتول نے بتایا تھا کہ اُنے مجھے جنگ میں بلانے کے لیے یہ جھانسنے دیا ہے کہ وہ اقبال

میں نے انٹیلی جنس کے میجر سے کہا کہ وہ مجھے لڑکی کے کمرے میں جانے دے۔ اُسے دہرہ بھی بتائی۔ اُس نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا تم اسے اسی میں دیکھنا پسند کرو گے جس حالت میں وہ ہے؟“ میں اُس کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ اچھی حالت میں نہیں تھی۔ اُسے بھی

کے باوجود اُسے اس حالت میں دیکھ کر میرے آنسو نکل آئے۔ میں نے بھی عورتوں کو گرفتار کیا تھا۔ انہوں نے مجھے پریشان بھی کیا تھا۔ ان میں سے بعض نے مجھ سے ہوتے ہوئے جرم سے پردہ اٹھانے سے انکار کیا تھا مگر میں نے زبانی دھمکی کے سوا کبھی کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تھرو ڈاگرز کا طریقہ کسی عورت پر استعمال کروں گا۔ مجھے کرنل جانسن کی باتیں یاد آئیں۔ اُس نے کہا تھا۔ ”تم نہیں جانتے قومی وقار کیا ہوتا ہے۔ تم انگریزوں کے غلام ہو۔“ مجھاکر سلام کرنے کے عادی ہو۔“

میں اٹھ کھڑا ہوا اور بے چینی کے عالم میں ٹہلنے لگا۔ میں بھول چکا تھا کہ میں انگریز کی پولیس کا تھانیدار ہوں۔ مجھے اس عمارت کے متعلق یہ روایت یاد آنے لگی کہ یہاں ۱۸۵۷ء میں مسلمان لیڈروں اور اُن کے بال بچوں کو قید کر کے بھوکا پیاسا مارا گیا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس روایت میں صداقت تھی یا نہیں لیکن اس میں ضرور صداقت تھی کہ ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں نے آزادی کی جنگ لڑی تھی مگر مار گئے تھے اور انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس سے آسمان بھی کانپ گیا تھا۔

انگریزوں نے پردہ نشین مستورات کو سرعام ذلیل و خوار کیا اور مسلمان بچوں کو تڑپا تڑپا کر مارا تھا۔ گاؤں کے گاؤں صاف کر دیئے تھے۔ میں نے اُس دور کے متعلق جو کچھ پڑھا تھا وہ میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ اس ملک کو غلامی کی زنجیروں میں باندھنے کے لیے انگریزوں نے ایسی ایسی

نگالوں پر اور سینے پر دانتوں کے نشان تھے۔ بعض میں سے خون نکل آیا تھا وہ رورے لگی۔ میں نے اُسے کہا کہ یہ لوگ جو کچھ پوچھتے ہیں، وہ سچ سچ بتا دے ورنہ وہ نہیں اسی طرح شرمناک اذیتیں دے دے کر مار ڈالیں گے۔

”مجھے جو کچھ معلوم تھا بتا چکی ہوں۔“ اُس نے کہا۔ ”میں نے جن انصروں سے راز کی باتیں معلوم کیں وہ سب بتا دی ہیں اور یہ بھی بتایا ہے کہ میں یہ باتیں کرنل جانسن کو بتا دیا کرتی تھی۔ مجھے بالکل علم نہیں کہ وہ یہ باتیں جرمِ انسانی جس تک کس طرح پہنچاتا تھا۔ مجھے جو اجرت ملتی تھی وہ بھی بتا دی ہے لیکن یہ لوگ ماننے ہی نہیں۔ کہتے ہیں کہ گروہ کے ہر ایک آدمی کا انا پنا بتا دیا اور یہ بھی بتا دے کہ مسلمان میجر کو کس نے قتل کیا ہے؟“

لڑکی نے بتایا۔ ”ملٹری پولیس مجھے گرفتار کر کے یہاں لے آئی تھی۔ ساری رات جگائے رکھا اور تنگ کرتے رہے۔ میں نے اگلے روز انبال جرم کر لیا۔ پھر یہ دوسری باتیں پوچھنے لگے جو مجھے معلوم نہیں تھیں۔ انہوں نے اُسی روز میرے کپڑے اتار دیئے اور چوبیس گھنٹوں میں سچے سات بار میرے ساتھ یہ سلوک ہوتا ہے۔ رات کو سونے نہیں دیتے۔ کھانے کو اتنا ہی دیتے ہیں کہ میں مر نہ جاؤں۔“

یہ لڑکی مجھ تھی۔ گناہگار تھی۔ اُس نے مسلمان میجر کا گھرا جھاڑ دیا تھا۔ میجر اسی کی دوستی کی وجہ سے قتل ہوا تھا۔ اس لڑکی نے معلوم نہیں کتنے خاندانوں کے دلوں سے اُن کی بیویوں کی محبت نکال دی تھی۔ وہ جاسوسی جیسے سنگین جرم کی مجرم تھی۔ وہ ہندو تھی۔ اس کے جرائم، گناہوں اور مذہب

درندگی کی تھی جسے یاد کر کے انگریز کی اولاد کے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہوں گے۔

اب ایک اور لڑکی ان کے جال میں آگئی تھی۔ وہ بے شک ہندو تھی مگر میرے لیے وہ عورت تھی، غلام تھی۔ وہ بدکار ہی سہی لیکن انگریز انفراس کے ساتھ کون سی نیکی کر رہے تھے؟ تفتیش کی زحمت سے بچنے کے لیے اُسے وحشی قسم کے گوروں سے خراب کر رہے تھے اور انگریز میجر خوش ہو رہا تھا۔ وہ مذاق کے موڈ میں تھا۔ میرے جی میں آئی کہ اس میجر سے جا کر کہوں کہ یہ لڑکی میرے حوالے کر دو اور مجھے ملٹری انشٹی جنس کے دو سرعزساں دے دو، میں تمہیں چیلنج کرتا ہوں کہ مارچ کے بغیر لڑکی سے سارے گروہ کی نشاندہی کرادوں گا مگر میں نے ایسے چیلنج کی برأت نہ کی، کیونکہ یہ کیس مجھے نہیں مل سکتا تھا اور نہ میری کوئی حیثیت تھی۔

مجھے اس لڑکی کے باب پر غصہ آیا جس نے دولت کے نشے میں یا دولت کمانے کے لالچ میں لڑکی کو انگریز انفرسوں سے متعارف کرایا اور اسے ایڈوانس اور سوشل بنادیا تھا۔ اس بد سجت باپ نے لڑکی کو تھیکے حاصل کرنے اور بیل پاس کرانے کا ذریعہ بنایا تھا۔ لڑکی کو اس غاریں وحشی گوروں کے آگے پھینکنے کا ذمہ دار باپ تھا۔

”آپ میرے ہندوستانی بھائی ہیں۔“ لڑکی نے سسک سسک کر کہا۔ ”میری مدد کریں۔ انہیں کہیں کہ مجھے اور کچھ بپتہ نہیں۔ مجھ پر مقدمہ چلائیں اور مجھے گولی مار دیں یا پھانسی دے دیں۔“

”نجات کا یہی ایک ذریعہ ہے کہ وہ جو پوچھتے ہیں انہیں بتا دو“ میں نے کہا۔ ”جاسوسی کی تفتیش کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں، پھر بھی تمہاری مدد کروں گا۔ مجھے میجر کے قتل کے متعلق کچھ بتا دو۔“

”میں کچھ نہیں جانتی۔“ اُس نے جھنجھلا کر کہا۔ ”اپنے خدا کے نام پر مان جاؤ کہ میں نے اُسے قتل نہیں کرایا۔ وہ تو میرے گروہ کا ممبر تھا۔“ ”اچھا۔ میں مان لیتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں جو کچھ پوچھوں وہ سچ سچ بتا دو۔ مقتول کے ساتھ تمہارے تعلقات کیسے تھے؟“

”ایک تو وہ میرے گروہ کا ممبر تھا۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ ”وہ ٹھیکیداروں سے رشوت بہت لیتا تھا اور مجھے خوب عیش کراتا تھا۔ میں اس کی ہر بات مانتی تھی، بلکہ اس کی دانشمنۃ بنی ہوئی تھی۔“

”اُس نے کبھی تمہیں شادی کے لیے کہا تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”تم نے کبھی اس کے ساتھ شادی کی خواہش ظاہر کی تھی؟“

”شادی کی کیا ضرورت تھی؟“ اُس نے جواب دیا۔ ”مجھے کرنل جانسن نے شادی کے لیے کہا تھا لیکن میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں ساری عمر آزاد رہنا چاہتی ہوں۔ میرے لیے مردوں اور دولت کی کوئی کمی نہیں تھی۔ میجر (مقتول) نے شادی کا کبھی اشارہ بھی نہیں کیا تھا۔“ یہ کہہ کر اُس نے بھکاریوں کی طرح کہا۔ ”مجھے پانی پلا دیں۔ یہ لوگ مجھے پانی بھی ترسا ترسا کر دیتے ہیں۔“

میں میجر کے پاس چلا گیا۔ اُس کے کمرے میں نین انسر بیٹھ چائے

مقتول کی بیوی —

ایک اور بھید

اس سوال کے جواب میں اور اس کے بعد میرے بہت سے سوالوں کے جواب میں اُس سے مجھے جو معلومات ملیں وہ تفصیلاً یہ تھیں کہ مقتول نے اپنی بیوی کو سوشل بنانے کی کوشش کی تھی جو بیوی نے کامیاب نہ ہونے دی۔ ہندو لڑکی کی رائے کے مطابق مقتول کی بیوی بے حیائی پسند نہیں کرتی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اُسے اس ہندو لڑکی کا اپنے خاوند کے ساتھ اتنا گہرا میل جول پسند نہ تھا۔ مقتول کو اپنی بیوی سے دلی محبت تھی۔

اُس کی بیوی نے جب ہندو لڑکی پر مقتول کے ساتھ احتجاج اور جھگڑا شروع کر دیا تو مقتول بہت پریشان ہوا۔ اُس نے اس ہندو حسینہ سے دو تین بار کہا کہ وہ اس کی دوستی سے دست بردار ہونا چاہتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا مگر وہ جاسوسی کے جس جال کا حصہ بن چکا تھا اس سے اُس کا زندہ نکلنا ناممکن نہیں تھا۔ لڑکی نے بتایا کہ جاسوسی ایسا کام ہے کہ اس سے اگر کوئی مبرا لگا ہو جائے تو اُسے قتل کر دیا جاتا ہے کیونکہ نہایت اہم راز اور گروہ کی دہشت رگیں اُس کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ وہ کسی بھی وقت دھوکہ دے سکتا ہے۔ ایک بار اُس نے کرنل جانسن سے کہا کہ وہ وعدہ کرتا ہے کہ کوئی راز فاش نہیں کرے گا۔

پی رہے تھے۔ میں نے میجر سے کہا کہ ایک گلاس پانی اور چائے کی پیالی چاہیے۔

میجر نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ ہمارے ملزموں کو خراب کر رہے ہیں میں نے اُسے کہا۔“ میرا ظرفیتش مختلف ہے۔ یہ لڑکی میرے متعلق کچھ کام کی باتیں بنا رہی ہے۔“

میجر نے مجھے چائے کی ایک پیالی بنا دی اور پانی کا گلاس بھی دیا۔ میں پیالی اور گلاس اٹھائے لڑکی کے پاس گیا۔ اُس نے بیک کرگا مجھ سے چھین لیا مگر جب ہونٹوں سے لگایا تو میں نے گلاس پکڑ لیا اُسے کہا۔ ”آہستہ آہستہ پیو۔“

وہ پانی پی چکی تو میں نے چائے کی پیالی اُس کے ہاتھ میں دی۔ وہ اس قدر کمزور ہو چکی تھی کہ اس کا ہاتھ پائے کی پیالی کا بازو بھی اٹھانہ سکا۔ میں نے اُس کے ہاتھ سے پرچ پیالی لے لی اور ہاتھ سے اُسے پیائے پلانے لگا۔ اس نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں آج رات مزاجوں کی۔ میرے جسم میں کچھ نہیں رہا۔“

چائے نے اُس کے جسم میں ذرا سی جان ڈال دی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”مقتول تمہارے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا؟“

”بالکل نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اگر وہ کہنا بھی تو میرے نہ مانتی۔“

”اپنی بیوی کے ساتھ اُس کے تعلقات کیسے تھے؟“

اُسے الگ کر دیا جائے لیکن کرنل جانسن نے اُسے حمایت اچھے الفاظ میں قائل کر لیا کہ وہ الگ نہ ہو۔ الگ نہ ہونے کا نتیجہ یہ بھی تھا کہ اس لڑکی سے بھی الگ نہیں ہو سکتا تھا۔ لڑکی میں اتنی کشش تھی جب لڑکی اور شراب اکٹھی ہو جاتی تھیں تو مقتول بے قابو ہو جاتا تھا۔ لڑکی نے مقتول کی بیوی کے ساتھ دوستانہ کانٹھیں اور اُسے سونے کی کوناش کی تھی مگر بیوی نے اُسے یہ کہہ کر دھتکار دیا تھا۔ ”میں ہندو کی بچی نہیں۔ سامان باپ کی بیٹی ہوں۔ تمہارا مذہب سچا ہے تو تم میں غیرت اور حیا بھی ہوتی۔“

اس کے بعد یہ لڑکی میجر (مقتول) سے ملتی رہی۔ اُس کی بیوی کے سامنے نہیں گئی۔ ایک روز مقتول نے اس لڑکی کو بتایا کہ رات اُس کی بیوی نے اُسے، کرنل جانسن اور لڑکی کو شرمناک حالت میں دیکھ لیا ہے۔ وہ بہت پریشان تھا۔ اس سے کچھ ہی روز بعد مقتول نے ہندو لڑکی کو بتایا کہ اُس کے گھر میں برادری کا ایک آدمی آنے لگا ہے جو اچھے چال چلن کا آدمی نہیں۔ مقتول کچھ پریشان سا تھا پھر جوں جوں دن گزرتے گئے۔ مقتول اپنی بیوی کے متعلق شک و شبہ کا اظہار کرنے لگا۔ اس ہندو لڑکی نے بھی اس آدمی کو دیکھا تھا۔ وہ ارشد تھا۔ لڑکی نے مجھے بتایا کہ وہ مردوں کی ڈیل ڈول اور مالاز سے اُن کی نیت اور اخلاق کا پتہ چلا بیٹی ہے۔ ارشد کو اُس نے مرنے کا ایک بار دیکھا تھا اور اُس نے ارشد کے متعلق میجر سے کہا تھا کہ یہ

دوئی شریٹ ہو ہی نہیں سکتا۔ مقتول نے لڑکی کو ایک روز یہ بتایا کہ اُس نے اپنی بیوی کو یکے بیکے دیا ہے۔ ارشد کے متعلق جھگڑا ہوا تھا۔ بیوی نے اُسے ہاتھ لگا کر کہا تھا کہ تم اس ہندو لڑکی سے تعلق توڑ لو اور میں ارشد سے تعلق توڑ لوں گی۔ مقتول کی بیوی ڈیڑھ دو مہینے سے سیکے میں تھی۔ اس دوران ارشد دو دفعہ مقتول کے پاس آیا اور اُسے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ یہ بات میجر (مقتول) نے ہندو لڑکی کو بتائی تھی۔ اس سے مقتول کا شک پختہ ہو گیا کہ ارشد اُس کی بیوی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔

میرے بے لڑکی کا یہ بیان ایک نیا انکشاف تھا۔ میں نے مقتول کو تفتیش کے دوران بتایا تھا کہ اُس کی بیوی اور ارشد کے تعلقات قابل اعتراض نہیں، وہ تمہارے ساتھ ناٹک کھیل رہے ہیں۔ میری اس بات پر مقتول سوچ میں پڑ گیا تھا بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ اُسے اطمینان ہوا تھا کہ اُس کی بیوی نے اُس کے ساتھ بے وفائی نہیں کی۔ مقتول نے اُس وقت مجھے کوئی ایسی بات نہیں بتائی تھی کہ ارشد نے اُسے کہا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔

”مقتول نے ارشد کے متعلق یہ بات تمہیں کب بتائی تھی؟“ میں نے اُس سے پوچھا۔

”بس روز آپ نے دوسری بار اُس سے تفتیش کی تھی۔ اس سے

یہ لڑکی ننگی بیٹھی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میرے یہاں سے نکلے ہی گورے اس سے کبل چھین لیں گے جو انہوں نے میری خاطر دیا۔ یہ شہزادی تھی۔ بڑے بڑے انگریز افسروں پر اُس نے حسن و انی کا باد چلایا تھا۔ اس نے صحیح معنوں میں دلوں پر بادشاہی تھی اور انگریز افسروں کے سینوں سے راز نکال کر جرمنی پہنچائے تھے۔ میں نے اس شہزادی کو ایسی ذلت میں دیکھا تو خدا یاد آگیا۔

قاتل کے کپڑے — مقتول کا خون

میں اُسے اس حالت میں چھوڑ آیا جس سے اُس کا زندہ بچ نہ سکا۔ میں نہیں تھا اور وہ شاید زندہ رہی بھی نہیں۔ انٹیلی جنس کے میجر شکر یہ ادا کر کے میں وہاں سے اس طرح بھاگا جیسے یہ لوگ میرے ناپڑے ازار کر مجھے بھی کسی غار جیسے بیخ کمرے میں بند کر دیں گے۔ اخیال ہے کہ میرے سوا اس بارود خانے کے اندر کا راز کسی اور معلوم نہیں ہو سکا۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ یہ ملزم اس راز کو اپنی نام قبروں میں لے گئے ہوں گے۔

وہاں سے میں نکلا تو دل پر بہت بوجھ تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اگلے جہان دوزخیوں کو دیکھ کر آیا ہوں۔ تھانے میں گیا تو بہت ترساک اپنے کیس کے متعلق کچھ سوچ نہ سکا۔ یہ ہندو لڑکی آنکھوں

اگلے روز یا شاید دو روز بعد۔ لڑکی نے جواب دیا۔ ”میں اپنے مشن سے واپس آئی تو گھر جانے سے پہلے کرنل جانسن کے پھر اس میجر کے بنگلے میں گئی تھی۔ اپنے کام کی باتیں کہہ سُن کر میجر نے بتایا کہ آج ارشد آیا تھا۔ کہتا تھا کہ اپنی بیوی کو للاق دے دے۔ اُس کے ساتھ ترش کلامی کی تو ارشد نے دھمکی کے بیجے تھا کہ یہ بیوی تمہارے گھر میں نہیں آئے گی۔ اگر آئے گی تو تم میں نہیں ہو گے۔ میجر بہت پریشان تھا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ کام (جاسوسی) نے اس سے اتنی پیاری بیوی چھین لی ہے۔ یہ اس ہندو لڑکی اور مقتول کی آخری ملاقات تھی۔ اور بعد لڑکی کے باپ نے مجھے یہ اطلاع دی تھی کہ لڑکی واپس آگئی۔ میں نے لڑکی کو تھانے بلا کر باپ کی شخصی ضمانت پر اسے پابند کیا۔ میں حیران ہوا کہ میرا کوئی خبر اس لڑکی کو میجر کے بنگلے میں جانے نہ سکتے نہیں دیکھ سکا تھا۔

میں نے لڑکی سے چند اور ضروری باتیں پوچھیں اور جواب لگا تو اُس نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔ اس سے تو اب ردیا بھی نہ جاتا تھا۔ سسک سسک کر منہیں کرنے لگی کہ ان لوگوں سے بچاؤ دلایا۔ وہ ظالموں کے منہ کیجے ہیں آئی سہولی تھی۔ میں نے اُسے جھوٹ دی کہ اُسے اس افسیت سے چھڑانے کی کوشش کروں گا۔ کمرے ایسی بیہودہ بدبو تھی کہ مجھے متلی آ رہی تھی۔ کمرہ بڑا ہی سرد تھا

میں نے اُس وقت بھی ارشد کے منقلب یہ رائے قائم کی تھی کہ وہ غیر معمولی طور پر دلیر اور خوش باش آدمی ہے، مقتول کے مقابلے میں وہ خوب رو بھی تھا اور اس میں ایسی کشش تھی کہ عورت ذات اُسے پسند کرے مقتول کی بیوی بھی خوبصورت اور پُرکشش قد کاٹھ کی تھی۔

وہ سیدھی سادی عورت نہیں تھی۔ اس کے بولنے کے انداز سے میں نے سوچا تھا کہ اس میں خود اعتمادی اور جرأت موجود ہے۔ اب ہندو لڑکی نے جو انکشافات کیا تھا اس سے مجھے شک ہو گیا تھا کہ میجر کو اس کی بیوی اور ارشد نے ہی قتل کرایا ہے مگر یہ شک یقین میں بدل جاتا تو بھی میں اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا کیونکہ کوئی ثبوت نہیں تھا، کوئی شہادت نہیں تھی۔ میں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا تھا کہ ارشد پر ثبات کر دیتا کہ تم قاتل ہو لیکن عدالت میرا اسے قاتل ثابت کرنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے ارشد سے (اگر واقعی قاتل تھا) نابل برآمد کرنا تھا اور شہادت اسی سے حاصل کرنی تھی۔ مجھے پتھر سے دودھ کالنا تھا۔

میرے دماغ میں پہلا سوال یہ آیا کہ میں مقتول کی بیوی سے ملوں؟ — بیکار تھا۔ اس کے ملاقات کو کوئی ثبوت نہ تھا عقل نے کہا ارشد پر حملہ کر مگر ذرا بچ کر۔

میں نے اُسی وقت ایک کانسیٹیل بھیج کر اپنے دو ذہنات ہوشیار اور متعلمد مخبر بلائے۔ انہیں دوسرے دن بارہ بجے سے پہلے دہلی میں

کے سامنے سے ہلتی ہی نہیں تھی۔ انگریز افسروں نے اسے دہلی اور وحشیوں جیسے گوروں کے آگے پھینک دیا تھا۔ بے شک مجرم تھی لیکن شہادت اور ثبوت حاصل کرنے کے اور طریقے ہیں۔ مجھے کچھ ایسے غصہ آ رہا تھا جیسے انگریز سارے ہندو متا آبروریزی کر رہے ہوں۔

رات کے وقت میرا ذہن آہستہ آہستہ قتل کی تحقیقات کو آگیا ہندو لڑکی کے بیان کے مطابق ارشد نے مقتول کو دھکا دیا تھا کہ وہ بیوی کو طلاق دے دے اور کہا تھا کہ اس کی بیوی اس کے گھر نہیں آئے گی۔ اگر وہ آئی تو مقتول اس گھر میں رہے گا۔ مجھے تو ارشد نے کہا تھا کہ وہ اس بھولی بھالی لڑکی کی بیوی کی خاطر مقتول کو راہ راست پر لانا چاہتا ہے۔ پھر طلاق کیوں زور دے رہا تھا۔

اس کے ساتھ ہی مجھے ارشد کے چند الفاظ یاد آئے جو اُس نے میرے ساتھ بائیں کرتے ہوئے کہے تھے۔ اس نے کہا تھا۔ ”لڑکی مقتول کی بیوی کے لیے میں اس قسم کے ایک درجن میٹر کر سکتا ہوں“ — پھر اُس نے مقتول کی بیوی کی بے حد تعریف کی تھی ”ادھر ہماری بیوی ہے جیسے کھڑی پر گائے بندھی ہوئی ہے اس کے ساتھ ہی مجھے اُس کی بیوی کی یہ بات یاد آئی کہ ارشد نے کہا تھا کہ مجھ سے طلاق لے لو۔“

خوشی لے گیا تھا یا اُس کا رویہ کیسا تھا۔ میرے دماغ میں ایک نئی سوچ آئی تھی۔ اس کی تصدیق یا تردید کے لیے مجھے یہ معلومات حاصل کرنی تھیں۔ ارشد کا سسر میری بات سمجھ نہ سکا۔ بڑی مشکل سے میں نے اس سے مطلوبہ رائے حاصل کی۔ اس نے بتایا کہ وہی ارشد جو اپنی بیوی کو پلے ہی نہیں باندھتا تھا اور اس سے جان چھڑاتا پھرتا تھا، اب اپنی بیوی کو اس طرح ضد کر کے لے گیا کہ بیوی کے والدین کسی وجہ سے در در زبرد بھیجنا چاہتے تھے لیکن ارشد کہہ رہا تھا کہ ابھی لے جاؤں گا۔

”یہ اُس کا مطالبہ تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”یا ضد تھی؟“
 ”نہیں جی!“ سسر نے جواب دیا۔ ”اندر اپنی بیوی کے پاس چلا گیا اور اسے کہنے لگا کہ ابھی میرے ساتھ چلو۔ میں نم سے گھر آیا کر معافی مانگوں گا۔ آئندہ تمہیں شکایت نہیں ہوگی۔“

”آپ اُس کے اس رویے سے خوش ہوئے ہوں گے؟“
 ”ہاں جی!“ اُس نے کہا۔ ”اُس نے میری بیٹی کو قبول کر لیا تھا۔“

”کیا آپ حیران نہیں ہوئے تھے کہ اس کا رویہ اچانک کس طرح بدل گیا ہے؟“

”میں نے اپنی بیوی سے حیرت کا اظہار کیا تھا۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میری بیوی نے کہا تھا کہ دیوانِ صاحب کا تعزیر کام کر گیا ہے۔“

لانے کو کہا اور انہیں معمول کی اجرت کے علاوہ انعام کا لالچ دیا۔ ان میں ایک جیب نراش تھا۔ وودفعہ کا سزا یافتہ تھا۔ تیسرا مفرد ابھی ابھی عدالت میں گیا تھا۔ وہ ضمانت پر رہا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ اگر وہ یہ معلومات اُسے آئے تو میں اُس کا یہ مقدمہ عدم ثبوت کی بنا پر بری کرادوں گا۔

دوسرے دن سورج نکلنے ہی میں ارشد کے سسرال چلا گیا اور اُس کے سسر سے ملا۔ مجھے اُس کی بیٹی بہت بڑے خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ گو مجھے ابھی کوئی ثبوت نہیں ملا تھا کہ قاتل ارشد ہی ہے لیکن پولیس والوں کی ایک جو فالنگورگ ہوتی ہے، وہ پھڑکنے لگی تھی۔ مجھے کچھ ایسا نظر آنے لگا تھا کہ میجر قتل ہوا ہے تو قاتل اب اپنی بیوی کو قتل کرے گا تاکہ مقتول کی بیوی کے ساتھ شادی کر سکے۔ برادری میں بلاوجہ طلاق نہیں دی جاسکتی تھی۔

ایسے کئی کیس میرے ہاتھوں سے گزر چکے تھے۔ میں اس سیدھی سادی عورت کو بچانے کی ترکیب کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ باتیں پوچھنی بھی تھیں تاکہ ارشد کے سامنے جاؤں تو اُسے کامیابی سے گھبر سکوں۔ اُس کے سسر سے میں ملا تو معلوم ہوا کہ ارشد تین روز گزرے اپنی بیوی کو اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ یہ تو مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ بزرگوں نے ان کا سمجھوتہ کر دیا تھا۔ میں اب یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ارشد اپنی بیوی کو بادلِ سخاوت سے لے گیا تھا یا ہنسی

اُس نے دیوان صاحب (ایک مشہور مرزا) کا تعویذ ارشد کو اس کی بیوی کے ہاتھوں پانی میں گھول کر پلایا تھا۔

”آپ نے ارشد کے کتے ہمارے دیکھا ہے کہ آپ کی بیٹی ارشد کے ساتھ اب مطمئن ہے؟“

”اُسے گئے ابھی نہیں ہی روز تو ہوئے ہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔
 ”اتنی جلد ہی ہمارا چہان اچھا نہیں لگتا۔ ارشد کہے گا کہ یہ لوگ جاسوس کرنے آئے ہیں۔“

”آپ ہمارے دیکھیں۔“ میں نے اُسے کہا۔

”کیوں؟“ اُس نے پوچھا۔ ”کوئی گڑبڑ ہے؟“

”مجھے ڈر ہے کہ ارشد کا پیر آپ کے دیوان صاحب سے زیادہ کامل ہے۔“ میں نے اُسے کہا۔ ”آپ یا آپ کے گھر کا کوئی فرد ارشد کے گھر بائے اور اگر آپ کی بیٹی میں کوئی گڑبڑ نظر آئے تو مجھے نہایت رازداری سے آج ہی قحانے آکر بتایا جائے۔“

ارشد کا سسر گھبرا گیا۔ میں نے اُسے یہ نہیں بتایا کہ میرا مقصد کیا ہے۔ میرے تجربات نے مجھے ایک شک میں ڈال دیا تھا۔ یہ شک غلط بھی ہو سکتا تھا لیکن سراسر زانی کی عمارت شکوک کی بنیادوں پر ہی کھڑی کی جاتی ہے۔ میں نے ارشد کے سسر کو یہ بھی سختی سے کہا کہ وہ ارشد کو نہ بتائے کہ میں اس کے گھر آیا تھا۔ اسے فوراً ارشد کے گھر جانے کو کہہ کر میں قحانے چلا گیا۔ مجھے ان دو مخبروں سے رپورٹ

میں تھی جنہیں میں نے رات کو بلایا تھا۔ جب کترا مخبر راجے کے قریب آگیا۔ اُس نے نہایت کام کی خبر

دی۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ یہ معلوم کرے کہ ارشد کے کپڑے کون سے بدلے کے پاس ہوتے ہیں۔ وہ اسیر آدمی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اُس کے کپڑے گھر میں بدلے ہوں گے۔ اگر اس نے قتل خود کیا ہے تو اُس کے کپڑوں پر خون کے چھینٹے ضرور پڑے ہوں گے۔ اُس نے کپڑے ہی دھو بی کر دیے ہوں گے مگر یہ اسی صورت میں ہو سکتا تھا جبکہ قتل اُس نے خود کیا ہو۔ وہ دوپے پیسے والا آدمی تھا۔ عین ممکن تھا کہ اُس نے اپنے کسی مزارعے یا تاجر کے اعتماد کو اسے میسر کو قتل کرایا ہو۔ اس صورت میں میرے لیے سراسر زانی ناممکن تھی۔ بہر حال یہ بھی ایک ٹک تھا جس کا سہارا لے کر میں آگے بڑھنا چاہتا تھا۔

دوسرا مخبر اس جیب کتے سے کوئی ایک گھنٹہ بعد آیا۔ وہ بھی مطلوبہ خبریں لے آیا۔ اُس نے آکر بتایا کہ ارشد کا اپنا پرائیویٹ ٹانگو ہے۔ کوچران اس کا ملازم ہے۔ مخبر نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ اس ٹانگے کے دائیں پیچھے کے ربر میں خفوض اسانا ہے۔ میں نے اُسے یہی ہدایات دے کر بھیجا تھا۔ یہ معلومات میں خود بھی ہمارے ماسٹر کر سکتا تھا لیکن ارشد پر ایک ہی بار جھپٹنا پانا تھا۔ اس سے پہلے میں اُسے اپنے متعلق شک میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ میں نے اُسی وقت دوسری رپورٹ کے لیے کانسٹیبل کو بھیج دیا۔

یہ سمجھ کر وہ کپڑے لے لیے تھے کہ شاید وہ خود زخمی ہو گئے ہیں اور یہ ان کا اپنا خون ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ میں نے ایک قاتل کی مدد کی ہے۔ اس کے بعد اُس نے میرے صرف پاؤں نہیں چھوئے، باقی اُس نے منت سماجت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میں نے اُسے تسلی دے کر پوچھا کہ کیا وہ کپڑے واپس کر دیئے ہیں؟

”پرسوں واپس کیے تھے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”لیکن شلوار سے داغ پوری طرح صاف نہیں ہوئے۔ انہوں نے کل بھر واپس کر دیئے ہیں۔ میرے پاس ہی پڑے ہیں۔“ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ کپڑے اُسے کب دیئے گئے تھے۔ اُس کے جواب کے مطابق قاتل کی اگلی شام اسے دیئے گئے تھے اور کپڑے ارشد کا کو جوان لایا تھا۔ دھوبی کے کہنے کے مطابق داغ پکے ہو چکے تھے۔ ان کپڑوں میں شلوار، بوسکی کی قمیض اور واسکٹ تھی۔

میں نے اُسے گرفتار کر لیا

یہ بالکل واضح ہو گیا کہ قاتل ارشد ہے۔ ملاہر تھا کہ مقتول کی بیوی بھی قتل میں شریک تھی۔ میں نے دھوبی کو، سپڈ کانسیٹل اور دوکانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور دھوبی کی دکان پر چلا گیا۔ دو آدمی بحیثیت مشیر ساتھ لیے اور ان کے سامنے دھوبی سے ارشد کے

وہ ایک گھنٹے بعد آیا۔ ادھر عمر آدمی تھا۔ خوفزدہ تھا۔ میں اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو اُس کی سہی سہی ہان نکل گئی۔ میں نے اُسے کہا۔ ”میں نے تمہیں سچ بولنے کے بلایا ہے۔ اگر جھوٹا بولو گے تو یہاں سے واپس نہیں جاسکو گے اُس نے ہاتھ سولہ کر دندہ کیا کہ وہ پورے برے گا۔“

”ارشد کے کپڑے تم دھو تے ہو؟“

اُس کے سپرے پر سوئیدی آئی اس سے میں جان گیا کہ وہ بات سمجھ گیا ہے۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔ ”ہاں حضور! ان کپڑے میں ہی دھونا ہوں۔“

میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور منہ اُس کے منہ کے لیے باکر لاداری سے پوچھا۔ ”وہ کپڑے اُسے واپس دے دیئے ہیں؟“ وہ چپ رہا۔ میں نے کہا۔ ”سوچ کر جواب دو۔ اگر جھوٹ بولنا چاہتے ہو تو بے شک جھوٹ بولو۔ میں تمہیں ایک قاتل کرنے کے الزام میں دس سال کے لیے جیل بھجوا دوں گا۔“

ایک غریب سے دھوبی کے لیے اتنی سی دھمکی کافی تھی۔ اُس ٹھوڑی سی پس دپیش کی۔ کچھ ایسی سرکتیں بھی کہیں جیسے وہ میری سمجھ نہیں رہا لیکن میں نے جب اُسے کہا کہ پچھلے بدھ کی رات انہوں نے تمہیں خون سے بھرتے ہوئے جو کپڑے دیئے تھے وہ اُسے دے کر دیئے ہیں؟ اُس نے ہاتھ سولہ کر کہا۔ ”حضور والا! میں نے

میں نے اس کے سوا کچھ بھی نہ کہا۔ ”تنانکے میں بیٹھو۔ ہم بھی آپ کے ساتھ پھنس گئے۔ تھانے بار اہوں۔“
 ”تو آؤ ملکہ۔ صاحب!۔“ اس نے پریشانی سے کہا۔
 ”میں آپ کو لے چلتا ہوں۔“

وہ تنانکے کی طرف چلا تو میں نے زمین پر دیکھا۔ کچی ہلکے تھی۔ اس پر اس کے جوتے (شوز) کا وہی نشان تھا جو ہنگے اور زمیل کے درمیان اور باہر دیکھا گیا تھا۔ دائیں پاؤں کی ایڑی ایک طرف سے مومت شدہ تھی۔ تھانے میں اس کا مولڈ موجود تھا۔ میں اس کے ساتھ تنانکے کی پچھلی سیٹ پر، سپیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبل اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔
 ارشد نے کوچوان سے کہا۔ ”چھارنی کے تھانے چلو۔“ تنانکے چلا تو میں نے کچی زمین پر پھٹیوں کے نشان دیکھے۔ دائیں پیٹے کے نشان میں تھوڑا سا خلا پیٹے کے چار کے بعد صاف دکھائی دے رہا تھا۔ راستے میں ارشد مقتول کے خلات باتیں کرتا رہا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ تامل گرفتار ہوا یا نہیں۔ میں نے اسے جواب دیا۔ ”آج کچھ سرائے ملا ہے۔ شاید شام تک پکڑا جائے گا۔“

”کون ہے وہ؟“ اس نے پوچھا۔

”ابھی نہیں بتا سکتا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”گرفتاری کے بعد بتاؤں گا۔“

پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور تھانہ آ گیا۔ کوچوان تنانکے

کپڑے ہلکا کر کے۔ تینوں کپڑوں پر خون کے مدہم مدہم چھینٹے دھوبی نے ابھی انہیں دوبارہ بھیٹ نہیں چڑھایا تھا۔ وہ ہلکا ہتر کتھرا نہ رہا تھا۔ اس نے مشینوں کے سامنے جو بیان کرایا اس میں اس نے یہ بھی لکھ دیا کہ ارشد کے کوچوان نے ارشد کا یہ پیغام دیا تھا کہ ان کپڑوں کو درپردہ صاف کرے اور اس کے اسے بیس روپے ملیں گے۔ میں نے کپڑوں کی برآمدگی مشین نامہ تیار کر کے اس پر دھوبی کا انکوٹھا لگوا دیا اور دونوں شہ کے دستخط کیے۔

وہیں سے میں ارشد کے گھر چلا گیا۔ یہ کوٹھی نما مکان تھا۔ بسلا گولا سالان تھا۔ ایک تنانکے گھڑا تھا۔ بڑا خوبصورت پراسٹیوٹ تھا۔ قفا۔ کوچوان گھوڑے کو تھپکیاں دے رہا تھا۔ میں اپنے مکان سے ساتھ ابھی کچھ دُور تھا۔ اندر سے ارشد نکلا اور تنانکے میں بیٹھا کوچوان اگلی سیٹ پر بیٹھا اور اس نے تنانکے مڑا۔

میں رُک گیا۔ ”تانکے ہماری طرف آیا تو میں آگے ہو گیا۔ ارشد نے قریب آ کر تنانکے رکھ دیا اور کوچوان آگے میری طرف آتے ہوئے ایک مخصوص شکفتہ اور پردہ سے بچے میں بولا۔ ”ہاؤ ملکہ صاحب!۔“
 کدھر گھوم پھر رہے ہیں؟ دیکھا آپ نے؟ خدا نے اسے کیسی سزا دی ہے؟ مجھے بہت افسوس ہے کہ وہ مارا گیا ہے لیکن میں یہ ضرور کہوں کہ یہ اس کی بیوی کی آہ کا اثر ہے۔“

میں کہہ تھا جس میں مجھ سے پہلے ایسے اچھے اور مہذبوں پر بے رحمی
تشدد کر کے تفتیش کیا کرتے تھے۔ کسی ملازم کو اس کمرے میں لے
نے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ زبانی سوال جواب نہیں ہوں گے۔
چوان کو اس کمرے میں گئے آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا۔ کانسٹیبلوں کو
نی ڈیوٹی کا علم تھا۔

میں جب اس کمرے میں گیا تو دو کانسٹیبلوں نے میری ہدایت
، بغیر اور مجھ سے پہلے کے تھانیداروں کے طریقہ کار کے مطابق
چوان کو تشدد کے پہلے مرحلے میں داخل کر دیا تھا۔ وہ یہ کہ اسے
پٹھ کے بل ٹاڈا دیا گیا تھا۔ ایک ڈنڈا زمین سے متوازی درمیان
اس سے اس کے منہ میں ڈال کر اس کے دونوں سرے رسیوں سے
اس کی کلائیوں سے باندھے ہوئے تھے، یعنی اس کے بازو دائیں
میں پھیلے ہوئے تھے۔ ایک کانسٹیبل اس کے سر کی طرف پنجہ پر
چٹا تھا جس نے دونوں پاؤں ڈنڈے پر رکھے ہوئے تھے۔ پاؤں
رہانے سے ڈنڈا کو چوان کے منہ (سہنٹوں کے کونوں) میں اتر
باتا تھا۔ کو چوان تڑپتا تھا اور اس کے حلق سے خراٹے نکلتے تھے۔
کانسٹیبلوں نے سچلی عادت کے مطابق یہ عمل شروع کر دیا تھا۔
تشدد کے اس طریقہ کار کا آدھا گھنٹہ ٹھکانے لانے کے لیے کافی
ہوتا ہے۔ عادی مجرم سارا دن بھی سہہ جاتے ہیں۔ میں نے کانسٹیبلوں
سے یہ نہ کہا کہ انہوں نے میرے کہے بغیر اس پر تشدد کیوں شروع

تھانے کے اندر لے گیا۔ میں نے ارشد سے کہا۔ ”آئیے، تھوڑی
دیر کپ شپ ہو جائے گی۔“
اس نے جواب دیا۔ ”پھر کبھی۔“ ملازموں کا۔ بہت ضروری کام
ہے۔“ وہ میرے ساتھ نانکے سے اُترا۔ میں نے کو چوان سے کہا کہ
تم بھی نیچے آ جاؤ۔ ایک کانسٹیبل سے کہا کہ تانگہ پر لے جاؤ اور
سیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ ارشد کو حوالات میں بند کر دو اور کو چوان
پچھلے کمرے میں لے چلو۔

ارشد کا رُک اڑ گیا۔ میرے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی زبان
بند ہو گئی۔ سیڈ کانسٹیبل اسے بازو سے پکڑ کر لے جانے لگا تو اس نے
ہکا کر کہا۔ ”مم۔ مم۔ مم۔“ صاحب! یہ بڑی زیادتی ہے۔“
میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ارشد کے کپڑوں کا بندل اسے
ایس۔ آئی آر کیمبرنگھ کے حوالے کر کے کہا کہ اس کا پارسل تیار کر دو
چٹھی بھی تیار کر دو۔ اس پارسل کو فورنیک ٹسٹ کے لیے بڑی دوا
جانا تھا۔ فورنیک میڈیسن ایک ایسا سائنسی طریقہ ہے کہ جس سے
کپڑوں پر، فرنیچر پر، درمی اور قالین وغیرہ پر خون کے جوداغ اُتتے
جائیں کہ انسانی آنکھ سے دیکھے بھی نہ جاسکیں، اس سے نشان نہایا
ہو جاتے ہیں اور معدومہ طور پر پتہ چل جاتا ہے کہ یہ داغ خون کے ہیں
یا نہیں۔

میں اس کمرے میں چلا گیا جہاں کو چوان کو بھیجا تھا۔ یہ تفتیش

کر دیا ہے۔ اس کی بجائے میں نے اُس کے منہ سے دھمکا ہٹا
— ”جو پوچھوں گا پتہ پتہ بتاؤ گے؟“

اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ سسک کر بولا — ”آپ
پوچھے بغیر مجھے سولی پر چڑھا دیا ہے۔“

میں نے اُسے اسی حالت میں رہنے دیا اور مقتول کا نام
پوچھا — ”تم فلاں رات مقتول کے بنگلے میں ارشد کو تانگے پر
تھے؟“ — اس کے ساتھ کہا — ”اگر تم نے جھوٹ بولا تو دُور
میں ڈال دوں گا اور کل اس وقت تمہارے پاس آؤں گا اور
یہ بھی بتا دوں گا کہ ارشد بک پڑا ہے۔ اُس نے جرم قبول کر لیا ہے
”جناب! میں تو اس کا نوکر ہوں۔“ اس نے کہا — ”اس نے
دیا کہ تانگہ جو تو اور چلو۔ میں اسے میجر صاحب کے بنگلے میں لے گیا
نے تانگہ دُور رکوایا اور مجھے ایک جگہ بنا کر کہا وہاں کھڑے رہنا
اندر چلا گیا۔ میں تانگہ اُس جگہ لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بنگلے
باہر والی دیوار پھلانگ کر آیا۔ اُس نے مجھے آواز دی۔ میں نے
موڑا اور اُسے بٹھا کر گھر لے گیا۔“

میں نے اُس کے ہاتھ کھول دیئے اور بٹھا دیا۔ کانٹیل سے
اسے پانی پلا دیا۔ اُسے تسلی دلا سہ دیا۔ وہ بار بار کہتا تھا کہ اُس کا
تصور نہیں۔ وہ نوکر ہے۔ اُس نے حکم مانا ہے۔ وہ دراصل غریب
مزارعہ تھا۔ میں ان لوگوں کی حیثیت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ قاتل

کے مطابق وہ اعانتِ جرم کا مجرم تھا لیکن میں نے اسے بچا دیا
فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے میں میری خود غرض بھی شامل تھی۔ شہادت
کے لحاظ سے کیس پیچیدہ تھا۔ مجھے سلطانی گواہ کی ضرورت تھی۔
اس کے لیے یہی آدمی موزوں تھا۔ مجھے بہت حد تک یقینی تھا
کہ مقتول کی بیوی بھی اس واردات میں شامل ہے۔ ان تینوں میں
موزوں سلطانی گواہ کو چوان ہی تھا۔

میں نے اُسے کہا کہ جو کچھ وہ جانتا ہے وہ بتا دے۔ پھر اُس
کا بیان مجسٹریٹ کے سامنے ہر گا۔ پھر اُسے جیل کی حوالات میں
بھیج دیا جائے گا اور جب مقدمہ شروع ہو گا تو اُس کی گواہی کے
بعد اُسے رہا کر دیا جائے گا۔ وہ جیل کے نام سے سخت گھبرایا۔ میں نے
تسلی دلا دے کر اُسے بتایا کہ اُسے سزا کے لیے نہیں بلکہ اس کی
حفاظت کے لیے جیل میں رکھا جائے گا۔ بہر حال اُسے اچھی طرح
ذہن نشین کر دیا کہ وعدہ سنا گیا ہوتا ہے اور اس کے
ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔

مقتول کی بیوی کی لپٹ کے نشان اور

چوڑی کے ٹکڑے

اُس نے بیان دے دیا۔ میں نے ارشد کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔

دھل نہ دینے والی عورت ہے۔ ارشد خوبصورت جوان ہے اور اس کی بیوی عام سی شکل و صورت والی ہے۔ یہ شادی برادری کی پابندیوں کے تحت ہوئی تھی۔ ارشد کو یہ رشتہ بالکل پسند نہیں تھا لیکن برادری کی خوشنودی کے لیے اُس نے یہ رشتہ قبول کیا اور نبھانے کی بھی کوشش کی۔

یہ کوچوان ارشد کا معتمد ملازم تھا۔ ارشد کی ذاتی زندگی کے متعلق بہت کچھ جانتا تھا۔ چند ایک واقعات سنا کر اس نے ثابت کیا کہ ارشد میں غیر معمولی دلیری ہے اور وہ خطرہ مول لینے والا آدمی ہے۔ مقتول کی بیوی اس کی قریبی رشتہ دار تھی۔ گھر میں آنا جانا تھا۔ ارشد کی بیوی جب ارشد کے پاس ہوتی تھی تو مقتول کی بیوی اس کے گھر آتی تھی۔ گھر میں برادری کی کتنی ہی قریبی رشتہ دار عورت کیوں نہ آئے، ارشد اندر نہیں جاتا تھا۔ سلام دعا کے بعد دوسرے کمرے میں چلا جاتا تھا لیکن مقتول کی بیوی جب آتی تھی وہ اس کے پاس مزید بیٹھتا تھا۔ زیادہ تر بنسی مذاق ہوتا تھا۔ ارشد کی بیوی ان کے ساتھ نرم بیٹھتی تھی لیکن اُن کے بنسی مذاق میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ پھر برادری میں یہ خبر سنائی دینے لگی کہ میجر (مقتول) کی اپنی بیوی کے ساتھ اُن ہی ہو گئی ہے۔ پھر یہ خبر مشہور ہو گئی کہ میجر کی بیوی اور ارشد کے مہمانتیا اپنے دیسے ہو گئے ہیں۔

اُسے حوالات میں بند رہنے دیا۔ اگلے روز ایک تو اس کا ساتر روز کا ریمانڈ لیا اور دوسرے اس کو پران کا بیان مجسٹریٹ سے ریکارڈ کرا لیا۔ سلطانی گواہ بنانے کے ضمن میں جو قانونی چارہ جو کرنی تھی وہ بھی کر لی اور کوچوان کو جیل کی حوالات میں بھجوا دیا۔ اُس کے بیان نے میرا راستہ صاف کر دیا۔ ارشد کے چال چلن متعلق کوچوان نے بتایا کہ گھر والوں سے الگ رہتا ہے۔ اپنی مرنے والا یعنی خود سہرا در باغی قسم کا آدمی ہے۔ اُس نے باپ جانیاد کا حصہ الگ کر لیا ہے لیکن کوئی ناراضگی پیدا نہیں ہوئی۔ ساری برادری اُس سے ڈرتی بھی ہے اور اُس کی عزت بھی کرتی ہے۔ ہر کسی کے کام آنے والا آدمی ہے۔ برادری میں کوئی کسی مشکل میں پھنس جائے ارشد بن بلائے پہنچ جاتا اور اُس کی مدد کرتا ہے۔ مزارعوں کے ساتھ اس کا سلوک بہت ہی اچھا ہے۔ کسی کی بیوی بچی کو بُری نظر سے نہیں دیکھتا۔ البتہ رنڈیوں کا گانا سننے کا شوقین ہے۔ گھر سے دُور بیکاری کو آتا ہے۔ برادری میں اس کے خلاف کوئی شکایت نہیں۔ اپنی بیوی کے ساتھ اس کا سلوک اچھا نہیں رہا کیونکہ وہ اس کے جوڑ کی نہیں۔ ارشد زندہ دل، خوش باش اور دوسروں کے کام میں بھاگ دوڑ کرنے والا انسان ہے۔ اس کے برعکس اس کی بیوی چپ چاپ، منہ بسورنے والی اور دوسروں کے کام پر

ی ارشد کا اشارہ ملنے ہی آجاتی تھی مگر ارشد کی بیوی کے پتلے کے بعد اگر اُسے ارشد کے چار بیٹا ملے تو وہ ایک بار آتی اور ہنٹ بیٹھ کر چلی گئی۔ ایک بار مقتول کی بیوی نے یہ کہہ کر ل کر دیا کہ پتلے اپنی بیوی کو گھر لادو پھر میں بھی آ جاؤں گی۔ بہت بُری بُری باتیں کر رہے ہیں۔

اس کے جواب میں ارشد نے اُسے یہ پیغام بھیجا کہ ہم دونوں برادری جھوٹی تہمتیں لگا رہی ہے۔ اگر تم دوستی ختم کرنے کے لئے کر چکی ہو تو میں برادری میں یہ مشہور کر سکتا ہوں کہ تم باخاطر میجر کو چھوڑنا چاہتی ہو اور میرے نمبر سے تعلقات توڑیں۔ یہ جواب سن کر مقتول کی بیوی ارشد کے گھر چلی گئی۔ معلوم نہیں تھا کہ اندران کے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔ اس نے یہ دیکھا کہ ارشد نے دروازہ اندر سے بند کر ڈال دیا۔ دروازوں کم و بیش دو گھنٹے اندر رہے۔ مقتول کی بیوی باہر نکلی تو اُس کے بال کبھر سے سوئے تھے۔ وہ کچھ پریشان نظر آتی تھی۔ کوچوان نے یہ بھی دیکھا کہ ارشد کی قمیض پر ہاتھ کے بائیں طرف سرخ نشان تھے۔ یہ نشان مقتول کی بیوی پر لگا تھا کہ پتلے۔ یہ جوان سال اور خوبصورت عورت تھی۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ کوچوان اُسے تانگے میں گھر چھوڑ آیا۔ کوچوان نے مجھے بیان دیتے ہوئے یہ رائے دی کہ اس

کوچوان کئی بار ارشد کو تانگے میں میجر کے بنگلے میں لے گیا۔ میجر کبھی گھر ہوتا تھا کبھی نہیں ہوتا تھا۔ تین چار بار ارشد مقتول کی بیوی کو اُس کے گھر سے اسی تانگے پر سینما دکھانے لے گیا تھا۔ کوچوان نے اپنی رائے یہ دی کہ اس نے انہیں نازیبا حرکتیں کرتے کبھی دیکھا تو نہیں لیکن اُن کی دوستی پاک بھی نہیں تھی۔ ارشد کی بیوی جب اپنے میکے چلی جاتی تھی تو مقتول کی بیوی ارشد کے پاس ضرور آتی تھی۔

کوئی درمیانہ ہوئے ارشد نے کوچوان کو بتایا کہ بار بار اُس حرام زادے میجر نے اپنی بیوی کو گھر سے نکال دیا ہے۔ کوچوان جانتا تھا کہ وجہ کیا ہے۔ مقتول کی بیوی گھر آگئی تو کبھی ارشد اُس کے گھر جاتا اور کبھی وہ ارشد کے گھر آجاتی۔ اس دوران ارشد اور اس کی بیوی میں جھگڑا چل پڑا۔ وہ مقتول کی بیوی کا ارشد کے ساتھ دوستانہ پسند نہیں کرتی تھی۔ ارشد نے تنگ آ کر اپنی بیوی کو میکے بھیج دیا۔

اس کے بعد مقتول کی بیوی نے ارشد کے پاس آنا کم کر دیا۔ ارشد اُسے ملنے کے لیے بیاب رہنے لگا۔ پیغام رسانی کا کام یہی کوچوان کرتا تھا۔ ارشد اسے کسی اور کام سے مقتول کے گھر بھیجتا۔ کوچوان موقع پیدا کر کے مقتول کی بیوی کو کہہ آنا کہ ارشد بلا رہا ہے۔ ارشد کی بیوی جب گھر ہوتی تھی تو مقتول کی

سے پہلے اُس نے اس عورت کو اس حالت میں کبھی نہیں باہر داری، دولت اور سوشل حیثیت میں ایسے پردے تھے۔
 تھا۔ وہ خوش خوش آتی تھی اور خوش خوش چلی جاتی تھی۔ اس کے پیچھے ان لوگوں کے سارے گناہ چھپ جاتے تھے۔ اس
 اداس سی آئی اور پریشانی کے عالم میں گئی۔ کوچوان اسے اس کی ذلت کا یہ عالم تھا (اور اب بھی ہے) کہ ان کی بہو بیٹیوں
 کو واپس آیا اور اُس کمرے میں گیا جہاں ارشد اور یہ عورت رہے تھے، وہاں بڑے صوفے کے پاس اُسے ٹوٹی ہوئی
 چوڑی کے ٹکڑے ملے۔ ایک روز ارشد نے کوچوان کے ہاتھ میں دس دس روپے
 لے دس نوٹ دیئے اور کہا — ”یہ گنو اور جیب میں ڈال لو۔“
 کوچوان نے بیان میں ایسے دو اور واقعات ریکارڈ

ارشد اُسے حکم کے انداز سے پیغام بھیجتا تھا اور وہ حیران اور
 آ جاتی تھی۔ اس سے میں نے یہ رائے قائم کی کہ ارشد
 بلیک میل کر رہا تھا۔ بہر حال مجھے ابھی یہ معلوم کرنا تھا کہ کیا
 عورت قتل میں شریک ہے؟ — کوچوان کو اس کے متعلق
 علم نہیں تھا۔
 ۱۹۴۱ء کا ایک سو روپیہ ۱۹۴۹ء کے ڈیڑھ ہزار روپے کے
 برابر تھا۔ ایک غریب نوکر کے لیے ایک سو روپیہ واقعی دولت
 تھی۔ ارشد نے اسے کہا کہ آج رات میجر (منفول) کے بنگلے میں
 چلا ہے لیکن تم جو کچھ دیکھو اس کا کسی کے ساتھ ذکر نہ کرنا ورنہ
 تم دنیا کے سختے پر نہیں رہو گے۔

برادر یوں میں جب کسی پر تہمت لگتی ہے تو اُس کا جینا
 جاتا ہے لیکن اس برادری میں ارشد نے ایسا مقام پیدا
 کیا کہ لوگ اس سے ڈرتے بھی تھے اور اُس کی عزت بھی کرتے
 بہت سے لوگ تو اس کے احسان مند تھے۔ ارشد اور منفول
 بیوی کے گھرانے امیر کبیر جاگیر داروں اور زمینداروں کے
 گھرانے تھے۔ انہوں نے انگریزوں کو ”وارنڈ“ (جنگی فنڈ)
 بے دریغ چندہ دے کر بھی سوسائٹی میں مقام پیدا کر لیا
 رات کے پہلے پہر کوچوان اُسے تانگے میں چھانڈی لے گیا۔
 بنگلے کے سامنے والی سڑک بڑی تھی۔ اس پر جانے کی بجائے
 ارشد تانگہ پچھلی طرف لے گیا جہاں سڑک چھوٹی تھی اور اکثر
 رات کو سنسان پڑی رہتی تھی۔ بنگلے سے تھوڑی دور تانگہ
 رکوا کر ارشد نے کوچوان سے کہا کہ تانگہ دائیں کو موڑ کر بنگلے کے
 پہلو والی سڑک پر کھڑا کر دو۔ میں بنگلے کے پچھوٹے سے باہر
 آؤں گا۔ تمہیں آواز دوس کا۔ تم تانگہ لے آنا۔ ارشد دراصل

پاس لے۔ سب نے لگا تو ارشد نے اُسے روک کر کہا۔ ”کپڑے کہیں چھپا دو۔ کل دے آنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی نے ہمیں دیکھ لیا ہو اور تم راستے میں پکڑے جاؤ۔“

قتل ایک ایسا بھاناک جرم ہے کہ پیشہ ور اور منجھے ہوئے قاتل بھی غلطی سے پیچھے ایسا سراغ چھوڑ جاتے ہیں کہ پولیس ان کا سراغ لگا لیتی ہے، بشرطیکہ تفتیش کرنے والا انسپکٹر گہری نظر اور تفتیش میں گہری دلچسپی رکھتا ہو۔ ارشد پیشہ ور نہیں تھا۔ اُس نے اپنی دولت کے نشے میں اور اپنی لات زنی کے جھوٹے طلسم میں گرفتار ہو کر یہ واردات کی تھی۔ وہ انارٹی تھا۔ عقل

اس کا ساتھ دیتی تو وہ خون آلود کپڑے خود ہی دھو لیتا یا کوچران سے کہتا تو کپڑے گھر میں ہی صاف ہو سکتے تھے مگر وہ اپنے آپ کو دھڑبیوں، موچیوں، نائیوں اور سزاروں کا بادشاہ سمجھتا تھا مگر انسانی خون نے اس سے انتقام لینے کے لیے اس کی عقل پر پردہ ڈال دیا تھا۔ انسان سے میں نے ترقی یافتہ ممالک کے ماہرین نفسیات کی دوچار کتابیں پڑھی ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ قتل ایسا جرم ہے جسے انسانی ضمیر برداشت نہیں کر سکتا۔ خود قاتل کا ضمیر جبرِ قسم کے چھوٹے بڑے گناہ کا بوجھ اٹھاتا ہے، قتل کے بوجھ کو قبول نہیں کرتا۔ قاتل لا شعوری طور پر موقعہ واردات پر اپنا کوئی نہ کوئی سراغ چھوڑ جاتا ہے یا واردات کے بعد ایسی حرکت کو ہی کرتا ہے

اختیاطی تدابیر اختیار کر رہا تھا۔ کوچران نے بتایا کہ ارشد گھوم کر کے سامنے والے پھانک سے اندر گیا۔ کوچران تانگہ بنگلے کے والی سڑک پر لے گیا۔

شاید نصرت گھنٹہ گزرا ہو گا کہ بنگلے کے پھانک میں ایک داخل ہوئی اور ذرا آگے جا کر رُک گئی۔ فوراً ہی ارشد کو کوچران۔ فصیل پھلانگتے دیکھا۔ اُس نے کوچران کو آواز دی اور سڑک قریب جا کھڑا ہوا۔ کوچران نے تانگے کا منہ دوسری طرف کر دیا۔ اس نے جلدی سے تانگہ گھمایا اور ارشد کے قریب کچے پا جا کھڑا کیا۔ ارشد تیزی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھا اور بولا۔ ”بلدی؟“ وہ جب گھر پہنچے تو کوچران نے دیکھا کہ ارشد کی شلوار تیر اور واسکٹ پر خون کے چھینٹے تھے۔ اُس نے شلوار کی ناف۔ کمائی دار پائوٹ نکالا اور کوچران سے کہا۔ ”چاقو اچھی طرح دھو اور یہ کپڑے ابھی دھو بی کو دے آؤ۔“

کوچران سمجھ گیا کہ ارشد میجر کو قتل کر آیا ہے۔ اُس نے ارشد پوچھا۔ ”کسی نے رہاں آپ کو دیکھا تو نہیں؟ ایک کار اندر آ سکتی۔ وہ کیا آپ کے آدمی تھے؟“

ارشد نے فاتحانہ لبے میں کہا۔ ”وہ معلوم نہیں کون تھے کوئی مجھے دیکھ لیتا تو اُسے بھی میں ادھیڑ ڈالتا۔“ کوچران نے پہلے چاقو دھوا پھر خون آلود کپڑے دھو بی کے

گمان میں بھی نہیں تھا کہ تامل ارشد ہے اور مقتول کا خون ابھی تک اس کے گھر میں پڑا ہے۔ رات کو کوچوان خون آلود کپڑے دھو بی کو دے آیا مگر داغ پوری طرح نہ اُتر سکے۔ اگلی صبح میجر کو دفن کر دیا گیا۔

چار روز بعد ارشد نے مقتول کی بیوی کو اپنے گھر بلایا۔ اس عورت کی حالت بہت بری تھی۔ رنگ پھیکا پڑ گیا تھا اور رو رو کر اس کی آنکھیں سو جی ہوئی تھیں۔ کوچوان کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ ارشد اور اس عورت کے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔ مقتول کی بیوی باہر نکلی تو وہ زیادہ پریشان تھی۔ کوچوان اُسے گھر چھوڑ آیا۔ اس کے بعد ارشد اپنی بیوی کو گھر لے آیا۔ کوچوان کے کہنے کے مطابق ارشد نے اپنی بیوی کے ساتھ کوئی بد سلوکی نہیں کی۔ کل صبح سے اس کی بیوی کو اچانک کوئی تکلیف ہو گئی ہے۔ کہتی ہے کہ سراسر طرح جکڑا ہوا ہے جیسے شکنجے میں کس دیا گیا ہو۔ دل ڈوبنے کی شکایت بھی کرتی تھی۔ کل صبح سے وہ بستر سے اٹھی ہی نہیں۔

تامل کی بیوی بھی....

کوچوان نے جب اس عورت کی بیماری کا ذکر کیا تو میں نے اس

کہ پکڑا جاتا ہے۔ یہ ضمیر کی انتقامی کارروائی ہوتی ہے۔ ایسی ہی حرکت ارشد نے کی۔ وہ کوچوان کے بغیر بھی قتل کر سکتا تھا۔ خون آلود کپڑے گھر میں دھویا دھوا سکتا تھا مگر قدرت کے جس انتقامی نظام نے انسان کے اندر ضمیر رکھ دیا ہے اُس نے اُسے احمق بنا دیا تھا۔ احمق بھی اس حد تک بنایا کہ کپڑے اگلے روز دھلنے کے لیے رکھ لیے۔ اُس نے یہ بھی نہ سوچا کہ چوبیس گھنٹوں بعد داغ پکے ہو چکے ہوں گے۔ واسکٹ کا گرم کپڑا ایسا تھا جس سے پرانا داغ اُترنا ناممکن تھا۔

دوسرے دن ارشد نے کوچوان کو بتایا کہ وہ اپنی بیوی کو راضی کر کے گھر لارہا ہے۔ اُسی روز برادری میں کہرام مچ گیا۔ خبر ملی کہ میجر اپنے بنگلے میں قتل ہو گیا ہے۔ مقتول اسی برادری کا آدمی تھا۔ اُس نے بڑی مشکل سے اپنا تبادلہ اس چھاؤنی میں کرایا تھا۔ یہاں اُس کا گھر تھا۔ برادری کے لوگ مقتول کے بنگلے اور پھر ہسپتال کی طرف دوڑ پڑے۔ لاش ہسپتال جا چکی تھی۔ ارشد بھی ان لوگوں کے ساتھ تھا بلکہ سب سے آگے تھا۔ لاش پوسٹ مارٹم کے بعد لینے میں وہ پیش پیش تھا۔ وہ لکارتا تھا۔ ”میں اس میجر کے خون کا بدلہ ایک درجن آدمی قتل کر کے لوں گا۔“

مجھے یاد آیا کہ مجھے ارشد نے کہا تھا کہ اس لڑکی کی خاطر میں ایسے ایک درجن میجر قتل کر سکتا ہوں۔ کوچوان نے بیان دیا کہ کسی کے

سے پوچھا۔ ”ارشاد اس کے لیے دوائی لایا تھا؟“

”نہیں۔“ کوچوان نے جواب دیا۔ ”بلکہ اس کی بیوی نے مجھے کہا تھا کہ اسے دوائی لادوں مگر میں نے ارشد سے کہا تو اُس نے بے پرواہی سے کہا کہ تم رہنے دو۔ میں خود ڈاکٹر کے پاس جا رہا ہوں۔ آج اس دنت تک جب آپ ہیں ملے ڈاکٹر بھی نہیں آیا، دوائی بھی نہیں آئی۔ اسے تکلیف کل کی نسبت زیادہ ہے۔“

میں نے ارشد کے سر سے کہا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو ہار دیکھے، اور اگر کوئی کڑا بڑ نظر آئے تو مجھے بتائے۔ وہ رات تک تھانے میں نہ آیا۔ اگلی صبح جب میں ارشد کا ریمانڈ لے کر اور کوچوان کا بیان ریکارڈ کرنے کے بعد اُسے جوڈیشل حوالات میں بھیجا اور تھانے میں آیا تو ارشد کا سسر برآمد سے میں بیٹھا تھا۔ اُس نے غالباً ارشد کو حوالات میں نہیں دیکھا تھا۔ اُس کے چہرے پر گہرا بھٹ تھی۔ میں اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔

اُس نے بتایا۔ ”کل تین چار بجے کے درمیان ارشد کے گھر گیا۔ میری بیٹی (ارشاد کی بیوی) بستر پر پڑی ہائے کرتے رہی تھی۔ کہتی تھی کہ سر چھٹ رہا ہے اور سینہ جل رہا ہے۔ اُس نے ارشد کے متعلق بتایا کہ اُس نے اسے کوئی دوائی نہیں دی نہ کسی ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ صبح اُس نے تانگہ تیار کر لیا اور یہ کہہ کر نکل گیا کہ ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں۔ ابھی واپس نہیں آیا۔“

ارشاد کے سر نے آگے چل کر یہ بتایا۔ ”میں نے رات تک ارشد کا انتظار کیا۔ رات آٹھ بجے تک نہ وہ خود آیا نہ تانگہ واپس آیا۔ میں آخر تنگ آ کر چھاؤنی کے ڈاکٹر بہاری چند کے پاس چلا گیا۔ وہ میرے ساتھ آ گیا۔ لوٹکی کی حالت دیکھی تو اُس نے اپنے کمپاؤنڈر کے ہاتھ ایک انجکشن منگوا کر دیا۔ دوائیاں بھی دیں اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ صبح تک سنبھل جائے گی، مگر اب اُس کی حالت اور زیادہ بگڑ گئی ہے۔ کہتی ہے کہ سینہ اور انتڑیاں جل رہی ہیں۔ ڈاکٹر بہاری چند نے آکر دیکھا تو اُس نے کوئی دوائی نہ دی۔ یہ کہہ کر چلا گیا کہ یہ ہسپتال کا کیس ہے۔ میں اسے سول ہسپتال میں داخل کر لیا ہوں۔ اب اُسے ابکائیاں آتی ہیں۔ دوائی بھی اندر نہیں ٹھہرتی۔ میں حیران ہوں کہ ارشد ابھی تک واپس نہیں آیا۔ اُس کا تانا بھی نہیں آیا۔ میں نے اُس کے باپ کو اطلاع دے دی ہے۔“

مجھے یہی توقع تھی۔ تھانیداری کی چھٹی جس نے مجھے یہی اشارہ دیا تھا۔ ارشد نے میجر کو راستے سے ہٹا دیا تھا۔ اب اُس نے راستے کا دوسرا پتھر ہٹانے کا بھی بندوبست کر دیا تھا۔ میں نے ارشد کے سسر کو یہ نہیں بتایا کہ ارشد میری حوالات میں بند ہے۔ میں نے اُسی دنت ارشد کے سسر کو ساتھ لیا اور بھاگ بھاگ سول ہسپتال پہنچا۔ ڈاکٹر سے ملا اور اُسے دنت

کیا تھا، ابھی تک واپس نہیں آیا۔ میں تم سے پوچھنے آیا ہوں کہ وہ کس وقت گھر سے نکلا تھا اور کس کام سے گیا تھا۔ تم گھبراؤ نہیں۔ وہ بچہ نہیں جو گم ہو جائے گا۔
 ”وہ مجھے کہہ گئے تھے کہ ڈاکٹر کے پاس جا رہا ہوں۔“ لڑکی نے جواب دیا۔

اس کے بعد میں اس سے جو کچھ پوچھنا رہا وہ بتاتی رہی۔ ڈاکٹر اس کے جواب لکھتا رہا۔ میرے سوالوں کی ترتیب ایسی تھی کہ اس کے جوابوں سے نہایت ہی کارآمد اور رواں بیان بن گیا۔
 لڑکی لکھ پڑھ سکتی تھی۔ اس نے بیان پر دستخط کر دیئے۔ میں نے اس کا انگوٹھا بھی لگوا لیا۔ اس کا بیان مختصر یہ تھا کہ سمجھوتے کے بعد ارشد اسے گھر لے آیا اور خلافتِ توقع اچھا سلوک کرنے لگا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس نے میجر (مقتول) کی بیوی کے ساتھ تعلقات توڑ لیے ہیں۔ ارشد کھانا اکیلے کھایا کرتا تھا۔ ناشتہ بھی اکیلے کیا کرتا تھا، حالانکہ گھر میں مرن میاں بیوی تھے۔ بیوی باورچی خانے میں ہی کھاپی لیتی تھی۔

کل صبح بیوی اس کے لیے ناشتہ لے کر گئی تو ارشد نے اس سے پوچھا کہ ناشتہ کر لیا ہے یا نہیں۔ بیوی نے ابھی ناشتہ نہیں کیا تھا۔ ارشد نے اسے کہا کہ آج سے ہم اکٹھے کھانا کھایا کریں گے، حاد اپنا ناشتہ ہمیں لے آؤ۔ سیدھی سادی بیوی بہت خوش

سے اٹھا کر مرلیضہ کے پاس لے گیا۔

مرلیضہ کی حالت اس سے کہیں زیادہ خراب تھی جتنی اس باپ نے بتائی تھی۔ اندر کی بے چینی سے جسے وہ جلن کہتی تھی، وہ تڑپ رہی تھی۔ اس نے ڈاکٹر سے اس کی تشخیص کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا کہ معدے میں کوئی اچانک گر بڑ ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ پیریا ہو گیا ہے۔

وہ بیڈریکل اسطلاحیں بولنے لگا تو میں نے اسے پرے جاکر کہا۔ ”اس خاتون کا نزعی بیان لے لیں۔“

”نزعی بیان؟“ اس نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

”جی، نزعی بیان“ میں نے کہا۔ ”اس نے اگر قے کیے تو اگا اگلان کو میں سر بہر کر کے معائنے کے لیے مجبوراً دیتا ہوں۔ کو نماوند نے زہر دیا ہے۔“

میں نے اسے پس منظر بتا دیا اور یہ بھی کہا کہ لڑکی کو یہ نہیں بتایا جائے گا کہ خاوند نے اسے زہر دیا ہے۔ میں سوال کرتا جاؤں گا اور آپ اس کے جواب نوٹ کرتے رہیں۔

ہم لڑکی کے پاس بیٹھ گئے۔ مجھے دیکھ کر وہ گھبرائی۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں دردی میں تھا۔ میں نے اس کی گھبراہٹ کو بھانپتے ہوئے اسے کہا۔ ”تمہارے والد صاحب نے تمہارے میں رپورٹ دی ہے کہ تمہارا خاوند کل صبح تانگے پر سوار ہو کر باہر

ہوئی۔ وہ اپنا ناشتہ بھی اٹھالائی۔ ارشد نے اُسے کہا۔ ”کمہ
مختوڑا بے اور لے آؤ۔“ بیوی کھن لینے چلی گئی۔

واپس آئی تو ارشد دروازوں پیالیوں میں چائے بنا چکا تھا
بیوی نے چائے کا ایک کھوٹ پیا تو کہنے لگی کہ آج چائے کا
ذائقہ کچھ ترش سا ہے۔ ارشد نے اپنی پیالی سے کھوٹ پیا
اور مسکرا کر کہا۔ ”یہ نہ چائے کا قصور ہے نہ تمہارا۔ میری چائے
بھی ایسی ہی ہے۔ شہر میں یہ بڑی تنگی ہے۔ نلگوں کا پانی ٹینکیوں
سے آتا ہے۔ کبھی کبھی ان ٹینکیوں میں جراثیم مارنے کے لیے
دوائی ڈال دیتے ہیں۔ یہ اس دوائی کا ذائقہ ہے۔ گھر کی
تینوں لڑکیاں کھول دینا۔ یہ ذائقہ نکل جائے گا۔“

بیوی نے ان لیا۔ وہ اس خوشی میں مدہوش ہو کر چائے
کی پوری پیالی پی گئی کہ ارشد نے اُسے کہا ہے کہ اب ہم اکٹھے
کھانا کھایا کریں گے۔ اس سے ایک آدھ گھنٹے بعد اسے سر میں
گرائی محسوس ہوئی۔ پھر اس کا سر جکڑا گیا۔ مختوڑی دیر بعد اس
کا دل ڈوبنے لگا۔ سر کی حالت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ جسم اتنا
کمزور ہو گیا کہ وہ لیٹ گئی۔ پہلے اس نے ارشد کو بتایا کہ اس کی
یہ حالت ہو رہی ہے۔ اس نے کہا دوائی لا دوں گا لیکن دوائی لینے
نہیں گیا۔ کوچوان اندر آیا۔ بیوی نے اسے کہا کہ کسی ڈاکٹر سے دوائی
لا رہے۔ وہ بھی دوائی نہیں لایا۔ اس کی حالت یہ ہو گئی کہ پیٹ

اور سینے میں جلن شروع ہو گئی۔

اس نے ارشد کو ایک بار پھر دوائی کے لیے کہا تو اس نے کہا
اچھا لا دوں گا۔ اس کے روٹیے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ اور سوچ
رہا ہے یا اُسے بیوی کی حالت کا احساس نہیں کہ کتنی خراب ہے۔
آزادہ اٹھی۔ فرنیچر اور دیواروں کے سہارے ارشد کے کمرے میں
لٹی۔ وہ بڑے آرام سے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ بیوی نے اسے رد کر
کہا کہ کوچوان سے کہو کہ مجھے تانگے پر کسی ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔
اس نے بیوی کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر اچانک نیزی سے
اٹھا۔ بیوی کو سہارا دے کر سونے والے کمرے میں لے گیا۔ اسے بستر
پر لٹا کر کہا کہ ڈاکٹر کو میں یہیں لے آتا ہوں مگر وہ واپس ہی نہیں آیا۔
دن کے پچھلے پہر اس کا باپ اس کے گھر گیا۔ وہ گھر میں اکیلی پڑی
لڑپ رہی تھی۔ باپ بھی اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ ارشد ڈاکٹر کو لے
کر آئے گا۔

اس کے بعد اس نے وہی بیان دیا جو اس کا باپ مجھے بتا چکا
تھا۔ ہم نے لڑکی کو یہ نہیں بتایا کہ اسے زہر دیا گیا ہے۔ میں نے ابھی
ٹک پر اس کا بیان دلویا تھا۔ یہ شک پختہ تھا مگر یقین نہیں تھا۔
حالات بتا رہے تھے کہ اسے زہر دیا گیا ہے۔ اُس وقت تک لڑکی
دوبارے کر چکی تھی۔ ڈاکٹر نے اگالان اٹھا کر اپنے دفتر میں بھجوا
دیا اور انجکشن لگانے والی سرینج سے اس کی رگ سے مختوڑا سا خون

بھی نکال لیا۔

یہ بد نصیب لڑکی ارشد کے لیے پریشان تھی۔ اس نے دُعا
کہا کہ وہ جوں ہی آئیں انہیں ہسپتال بھیج دینا۔ ڈاکٹر نے فوراً
انجکشن دیئے۔ لڑکی کے باپ کی پریشانی قدرتی امر تھا۔ ڈاکٹر
لڑکی کو تسلی دی۔ میں نے اُس کی حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ کئی
وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ میں ڈاکٹر کے ساتھ وارڈ سے نکل گیا
کا باپ ہمارے پیچھے آیا۔ ہم نے اسے بھی تسلی دی اور کہا
لڑکی کے پاس رہو۔

ڈاکٹر نے اگالڈان میں سے محفوظ اسامواد ایک ٹیسٹ
میں ڈالا۔ اس کا منہ کارک سے بند کیا۔ دوسری ٹیسٹ ٹیوب میں
کا خون ڈالا۔ اسے بھی کارک سے بند کیا اور ایک ڈبے میں
سی روٹی رکھ کر دونوں ٹیوبیں احتیاط سے پکی کر دیں۔ پارسل
گرایا اور اسے لاکھ سے سر بہر کر کے کیمیکل ایگزمینر کے لیے
کر دیا۔ لڑکی کے بیان کو اُس نے لفافے میں بند کر کے لفافہ سر
کیا اور اپنے پاس محفوظ رکھ لیا۔

کچھ میری غلطیاں

لیکن میں رُکا نہیں۔ میں اُسے ذہنی اذیت میں مبتلا کر کے اپنے
کمرے میں چلا گیا۔ اسے۔ ایس۔ آئی رگھیر سنگھ کو میں نے ساری کارگزاری

میں نے اُس سے پوچھا کہ لڑکی کے بچنے کی کوئی اُمید ہے؟
نے جواب دیا کہ اگر اس کی تشخیص صحیح ہو تو فکر والی کوئی بات
نہیں تھی۔ اب تو صورت ہی کچھ اور پیدا ہو گئی ہے۔ اگر یہ
ہے تو چھبیس گھنٹوں میں زہر اپنا کام کر چکا ہے۔ اب لڑکی کا

سنائی اور اُسے کہا۔ ”ذرا اسے (ارشاد کو) چھیڑتے رہو۔“ چھپ سے میری مراد یہ تھی کہ دوستانہ طریقے سے معلوم کرو کہ اس کا ارادہ ہے۔

مجھ سے ایک غلطی ہو گئی تھی۔ ارشد کی بیوی کا بیان لیے وقت میں یہ پوچھنا بھول گیا تھا کہ آیا چائے کے برتن دھل گئے تھے یا نہیں۔ اس کے بیان کے مطابق وہ ناشتے کے ذرا ہی پہ بیمار پڑ گئی تھی۔ معلوم نہیں گھر میں لڑکائی تھی یا نہیں۔ ہو سکتا تھا کہ برتن نہ دھلے ہوں اور پیالی میں کچھ بچی ہوئی چائے پر ہاتھ آجاتی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ شہادت اور ثبوت فراہم کر دینا سب کے قتل کے موقعے کا کوئی گواہ نہ تھا۔

مجھ سے دوسری غلطی یہ ہوئی کہ ارشد اور اس کے کوچوان کو تو حراست میں لے لیا لیکن مکان کی تلاشی نہ لی۔ آلہ قتل فوراً برآمد ہونا چاہیے تھا۔ یہ کارروائی تو اب بھی ہو سکتی تھی لیکن اب برآمدگی اس لیے مخدوش ہو گئی تھی کہ ارشد کے کسی ہمراز رشتہ دار، دوست یا ساتھی ملزم نے آلہ قتل اڑا لیا ہوگا۔ بہر حال میرا ذہن اس پیچ در پیچ کیس کے دوسرے پہلوؤں میں ایسا الجھا رہا کہ میں کچھ غلطیاں یا کوتاہیاں کر بیٹھا۔

اب میں شہادت کے متعلق سوچنے لگا۔ سلطانی گواہ مل جانے سے میں مطمئن نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس کے بیان کو صحیح ثابت کرنے

کے لیے ٹھوس ثبوت کی ضرورت تھی اور یہ خطہ بھی تھا کہ سلطانی گواہ درٹ میں جا کر منحرف ہو جائے گا۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ اقبالی بیان سے کہ یا سلطانی گواہ بن کر ملزم کو رٹ میں منحرف ہو جاتے ہیں۔ بعض تھانیدار ان پر بھروسہ کر کے دیگر شہادت اور ثبوت کی رٹ کو حیرت نہیں دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کیس تباہ ہو جاتا ہے۔ ملزم شک میں بری کر دیئے جاتے ہیں۔ میں ایسی غلطی نہیں رنا چاہتا تھا۔ ارشد کو میں ابھی کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے میں نے مقتول کی بیوی کا بیان لینا ضروری سمجھا۔

میں کیل کانٹے سے لیس ہو کر ارشد پر حملہ کرنا بہتر سمجھتا تھا۔ معلوم نہیں کس طرح ارشد کے باپ کو اطلاع مل گئی کہ ارشد تھانے میں بند ہے۔ میرے کسی کانسیبل نے دو چار روپوں کے لالچ میں اطلاع دی ہوگی۔ اُس کا باپ دس بارہ آدمیوں کے ساتھ لے کر تھانے میں آ گیا۔ میں نے انہیں باہر کھڑا کر کے رکھیں۔ سڑک سے کہا کہ چار کانسیبل لاکھوں سے مسلح ساتھ لو اور ارشد کے مکان پر پہرہ لگا دو۔ گھر میں جو کوئی بھی ہے اُسے باہر نکال دو۔ اس کارروائی کو قانونی طور پر پختہ اور مؤثر بنانے کے لیے چاہیے تو یہ تھا کہ ایک مجسٹریٹ کو ساتھ لے کر مکان سر بمبر کرا دیتا لیکن میں نے ایک دھاندلی کی تاکہ وقت ضائع نہ ہو اور مکان سے کوئی کام کا ثبوت تلف نہ ہو جائے۔ رکھیں سڑک فوراً چار کانسیبلوں کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ میں نے ارشد

باسوسوں کا ایک گروہ پکڑا ہے جس کی تفتیش میں میں بھی شامل ہوں۔ منقول اس گروہ کا سرکردہ ممبر تھا۔ وہ عین اس وقت قتل ہوا جب اس نے مجھے اقبال جرم کے لیے اپنے بنگلے میں بلایا تھا۔ مجھے شک ہے کہ ارشد کا بھی اس گروہ کے ساتھ تعلق ہے۔ انگریز قتل بخش سکتا تھا، اپنے خلاف جاسوسی کے مجرموں کو بغیر مقدمے کے بھی گولی مارنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ خصوصاً اس صورت حال میں جب اس کی فوجیں فرانس سے بھاگ کر یورپ جرمینوں کے قبضے میں دے آئی تھیں اور ادھر جاپان کی فوجیں برما میں داخل ہو کر ہندوستان کے لیے خطرہ بن چکی تھیں۔ انگریز جاسوسی کے مجرموں کو نہیں بخش سکتا تھا۔ ڈپٹی کمشنر بھڑاکا اٹھا۔ اس نے معذرت کے لیے میں مجھے بتایا کہ یہ لوگ ”دار نند“ میں بہت چندہ دے چکے ہیں اور اب ارشد کا باپ پانچ ہزار روپیہ مزید چندہ لایا ہے، مگر اس کے بیٹے کا جرم دہرا قتل اور دوسرا جاسوسی، اس لیے اس کی کوئی مدد نہیں کی جاسکتی۔ ڈپٹی کمشنر نے مجھے ڈانٹ کر کہا — ”یہ لوگ روپے پیسے دے رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم رشوت لے کر کہیں کمزور کر دو۔“ ڈپٹی کمشنر کے پاس ان لوگوں کے جانے اور ”وارنڈ“ میں پانچ ہزار روپیہ چندہ دینے سے مقصد یہ تھا کہ وہ ارشد کو ضمانت پر لے لے اور عثمانیہ دار پر رعب قائم کر دے۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ

کے باپ کو بتایا کہ اس کا بیٹا میجر کے قتل میں زیر حراست ہے اور کوچوان کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ارشد کے باپ نے ضمانت کے لیے کہا۔ جاگیر داری کا رعب جھٹاڑا۔ مجھے ڈپٹی کمشنر (جو انگریز تھا) سے ملنے کی دھمکی دی۔ ارشد سے ملاقات کے لیے کہا۔ میں نے یہ سب کچھ تحمل سے سنا اور اسے خواب دیا کہ آپ نکلنے میں سے تشریف لے جائیں اور باہر جا کر جو بہتر سمجھتے ہیں کریں۔ کورٹ میں ضمانت کی درخواست دیں اور انگریز ڈپٹی کمشنر سے کہیں کہ وہ ۳۰۲ کے ملزم کی ضمانت کرا دے۔ اس کے ساتھ جو لوگ آئے تھے وہ تو مرنے مارنے پر تکتے ہوئے تھے۔ ہر بات دھمکی کے ہیچ میں کرتے تھے۔ انگریزی راج پر انہیں بہت ہی ناز تھا۔ وہ غصے میں دندناتے چلے گئے۔

انگریز بادشاہ اُن پر واقعی بہت خوش تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد ڈپٹی کمشنر کا فون آگیا۔ وہ خود بول رہا تھا۔ وہ ویسٹ میکاٹ کے نام کا بڑا ہی جاہل افسر تھا۔ ارشد کا باپ اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ ڈپٹی کمشنر نے مجھ سے کیس کے متعلق پوچھا۔ میں نے اسے سارا کیس بتا دیا۔ یہ بھی بتایا کہ میں نے ارشد کو محض شک پر نہیں پکڑا۔ وہ ایک قتل کر چکا ہے اور اپنی بیوی کو زہر دے چکا ہے جو شاید کل تک زندہ نہ رہے۔ اس انگریز ڈپٹی کمشنر کو بھڑکانے کے لیے میں نے یہ بھی کہا کہ ملٹری پولیس نے

کی ماں بسن کو کسی بھی وقت نھانے بلا لینا مشکل نہیں تھا لیکن میرا
طرفیہ کار مختلف تھا جو اکثر کامیاب رہتا تھا۔

مقتول کی بیوی — ایک کہانی، ایک گناہ

سوچ سوچ کر میں نے مقتول کی بیوی کے باپ کو نھانے
بلایا۔ قدرتی بات تھی کہ وہ گھبراہٹ کے عالم میں آیا۔ ایسی لڑکیوں
کے باپ بڑے ہی بد نصیب ہوتے ہیں جن کی شادی شدہ بیٹیاں
آشناؤں سے وابستہ ہو جاتی ہیں یا کسی سکیٹیڈل میں لوث ہو جاتی
ہیں۔ یہ انہی باپوں میں سے تھا۔ میں نے اسے احترام سے بھایا
اور احترام سے بات کی۔ ادھر ادھر کی باتوں سے اُس کے دل سے
دمہنت نکالی اور پھر مقتول کے متعلق پوچھا۔ ارشد اور اُس
کی بیٹی کے تعلقات کے متعلق پوچھا۔ اُس نے اپنی بیٹی کی بہت
وکالت کی جو میرے لیے قابل قبول نہیں تھی لیکن اسے وکالت ہی
کرنی چاہئے تھی۔

میں نے اُسے ٹوکا نہیں۔ اُس کی زبردستی بھی نہیں کی بلکہ تائید
ہی کرتا رہا۔ ارشد کے متعلق اُس نے بتایا کہ خوش باش اور ڈھیٹ
آدمی ہے۔ اس کی باقی رائے وہی تھی جو مجھے دوسروں سے معلوم
ہو چکی تھی۔ میں نے لڑکی کے باپ سے کہا کہ میں اُس کی بیٹی سے

اس ڈپٹی کمشنر نے ارشد کے باپ کی درخواست پر یہ کارروائی
کہ اس سے پانچ ہزار روپیہ چندہ وصول کر لیا اور رسید دے دی
مجھے اب مقتول کی بیوی سے ملنا تھا۔ اُس کے خلات میرا شک
منتزلزل ہو رہا تھا اور میں اس سوال میں الجھ گیا تھا کہ وہ اس قتل
میں شریک ہے یا نہیں اور کیا اُس نے ارشد سے کہا تھا کہ وہ اس
کے خاوند اور اپنی بیوی کو راستے سے ہٹائے تو وہ اس کے ساتھ
شادی کرے گی؟ کسی کے خاوند اور کسی کی بیوی کی جب محبت ہو جاتی
ہے تو یہ منظر اس ڈرامے میں تقریباً لازمی ہوتا ہے کہ ”غیر ضروری“
خاوند یا بیوی یا دونوں پر سرسری طریقے سے نقل ہو جاتے ہیں۔ انجام
خواہ کچھ ہی ہو۔ اکثر کمبیوں میں یہ ڈرامہ چھانسی کے تختے پر ختم
ہوا کرتا ہے۔ یہاں بھی یہی ڈرامہ کھیلا گیا تھا لیکن سوال یہ تھا
کہ مقتول کی بیوی کی ایما شامل ہے؟

میں نے اُسے نھانے میں بلانا مناسب نہ سمجھا۔ ایک نوعمرت
ذات تھی، نھانے سے گھبراتی، دوسرے مسلمان تھی۔ جرم خواہ
کتنا ہی گھناؤنا تھا، میں اُسے باعزت ماحول میں دوستانہ طریقے سے
ملنا چاہتا تھا تاکہ وہ کھل کر بات کر سکے۔ رات کو بغیر وردی اُس
کے گھر جانے کی سوچی تو یہ بھی مناسب نظر نہ آیا کیونکہ یہ برادری
بھڑکی ہوئی تھی۔ میں پولیس گارڈز کو دہاں نہیں جانا چاہتا تھا۔
میرے بیسے کسی کے بھی گھر میں، کسی بھی وقت جا دھمکنا اور کسی

”کیا آپ دل میں یہ شک لے کے آئے ہیں کہ میں نے اپنے غار کو ارشد کے ہاتھوں قتل کر لیا ہے؟“

یہ جوان سال عمرت غیر معمولی طور پر ذہین تھی۔ مجھے یہ دیکھنا کہ چالاک بھی بنے یا نہیں۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔ ”ہاں۔ مجھے یہ شک برقع کرنا ہے۔ میں اسی لیے آیا ہوں میں تمہیں ایک بار پھر یاد دلانا چاہتا ہوں کہ میں نے تمہیں بہن کہا۔ اُس نے غم میں ڈربی بری مسکراہٹ سے کہا۔ ”بہن بنا آسان ہے لیکن یہ رشتہ کوئی کوئی مرد نبھانا ہے“

میں نے اُسے یقین دلانے کی پوری کوشش کی کہ میں یہ رشتہ نبھاؤں گا بشرطیکہ وہ بھی اس رشتے کا احترام کرے۔

”میں نے سنا ہے کہ ارشد کی بیوی بڑی سخت بیمار ہے۔“

اُس نے کہا۔ ”آپ ہائیں اور اُسے دیکھیں“

”میں کیوں اُسے دیکھوں؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

”کیونکہ مجھے شک ہے کہ وہ قتل کا دوسرا کیس ہے؟“

”جی!“ اُس نے بڑی زہر بلی مسکراہٹ سے کہا۔ ”ارشد نے اُسے کچھ کہلا دیا ہے؟“

”تم کیسے جانتی ہو؟“

”مجھے شک ہے کہ اُس نے اس منصرم کر ڈنگ مار دیا ہے“

”تو یہ اُس نے تمہاری خاطر کیا ہوگا؟“

”جی!“ اُس نے دانت پس کر کہا۔ ”میری خاطر۔ اُس نے میرا سہاگ اُٹھا دیا اور اپنا گھر برباد کر دیا ہے۔ میں نے اُسے ایسے تو

نہیں کہا تھا؟“

”تم نے کیسے کہا تھا؟“

”وہ میں نے آپ کو بتایا تھا۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میں اپنے خاوند کو بتانا چاہتی تھی کہ تم عیش کر سکتے ہو تو میں بھی کر سکتی ہوں۔“

میں نے ارشد کو بھائی بنا کر ایک ڈرامہ کھیلا تھا۔ اُس نے بس آہ بھری اور کہنے لگی۔ ”گھڑی جو گزر جاتی ہے وہ پھر ملتا تھا نہیں آتی

میں آج سچپتا رہی ہوں کہ میں یہ کیا فیصلہ کر بیٹھی تھی۔ اُس کے آنسو بہہ نکلے۔ اُس نے اپنے آپ پر زنا پرانے کی کوشش نہ کی۔ آنسو بہتے

بہتے اُس کی سسکیاں نکلتی تھیں اور پھر وہ ایسی بے قابو ہوئی کہ منہ پر دوپٹہ ڈال کر ادھر ادھر ملتا چلتا رہا۔ کچھیاں لے لے کے روتی رہی۔ بہت دیر روتی رہی۔

میں نے بڑی مشکل سے اُسے ”سنبھالا۔ تسلی دلا سے دیتے۔ کچھ اُس کے دل کی باتیں کیں۔ وہ سنبھل گئی اور عجیب سے لہجے میں پوچھا

”کیا یہ صحیح ہے کہ آپ نے اُسے گرفتار کر لیا ہے؟ میں نے آج سنا ہے۔“

”ہاں! میں نے اُسے گرفتار کر لیا ہے“

بندو لڑکی کو ترجیح دی تھی۔ حسن و شباب میں بندو لڑکی بھی کچھ کم نہیں تھی لیکن اس کی اصل کشش اس کے ناز و انداز و ارادکاری میں تھی۔ مقتول پر یہی جادو چل گیا تھا۔

میں اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کر کے اصل بات پر آنا چاہتا تھا تاکہ اس کا ذہن اور دل خون سے آزاد ہو جائے، مگر غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکل گیا۔ ”تمہارے خاوند کو کس نے قتل کیا ہے؟“

”ارشد نے“ اس نے بلا توقف کہا۔

اس کے جواب نے مجھے اس طرح چونکا دیا جیسے گہری نیند سے مجھے جگا دیا ہو۔ میں بیدار ہو گیا اور اُس سے پوچھا۔ ”کیا ابھان نے تمہیں بتا دیا ہے کہ میں تمہارا نیا لڑکی حیثیت سے نہیں بلکہ تمہارے بھائی کی حیثیت سے آیا ہوں؟ میں تمہیں تمہانے بلا سکتا تھا۔“

”جی“ اُس نے جواب دیا۔ ”اسی لیے میں نے آپ کو فوراً صحیح جواب دے دیا ہے؟“

”اگر تم مجھے اس طرح صحیح جواب دیتی رہو تو میں تمہارے سر سے دوپٹہ نہیں اُترنے دوں گا۔“ میں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”اور اس درپٹے پر ہاتھ بھی رکھ لوں گا۔ یہ ایک بھائی کا وعدہ ہے۔“

لانا چاہتا ہوں لیکن اس کی عزت کی خاطر اُسے تھانے نہیں بلانا چاہتا اور نہ دن کے وقت اُس کے گھر جانا چاہتا ہوں۔ آخر یہ طے پایا کہ میں رات نو بجے کے بعد وردی کے بغیر اس کے گھر آ جاؤں۔ اُس وقت بردری کا کوئی آدمی وہاں نہیں ہوگا۔ رات کو جب میں اُس کے گھر جانے لگا تو سول ہسپتال ٹیلیفون کیا۔ وہاں کوئی ڈاکٹر نہیں تھا۔ میں نے یہ بتا کر کہ میں کون بول رہا ہوں، کہا کہ مجھے فلاں وارڈ میں فلاں بیڈ کی فلاں نام کی مریضہ کی حالت معائنہ کر کے بتاؤ۔ اتفاق سے ایک نوجوان ڈیپوٹی ڈاکٹر اسی وارڈ میں موجود تھا۔ اُس نے فون پر آ کر بتایا کہ مریضہ کی حالت بہت بُری ہے۔ مسلسل گلو کوڑ دیا جا رہا ہے مگر رات مشکل سے ہی نکلے گی۔

پروپورٹ لے کر میں مقتول کی بیوی سے ملنے چلا گیا۔ اُس کا باپ اُسے ایک کمرے میں میرے پاس بٹھا کر چلا گیا۔ اُس کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ بال بے ترتیب تھے اور چہرے پر گہری اداسی تھی۔ اس سے پہلے میں اُسے ملا تھا تو اُس نے ہلکا ہلکا میک اپ کر رکھا تھا، بال سنورے ہوئے اور کپڑے بہت اچھے تھے۔ مگر اب اپنے قدرتی رنگ میں اُس کی کشش اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ارشد جیسا زندہ دل آدمی اُس کی ناظرہ و قتل کرنے میں حق بجانب تھا۔ مقتول بڑا ہی بد ذوق انسان تھا جس نے اس عورت پر اُس

”اُس کی بیوی کو دیکھنا۔“ اُس نے کہا۔ ”وہ تو تندرست عورت تھی۔ اچانک اُسے کیا ہو گیا ہے؟“
 ”معلوم ہوتا ہے تمہارے دل میں ارشاد کے خلاف بے شمار نفرت بھری پڑی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم کوئی ثبوت بھی دے سکتی ہو؟“

”نفرت؟“ اُس نے اباب بار بھر دانت پیسے اور ہاتھ لمبا کر کے میری کلائی پکڑ لی۔ اُس نے کہا۔ ”میرے دل میں انتقام نے اتنی آگ لگا دی ہے کہ میں عورت نہ ہوتی تو ایک ہاتھ میں اُس کی گردن جکڑ کر اُسے مار دیتی۔“ اُس نے اتنی زور سے میری کلائی اپنی انگلیوں میں جکڑ لی کہ اُس کی انگوٹھی کے دباؤ سے میری کلائی کی ہڈی درد کرنے لگی۔

اُس نے میرا کام آسان کر دیا۔ میں نے اُسے کہا کہ اُس کے دل میں جو کچھ ہے وہ سنا دے۔ پھر میں نے اُس سے کچھ سوال پوچھے۔ کچھ اُس نے تفصیلی جواب دیئے اور جب میں نے اپنے مخصوص مشفقانہ اور دردستانہ انداز کا مظاہرہ کیا تو اُس نے راز کی وہ بات بھی کہہ دی جو عورت کم ہی زبان پر لایا کرتی ہے۔ اُس نے مجھے ذرہ بھر ایسا تاثر نہ دیا کہ وہ گرفتاری سے خوفزدہ ہے اور اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہی ہے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اُس کے اندر غبار بھرا ہوا ہے جو وہ نکالنا چاہتی ہے۔ میں کوئی ایسا

اُس کے بیان کر میں اُسی کے الفاظ میں ذرا اختصار سے پیش کر دیتا ہوں۔ اس میں بند دلوں کی کا ذکر کم کروں گا کیونکہ اُس نے اس لڑکی کے متعلق وہی باتیں بتائیں جو میں پہلے آپ کو سنا چکا ہوں۔

اُس نے کہا۔ ”مجھے اپنے خاوند سے اور خاوند کو مجھ سے محبت تھی۔ یہ مرنے میاں بیوی کی چاہت نہیں، صبح معنوں میں محبت تھی۔ میرے دہچکے پیدا ہوئے۔ ہم دُور دُور کی چھاؤنیوں میں رہے۔ وہ بڑی ہی منحوس گھڑی تھی جب میرے خاوند نے اس چھاؤنی میں تبادلے کی کوشش شروع کی۔ میں بھی خوش تھی کہ اپنے شہر میں رہیں گے۔ خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ تبادلہ ہو گیا۔ یہاں بنگلہ بھی جلدی مل گیا مگر سب سے بڑا ظلم یہ ہوا کہ میرے خاوند کو ایم۔ ای۔ ایس میں بھیج دیا گیا۔ جب گھر میں حلال کی تنخواہ آتی تھی تو برکت، سکون اور خوشی تھی۔ ایم۔ ای۔ ایس کی حرام کی دولت آنے لگی تو گھر میں اُلو بول گئے۔ گھر میں شراب بھی آئی۔ بدکار عورت بھی آئی۔ خاوند نے مجھے بھی بے حیائی کی راہ پر

بروہ نہیں کرتا۔ سب اس کے احسان مند ہیں لیکن اس میں یہ
قص ہے کہ بڑا ملتا ہے اور غیر ضروری حد تک دیر ہے

میں سنس پڑی۔ وہ جذباتی ہو گیا

”میرے سیکے گھر میں اُس کا بہت آنا جانا تھا۔ بد قسمتی سے
میں بھی زندہ دل تھی۔ طبیعت بننے کھیلنے کی طرت آمادہ رہتی تھی۔
میری ازدواجی زندگی دوسروں کے لیے قابل رشک تھی۔ کوئی
فکر فاقہ نہ تھا۔ اس سے میری زندہ دلی قائم رہی، بلکہ بڑھ
گئی۔ جب خاوند میرے ہاتھ سے نکل گیا اور ہندو لڑکی کے جال
سے اس کا نکلنا محال ہو گیا تو میں نے ایک روز ارشد کو اپنے یہ
سارے حالات بتائے۔ اُس نے پہلی بات یہ کہی۔ ”کہو تو
اُس کا سر کاٹ کر تمہارے قدموں میں رکھ دوں۔“ ہم میں بہنوں
بھائیوں والی بے تکلفی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ میرا خاوند ایسا بُرا
اور بد نیت آدمی نہیں۔ وہ اب بھی مجھے چاہتا ہے لیکن جس
جال میں وہ پھنس گیا ہے اس میں سے نکالنے کے لیے ایک
جھٹکے کی ضرورت ہے۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ تم میرے ہنگے
میں آنا شروع کرو اور ہم اس طرح کی ایکٹنگ کریں گے۔ جیسے
ہم نے آپس میں نایاب نرے تکلفی پیدا کر لی ہے۔ ارشد میں ایک

ڈالنے کی کوشش کی۔ کرنل جانسن جیسا کہ فر بھی آیا جس نے
بدکاری پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ ہندو فاحشہ میری
میری خوشیاں اور میرا سہاگ چھین کر لے گئی۔ میں نے اپنے گھر
اُسے نزکا دیکھا اور کرنل جانسن کے ساتھ اور اپنے خاوند کو
لڑکی کے ساتھ گتوں کی حالت میں دیکھا۔ میں نے خاوند
پاؤں بھی پکڑے۔ بہت روئی۔ محبت کی قسمیں دیں۔ بچوں
واسطے دینے مگر شراب، رشوت اور عورت نے اُسے اندھا
”ان حالات نے مجھے بھی اندھا کر دیا لیکن میری نیت بُر
نہیں تھی۔ میں نے اپنے خاوند کو جھٹکا دینے کے لیے ایک
بنائی۔ اس کے لیے میں نے ارشد کو منتخب کیا۔ ارشد۔ اتنا
آدمی نہیں تھا جتنا بُرا بعد میں ثابت ہوا۔ برادری میں ہر
اسے پسند کرتا ہے۔ کسی گھر میں چلا جائے گھر کی جوان لڑکیا
بھی اس سے حجاب نہیں کرتیں۔ بوڑھیاں اُسے بیٹا سمجھتی
کسی بھی گھر کے مرد اس کا گھر میں آنا پانا پسند نہیں کرتے۔ وہ
زندہ دل انسان ہے۔ اس کے خلاف کسی کو کوئی شکایت نہ
حالاں کہ سب جانتے ہیں کہ وہ لڑکیوں کا گانا سننے جاتا ہے۔ سہ
کہتے ہیں کہ وہ شراب پیتا ہے لیکن ایسا کوئی نہیں ملتا جو یہ کہ
اُس نے اسے شراب پینے دیکھا ہے۔ برادری کے دائرے میں
ایک نیک پاک انسان ہے۔ باہر جا کر وہ جو کچھ کرتا ہے اس کی

نقص یہ بھی ہے کہ سکھوں کی طرح سوچنا کم ہے۔ جو کرنا چاہے
 کر گزرتا ہے۔ اگر ضرورت پڑے تو سوچنا بعد میں ہے۔ وہ
 نتائج کی پروا نہیں کیا کرتا۔ اگر میں بے عقل ہو گئی تھی تو اس
 عقل سے کام لینا چاہئے تھا۔ میرے جذبات ایسی بُری طرح
 کچلے گئے تھے کہ میری توجہ نقل ہی ماری گئی تھی۔ اُس نے میری
 سکیم سنی تو جھوم کر بولا۔ 'لو۔ کل ہی لو۔' اُس روز میں ماں باپ
 کے پاس آئی ہوئی تھی۔ دوسرے دن بنگلے میں چلی گئی۔ اُسی
 شام ارشد آگیا....

بہت تو تو میں میں ہوئی۔ اُس نے کہا کہ ارشد سے تعلق توڑ لو۔
 میں نے اُسے کہا کہ تم اس ہندو لڑکی سے تعلق توڑ لو۔ میں پہلے
 آپ کو تفصیل سے بتا چکی ہوں۔ میرے سر پر قرآن رکھ دو،
 میں کہوں گی کہ ارشد کے اور میرے تعلقات بہن بھائیوں جیسے
 بھائی۔ خاوند نے مجھے اسی طرح محبت کے واسطے دیئے جس طرح
 میں نے اُسے دیئے تھے مگر میں حیران ہوں کہ وہ اتنی محبت
 کے باوجود میری بات کیوں نہیں مانتا تھا اور ہندو لڑکی سے
 تعلق کیوں نہیں توڑتا تھا....

”آخر ایک روز ہم میں اتنی زیادہ لڑائی ہوئی کہ میں میکے
 آئی۔ سات آٹھ دنوں بعد خاوند آیا۔ اُس نے بہت منت کی
 کہ واپس چلو، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن میں نہ گئی۔ میں
 اسے بہت پریشانی کرنا چاہتی تھی۔ ارشد میرے پاس آنا رہا۔ میں اس
 نے گھر جاتی رہی۔ اس کی بیوی بدھو سی لڑکی ہے۔ اس میں ذرہ بھر
 چڑتی اور چالاکی نہیں۔ ارشد نے اس کے متعلق کبھی بات نہیں
 کی تھی۔ اب اُس نے بیوی کے خلاف باتیں شرفِ عرض کر دیں۔ اس
 سے بیزار رہنے لگا۔ میں اُسے اس رویے سے منع کرتی تھی....

”ایک روز ارشد نے کہا۔ 'مجھے خدا سے یہ شکایت ہے کہ
 اُس نے تمہیں میری بیوی کیوں نہیں بنایا۔' میں اپنی عادت کے
 مطابق ہنس پڑی۔ وہ اس قسم کا مذاق تو کیا ہی کرتا تھا، مگر

”میرا خاوند گھر تھا۔ اُسے ارشد نے رسمی سا سلام کیا اور میرے
 پاس آگیا۔ اس کے بعد وہ دوسرے تیسرے دن آ جانا اور میرے
 پاس بیٹھا رہتا۔ بعض اوقات میں اُسے کہتی کہ وہ پانچ چھ
 دن نہ آئے۔ وہ اتنے دن نہ آتا تو میں خاوند سے کہتی کہ میں
 ذرا گھر جا رہی ہوں۔ اُسے یہ شک ہو جاتا کہ ارشد اتنے دن
 سے نہیں آیا اس لیے میں اُسے ملنے جا رہی ہوں۔ پھر میں ارشد کے
 ساتھ بکچر دیکھنے بھی گئی اور ایک بار میرا خاوند باہر سے آ رہا
 تھا تو میں اُس کے قدموں کی آواز سن کر ارشد کے ساتھ لگ
 کر بیٹھ گئی۔ خاوند کمرے میں آیا تو میں چہرے پر بناوٹی گھبراہٹ
 پیدا کر کے پرے ہو گئی۔ خاوند کا رنگ بدل گیا۔ وہ سمجھا کہ
 اس لمحے میں موقع پر پکڑ لیا ہے۔ اُس رات میری اور خاوند کی

اس روز کے بعد وہ اسی قسم کی باتیں کرنے لگا۔ اس کا لب و لہجہ اور انداز بدلنے لگا۔ ایک روز میں اُس کے گھر گئی۔ اُس کی بیوی غل خانے میں تھی۔ ارشد کو میں نے پہلی بار جذباتی کیفیت میں دیکھا۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر جذباتی بےج میں کہا۔ ”اتنے دن انتظار نہ کرا یا کرو، اُس نے میرے دوپٹے کا پلو ہاتھ میں لیا۔ اسے چوما اور دوپٹہ اپنے منہ پر پھیر کر پلو سلیقے سے میرے کندھے پر ڈال دیا۔ میں فیصلہ نہ کر سکی کہ اس کی اس حرکت کو پسند کروں یا اسے کہوں کہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرے....

”پھر اُس پر میری محبت کا جنون سوار ہو گیا۔ ادھر برادری میں ہم دونوں پر تہمتیں لگنے لگیں۔ سب سے پہلے مجھے ماں نے بتایا کہ لوگ ہمارے متعلق باتیں کر رہے ہیں۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ یہ سب بکواس ہے۔ میں نے ارشد سے کہا کہ اب ہمارا زیادہ ملنا ٹھیک نہیں، برادری میں بکواس ہو رہی ہے مگر اس کی سنگتہ شخصیت کے زیر اثر میں نے اُس کی یہ بات تسلیم کر لی کہ بکواس کرنے والے پھر سبھی کریں گے۔ مجھے پتہ چلا کہ ارشد نے اپنی بیوی کو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ اُس سے طلاق لے لے۔ یہ بات مجھے اُس کی بیوی نے بتائی تھی۔ میں نے ارشد کو خوب نناٹا....

”دن گزرتے گئے اور ارشد بہت تیزی سے جذباتی ہوتا گیا۔ اسے تین چار روز نہ ملتی تو اس کا لوگر (کوچوان) کسی کام کے بہانے میرے گھر آتا اور اشارہ کر جاتا کہ ارشد بلارہا ہے۔ میں نے اپنے والدین کو یہ دھوکہ دینا شروع کر دیا کہ جھوٹ بول کر گھر سے نکلتی اور ارشد کے گھر پہنچ جاتی۔ اس کی وہ زندہ دلی

ختم ہو چکی تھی جو مجھے اچھی لگا کرتی تھی۔ مجھے کہتا تھا کہ میرے
 سامنے بیٹھی رہو۔ میں اُس کی بیوی کی موجودگی میں اس کے پاس الگ
 بیٹھنا پسند نہیں کرتی تھی مگر ارشد نے اپنی بیوی کو بالکل ہی
 نظر انداز کر دیا تھا۔ میں اُس کے کمرے سے اُٹھ کر اُس کی بیوی
 کے پاس جانے لگتی تو وہ مجھے پکڑ کر اپنے سامنے بٹھاتا....
 ”ایک روز پتہ چلا کہ اُس نے اپنی بیوی کو گھر بھیج دیا ہے۔ اُس
 کی بیوی نے ہم دونوں کو بہت ہی بدنام کر دیا تھا۔ وہ ہر جگہ کہتی
 پھرتی تھی کہ میں نے اُس سے اُس کا خاوند چسین لیا ہے۔ میں نے
 جب سنا کہ اُس نے اپنی بیوی کو گھر بھیج دیا ہے اور یہ بھی کہ اب وہ

میں نے اپنا آپ اُس کے حوالے کر دیا

”مرد صبح و شام جھک مارتا ہے اُس پر کسی کی انگلی نہیں اٹھتی۔
 عورت کو مرث شک پر فاحشہ اور بدکار کہہ دیا جاتا ہے۔ میں عورت
 تھی۔ ارشد کو جانتی تھی۔ وہ جو کہتا تھا وہ کر گزرتا تھا۔ وہ بلیک
 پینلنگ پر اُتر آیا تھا۔ کچھ ڈر تھا اور کچھ غصہ کہ میں اُس
 کے گھر چلی گئی۔ اُس نے مجھے کوئی طعنہ نہ دیا، نہ ایسی خوشی کا
 اظہار کیا کہ اُس نے مجھے بدنام کرنے کی دھمکی دے کر بلا لیا ہے۔
 اُس روز وہ بہت جذباتی تھا۔ ناراض حرکتیں بھی کرنے لگا۔ میں یہ
 تسلیم کرتی ہوں کہ اُس نے مجھ پر ایسا اثر ڈال دیا تھا کہ میں اُس
 سے آزاد سونے کی بہت نہیں کر سکتی تھی....
 ”میں نے اُسے ایسی حرکتوں سے روکا تو اُس نے دست درازی
 ترک کر دی۔ اس کی بجائے نہایت تحمل سے اس نے مجھے یہ دھمکی

”میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب اسے نہیں ملوں گی۔ یہ قطع تعلق کا
 فیصلہ تھا جس پر میں دو دن سے زیادہ عمل نہ کر سکی۔ اس کا کوچوان مجھے
 بلانے آیا تو میں نے یہ کہہ کر جانے سے انکار کر دیا کہ پہلے اپنی بیوی
 کو گھر لائے پھر آؤں گی۔ میں برادری میں بہت بدنام ہو چکی ہوں۔ اب

دی کہ میری عزت اور بدنامی اُس کے ہاتھ میں ہے۔ اُس کے ساتھ ہی وہ محبت کا اظہار بھی کرتا رہا۔ یہ سچیت ہے کہ در محبت کا مجھے فریب نہیں دے رہا تھا، مگر وہ بلیک میلنگ کا ذریعہ استعمال کرنے کی ٹھان چکا تھا میں اُس کے سامنے کمزور پڑتی گو آخر میں نے اُس کی منتیں شروع کر دیں کہ وہ مجھے آزاد کر دے اور بدنامی سے بچائے۔ ہمارے درمیان بہت باتیں ہوئیں۔ آخر اُس نے مجھ سے ایسی قیمت مانگی جس کے تصور سے ہی میں کانپ گئی لیکن میں آپ کو سمجھا نہیں سکتی کہ اُس نے مجھے ایسی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا کہ میں نے اپنا آپ اُس کے حوالے کر دیا....

”پھر میری جو حالت ہوئی میں وہ بھی بیان نہیں کر سکتی۔ میں نے ایک فیصلہ تو یہ کیا کہ ابھی اپنے خاوند کے پاس چلی جاؤں اور اسے بتاؤں کہ وہ تو ذیلی سوا ہی تھا اُس نے مجھے بھی ذیل کر دیا ہے لیکن اس کی ذمہ داری مجھ پر بھی عائد ہوتی تھی۔ پھر میں نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ چلو قیمت تو بڑی شرمناک ادا کی ہے لیکن اس عجیب و غریب دوستی سے ہمیشہ کے لیے نجات ملی، مگر یہ میری خوش فہمی تھی۔ ارشد سے رخصت ہونے لگی تو وہ میرے آگے کھڑا ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ آپ یقین کریں کہ وہ ارشد جو کسی انسان کے آگے کیا سر جھکائے گا خدا کے آگے بھی سر نہیں جھکاتا، میرے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ

لیا اور میرے پاؤں پکڑ کر سر میرے پاؤں پر رکھ دیا۔ میں اُسے اٹاتی تو وہ سر اٹھاتا ہی نہیں تھا۔ میں پیچھے ہٹی تو اُس نے میرے ٹخنے مضبوطی سے پکڑ لیے۔ وہ بچوں کی طرح ہلک ہلک کر رہا تھا۔ میں اُس کے سامنے بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد اُس نے سر اٹھایا اور مجھ سے معافی مانگنے لگا۔ میں بھی جذباتی ہو گئی۔ میرے آنسو نکل آئے۔ میں نے اُسے کہا کہ تم نے مجھے بہن کہہ کر ناپاک کیا ہے۔ میں نہیں بخش دوں گی، خدا تمہیں نہیں بخشنے گا....

”اُس نے مجھے بٹھالیا اور عجیب سے لمبے میں مجھ سے پوچھا۔ ”تجربہ میں طلاق دے دے تو میرے ساتھ شادی کر لوگی؟“ میں نے اس سے رخصت ہونے کے لیے کہہ دیا کہ میں طلاق لوں گی ہی نہیں، اگر طلاق ہو بھی گئی تو تم اپنی بیوی کا کیا کرو گے؟ اُس نے کہا۔ ”میں اُس سے جان چھڑا لوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”پھر مجھے اپنا سمجھو۔ میں بڑی ہی روح کش پریشانی میں وہاں سے نکلی....“

”تیسرے روز کا واقعہ ہے کہ صبح سویرے سویرے میرے خاوند کا اردلی سخت گھبراہٹ میں میرے گھر آیا اور یہ خبر سنانی کہ میجر صاحب قتل ہو گئے ہیں۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ ہنگامے میں پولیس کا پہرہ ہے اور لاش ہسپتال لے گئے ہیں۔ میں کس طرح ہسپتال پہنچی؟ مجھے یاد نہیں رہا۔ میرے ہوش کم ہو گئے تھے۔ میرے بچوں کا باپ جسے میں نے دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا، مارا گیا تھا۔ لاش کا

”میں اپنے گھر چلی گئی۔ پھر سنا کہ ارشد اور بیوی کا سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ میرے آبا جان بھی اس میں شامل تھے اور پھر معلوم ہوا کہ ارشد اپنی بیوی کو گھر لے آیا ہے۔ اس کے بعد یہ خبر سنی کہ اُس کی بیوی اچانک بیمار ہو گئی ہے۔ پھر یہ کہ اُسے ہسپتال لے گئے ہیں۔ برادری کی عورتیں اُسے دیکھنے گئی تھیں۔ میری مائی بھی گئی تھیں۔ انہوں نے جو حالت آج بتائی ہے اس سے مجھے شک ہو گیا ہے کہ اسے ارشد نے کچھ کھلا دیا ہے۔ پرسوں یہ اطلاع ملی کہ ارشد اور اس کا لڑکھڑا (کوچوان) حوالات میں بند ہیں اور اُن پر الزام میرے خاوند کے قتل کا ہے تو میں نے اپنی اتی سے کہا: ”یہ جھوٹ نہیں۔ میرے خاوند کا قاتل ارشد ہے۔“ اتی نے مجھے سختی سے ڈانٹا کہ برادری کا معاملہ ہے، میں چپ رہوں۔ میں چپ ہو گئی لیکن دل جلنے لگا۔ میں پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ دل میں گئی بار آئی کہ کسی کو بتائے بغیر پولیس سٹیشن چلی جاؤں اور کہوں کہ قاتل یہی ہے۔ آبا جان نے جب مجھے بتایا کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں تو میں فوراً تیار ہو گئی مگر آپ کے سامنے آئی تو میں گھبرا گئی۔ اللہ آپ کو اس نیکی کا اجر دے گا کہ آپ نے مجھے بہن کہا اور خاندان کی طرح بات کرنے کی بجائے بھائیوں کی طرح بات کی۔“

پوسٹ مارٹم ہو رہا تھا۔ میں اُس کمرے کی طرف ددڑتی تھی جہاں ظالم میرے سہاگ کو چھڑ بھاڑ رہے تھے۔ معلوم نہیں وہ کون جو مجھے پکڑ پکڑ کر پیچھے کو گھسیٹ رہے تھے....

”پھر میں نے اپنے میجر کی لاش دیکھی۔ لاش گھرائی۔ گھر چلی گئی اور میرے سہاگ کی بات ختم ہو گئی۔ میرا دل گواہی دیتا کہ قاتل ارشد ہے مگر میں نے ہونٹ سی لیے تھے۔ ڈرتی تھی کہ اُن کا نام بیان تو وہ کہہ دے گا کہ اپنے خاوند کو میں نے قتل کر لیا ہے معلوم نہیں کتنے دن گزرے، ارشد کا لڑکھڑا آیا۔ اس نے مجھے اٹھا لیا۔ میں فوراً ارشد کے گھر چلی گئی۔ اُسے جاتے ہی کہا: ”اُسے قتل کیا ہے۔“ وہ قسمیں کھانے لگا اور بولا: ”تم مجھ پر الزام عائد کر رہی ہو؟ اور میں قاتل کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ اگر اُسے پوچھنے کو نہ لے کر لایا تو اُسے پولیس سے چھین کر تمہارے گھر لے آؤں اور تمہارے دروازے پر اُس کی شبہ رگ پر چھری پھیر دوں گا میں تمہارے خاوند کے خون کا بدلہ ایک درجن آدمی قتل کر کے لوں گا....“

”مجھے اس پر اعتبار آ گیا۔ اُس نے میرا غصہ ٹھنڈا کر دیا اور پھر اُس نے نہایت اچھے طریقے سے مجھے میرا وعدہ یاد دلایا۔ میں نے اُسے کہا کہ اپنی بیوی کو گھر لے آئے۔ تم اُسے طلاق نہیں دے سکتے۔ اُسے گھر میں بسا لو....“

میرے ایمان کی قیمت میں ہزار روپے ہو گئی

میں نے اُس کا بیان بہت مختصر کر کے آپ کو سنایا ہے اس کے درمیان میں اس سے سوال پوچھنا رہا۔ بعد میں کوئی گھنٹہ جرح کی اور میں نے یہ رائے قائم کی کہ اس نے جو کچھ کہے وہ جھوٹ نہیں ہے۔ اُس نے یہ تو کئی بار کہا تھا۔ ارشد کی لاش دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں نے اُسے بتا دیا کہ وہ میجر کے قتل میں پکڑا ہوا ہے اور اُس نے اپنی بیوی کو بھی زہنیا ہے۔ وہ شاید کل تک ختم ہو جائے گی۔ پھر میں نے اسے کہہ اگر وہ ارشد کی لاش دیکھنا چاہتی ہے تو اُسے گواہ بن کر عدالت میں جانا پڑے گا۔

وہ جھجک گئی۔ کہنے لگی کہ میں یہ سارا بیان بھری کچہری پر نہیں دے سکوں گی۔ میں اُس کا مطلب سمجھ گیا اور اسے کہا کہ بیان وہ حصہ گواہی میں غیر ضروری ہے۔ مختصر یہ کہ میں نے اُسے گواہ کے لیے تیار کر لیا اور اُسے کہا کہ میں اُسے وہ بیان اچھی طرح یاد کرا دوں گا جو اُسے عدالت میں دینا ہوگا۔ اس کے باپ کو کہ میں بلا کر بتایا کہ میجر کا قاتل ارشد ہے اور آپ کی بیٹی کو شہادت کے لیے عدالت میں آنا پڑے گا۔

میں تنہا نے ہتھیار تورات کے سوا بارہ بیچ چکے تھے۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے رسول ہسپتال سے فون آیا۔ ڈاکٹر نے اطلاع دی کہ ارشد کی بیوی مر گئی ہے۔ اُس کے پیٹ سے نکلا ہوا کچھ مواد اور خون پہلے ہی مطلوبہ رپورٹ کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ لاش کسی کو نہ دے۔ میں فوراً ہسپتال گیا۔ لاش قبضے میں لے لی۔ پوسٹ مارٹم کا بندوبست کرایا۔ دیگر کاغذی کارروائی کی اور جب شام کو پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھی تو سارے شکوک رفع ہو گئے۔ مرنے والی کو زہر دیا گیا تھا۔

میں نے ارشد کو حوالات سے نکلوایا اور اُسے دفتر میں بٹھایا۔ اتفاق سے اُس نے واردات کے وقت والے شوز پہن رکھے تھے۔ میں نے اُسے اُس کے شوز کے کھرے کا مولڈ دکھایا اور اُس کے دائیں جوتے کی گھسی ہوئی ایڑی دکھائی۔ اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ میں نے اُسے کہا کہ اب اگر وہ لاؤڈ سپیکر سے اعلان کرتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے تو اُس کی کوئی نہیں سنے گا۔ اُس نے جواب دیا۔ ”مجھے اپنے گناہ کا علم ہی نہیں۔“ میں نے اسے کہا۔ ”اگر تم اقبال جرم کر کے آلہ قتل کی خود ہی نشاندہی کر دو تو میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں گا۔“

”میں نے کوئی جرم ہی نہیں کیا۔“ اُس نے نڈر ہو کر بے پرواہی سے کہا۔ ”اقبال کیسا کروں؟“

انصیل کے باہر ایک چھلے میں ملی تھیں۔ ارشد کو چابیاں دکھا کر چھا۔ ”یہ تمہاری چابیاں ہیں، کون کون سے تالے کی ہیں؟“ اس نے چابیوں کی ملکیت سے انکار کر دیا۔ میں نے چابیاں ٹرنکوں درانیچے کیسوں کے تالوں کو لگائیں۔ دد لگ گئیں۔ تیسری کسی بڑے اے کی تھی جو ارشد نے توڑ لیا ہوگا۔ اُس نے بتایا نہیں کہ وہ تالہ کہاں ہے۔

دو انسانوں کا قاتل خاموش تھا۔ کسی سوال کا جواب نہیں دیتا تھا۔ مجھے لمنزیرہ لگاہوں سے دیکھتا تھا۔ اُس پر ابھی تک جاگیر اور دولت کا نشہ سوار تھا۔ میں نے اس کا نشہ اُتارنے کی کوشش نہیں کی۔ خانہ تلاشی کی کاغذی کارروائی مکمل کر کے اُسے تھانے میں لے گیا۔ اُس کے باپ نے مجھے الگ لے جا کر پچیس ہزار نقد کی پیش کش کی۔ تھانے پہنچتے پہنچتے میرے ایمان کی بولی تیس ہزار روپے ہو گئی۔ چاقو کا پارسل بنا کر ایگزامینر کو بھجوا دیا۔ میں نے ارشد کا مزید ریمانڈ نہیں لیا۔ اُسے جیل کی حالات میں بھجوا دیا۔ چھ ماہ بعد جیل سے اُس کی لاش نکلی جو مقتول کی بیوی نے مزدور دیکھی ہوگی۔ اُس نے گواہی بڑی ہی خود اعتمادی سے دی تھی۔ صفائی کا وکیل درانی کا چوٹی کا بیرسٹر تھا مگر وہ ارشد کو دوسرے قتل کے جرم میں سزائے موت سے بچا نہ سکا۔

”تمہاری مرضی“ میں نے کہا۔ ”کہو تو تمہاری دونوں وارداتوں کی پوری کہانی سنا دوں۔ تمہارا کوچوان سلطان کی گواہ بن چکا ہے۔ شہادت مکمل ہے۔ مجھے تمہارے آئینہ بی بیان کی ضرورت ہی نہیں“ ”سنو ملک!“ اُس نے کہا۔ ”تم ادھر نیچے کا زور لگا لو میں جرم قبول نہیں کروں گا۔ سیدھی بات کرو، کیا لیتے ہو۔ تم نے اتنی رقم خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوگی جو تمہیں میں دوں؟ کیس پر سٹی ڈالو۔ منہ سے بدلو کتنا لو گے۔ کہو تو آدھا مریخ زرخیز سیاحی تمہارے نام رتبڑی کرادوں گا۔ نقد الگ دوں گا۔“ ”اگر تم پھانسی سے پنج گئے تو بات کروں گا۔“ میں نے کہا۔ ”پھر لگا لو زور“ اُس نے کہا۔ میں نے رائے قائم کی کہ یہ شخص اُس سے زیادہ دلیر ہے جتنا میں نے سنا تھا۔

میں نے تاکہ سنگوایا۔ دد کا نیٹیلوں اور سیٹیل کا نیٹیل کر ساتھ لیا۔ ارشد کو تانگے میں بٹھایا اور اُس کے گھر گئے۔ رگھیر سنگھ نے پہرے کا بڑا اچھا انتظام کر رکھا تھا۔ میں نے دد مشیر بلائے اور ارشد کے گھر کی تلاشی لی۔ کوچوان نے مجھے بتا دیا کہ وہ چاقو کہاں رکھا تھا۔ کوچوان نے چاقو دھو تو دیا تھا لیکن میں نے اسے دھوپ میں لے جا کر دیکھا تو مجھے شک ہوا جیسے اُس اندر دنی جگہ جہاں بیڈ دستے کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے خشک خون موجود ہے۔ میں نے جیب سے وہ تین چابیاں نکالیں جو مقتول کے بنگلے

منگنی کی انگوٹھی

میں نے سٹیشن ماسٹر اور دو
گواہوں کی موجودگی میں ٹرنک کا
تالا توڑا۔ ڈھکنا اٹھایا تو تماشائی
یوں پیچھے کو بھاگے جیسے اندر سے
جن نکل آیا ہو۔ ٹرنک میں ایک
جوان آدمی کی لاش پڑی تھی۔
ٹانگیں سپرٹ کے ساتھ لگی ہوئی
تھیں۔ لاش کے کپڑے خون سے
لال تھے۔ مقتول کی عمر بائیس
تئیس سال تھی۔

ہندوؤں پر اس قبیلے کا خوف طاری رہتا تھا۔ ان کے ہتھیاروں میں تلوار اور برہمی کا استعمال زیادہ ہوتا تھا۔

اس قبیلے کے گھرانوں نے بڑی دلیری سے وہاں سے ہجرت کی اور جس قبیلے کے ساتھ وہ آئے اس کا سچے سچے محفوظ پاکستان میں داخل ہوا پاکستان میں نوآباد کاری نے ان لوگوں کا دم خم توڑ دیا۔ قبیلہ بکھر گیا۔ زیادہ تر نے اپنا پرانا پیشہ، کاشت کاری اختیار کیا۔ بعض فوج میں بھرتی ہو گئے اور بعض شہروں میں آباد ہو کر تعلیم یافتہ ہو گئے۔ اس قبیلے میں اب ہندوستان والی خونخواری نہیں رہی۔ یہاں کے مسائل اور تہذیب نے ان لوگوں کو بدل ڈالا ہے۔

میں جس قبیلے کے خٹانے میں اسیں۔ ایچ۔ او تھا۔ اس کے ریلوے سٹیشن پر سیچر ٹرین رکی۔ اُس زمانے میں ریل گاڑیوں میں ریش نہیں ہوتا تھا۔ ایک ڈبے سے تین ہندو ڈوم اترے (ڈوم ہندوؤں کی ایک کمین ذات ہے۔ مردے جلانے کا کام ڈوم ہی کرتے ہیں) ان تین ڈوموں کے پاس بہت سا سامان تھا۔ اس میں ایک کالا ٹرنک بھی تھا۔ ٹکٹ کھٹرنے سامان زیادہ دیکھ کر انہیں روک لیا۔ کالا ٹرنک بڑے سائز کا تھا اور جس نے اٹھا رکھا تھا اُس سے چلا نہیں جاتا تھا۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ ایک مختصر ڈکلاس ٹکٹ کے ساتھ مزٹ پیس سیر سامان لے جایا جاسکتا ہے۔ ٹکٹ کھٹرنے سامان رکھو کر دیکھا تو اُسے بدبو سی محسوس ہوئی۔ ٹرنک بہت پرانا تھا۔ نیچے کے ایک کونے پر ایسے نظر آیا جیسے خون جما ہوا ہو۔ تماشائی اکٹھے

ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک ہی قبیلہ ایک ہی تحصیل کے مختلف دیہات میں آباد تھا۔ میں اس قبیلے کا نام اور ذات نہیں لکھوں گا۔ ان کی نشاندہی نہیں کروں گا کیونکہ اس قبیلے کے سینکڑوں گھرانے ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے پاکستان میں آباد ہو چکے ہیں۔ یہ کہانی ان لوگوں کی توہین کا باعث بن سکتی ہے۔ ہندوستان میں یہ قبیلہ خونخواری اور غیرت مندی کی وجہ سے مشہور تھا۔ عورت کے معاملے میں یہ لوگ بڑے ہی حساس اور سخت تھے۔ انگریز کے قانون کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ ضرورت پڑے تو قانون اپنے ہاتھ میں لیتے تھے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ بکے مسلمان اور اپنے کردار کے لوگ تھے۔ ان کے ہاں پوری چھپے عشق و محبت کا کھیل کھیلا جاتا تھا اور بدی بھی موجود تھی۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان میں ہندوؤں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کیا تو یہ واحد قبیلہ تھا جس کے علاقوں میں ہندوستانی فوج اور پولیس کو بھی حملہ کرنے کی جرأت نہ رہی

ہو گئے۔ تین چار آدمیوں نے ٹرنک کو سونجھ کر کہا کہ اس کے اندر اگر لاش کی لاش نہیں تو کوئی مرنے والا جانور ضرور ہے۔

دوموں سے کہا گیا کہ تالا کھولو۔ انہوں نے جواب دیا کہ چابی اُن کے پاس نہیں ہے۔ ٹرنک پکڑا ہو گیا۔ تھانے میں اطلاع آئی۔ میں نے جا کر ٹرنک دیکھا اور دو منٹ بعد میں نے فیصلہ دے دیا کہ اس میں لاش ہے۔ تینوں دوموں نے پہلے نو مبرے آگے ہاتھ جوڑے پھر میرے پاؤں پکڑے اور آخر میں سر میرے پاؤں میں رکھ دیئے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ یہ ٹرنک اُن کا نہیں۔ میں نے سٹیشن ماسٹر اور دو گواہوں کی موجودگی میں ٹرنک کا تالا توڑا۔ دھکنا اٹھایا تو تماشا نئی دلوں پیچھے کو بھاگے جیسے اندر سے جن تل آ یا ہو۔ ٹرنک میں ایک جوان آدمی کی لاش پڑی تھی۔ ٹانگیں پریٹ کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ لاش کے کپڑے خون سے لال تھے۔ مقتول کی عمر بائیس تیس سال تھی۔ وہ دیہاتی تھا۔ دوموں نے ساکھ میل دُور کے ایک قصبے کا نام لے کر بتایا کہ وہ اس سے دو سٹیشن پیچھے سے اس گاڑی میں آ کر بے تھے۔ رات گاڑی اس قصبے کے سٹیشن پر رُکی تو ایک آدمی کھیس پیٹے ہوئے پلیٹ فارم کی دوسری طرف سے ان کے ڈبے میں آیا۔ اُس نے پہلے ٹرنک دروازے میں رکھا۔ اسے دھکیل کر سیٹ کے نیچے کیا۔ وہ گاڑی سے اُتر گیا گاڑی چل پڑی لیکن وہ نہیں آیا۔ دوموں کو اس سٹیشن پر اتنا تھا۔ انہوں نے چوری کے ارادے سے ٹرنک گاڑی سے اتار لیا۔ اُن کا خیال تھا کہ ٹرنک کا مالک گاڑی سے رہ گیا ہے، ورنہ یہ پیچ کر گاڑی جو کم از کم پچیس سٹیشنوں پر رُکی تھی، وہ کسی اور

ڈبے میں ہوتا تو ٹرنک والے ڈبے میں آ جاتا۔ میں اُن کے بیان کو بغیر کسی ثبوت کے صحیح تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ انہیں ٹرنک سے بدلہ نہیں آئی تھی؟ ان میں سے ایک نے جواب دیا۔ ”حضور ہم لاشیں لانے کے عادی ہیں۔ ایک لاش اور وہ بھی جلتی ہوئی، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اتنی بدلہ ہوتی ہوگی۔ یہ تازہ لاش ہے۔ اس کی ہمیں کیا بدلہ آئے گی۔“

اس جواب سے مطمئن تو ہو گیا لیکن انہیں چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ انہیں لاش غائب کرنے کی اجرت ملی ہو۔ انہیں حراست میں لے لیا۔ ریل گاڑی دو تین منٹ رک کر باہر نکلی تھی۔ میں نے سٹیشن ماسٹر کے کمرے میں لاش ٹرنک سے باہر نکالی۔ زخم دیکھے۔ چار گہرے زخم تھے۔ ایک پیٹھ پر کمر میں۔ دوسرے کے بالائی حصے میں اور ایک بالکل دل کے مقام پر۔ میرے خیال میں یہ زخم بھیدوں کے تھے۔ لاش نے کُتر پہن رکھا تھا جس کے پہلو میں جیب تھی۔ میں نے جیب کی تلاشی لی۔ اس میں سے روپے کے دو سکے اور چند آنے برآمد ہوئے اور خدا نے میری یہ مدد کی کہ جیب میں سے ایک پوسٹ کارڈ بھی برآمد ہوا۔ یہ دوسرا لکھا ہوا تھا۔ ایڈریس باہر کی طرف تھا مگر ایڈریس پر خون چھڑ گیا تھا۔ ایک بھی لفظ نہیں پڑھا جاتا تھا۔ پوسٹ کارڈ کو سیدھا کیا تو دوسری طرف اندر کو ہونے کی وجہ سے صاف تھی۔ خون وہاں تک گیا تھا لیکن کام کی تحریر صاف تھی۔ اوپر لکھا تھا۔ ”از میرٹھ چھاؤنی“۔ آگے خیر خیریت اور عام سی باتیں لکھی تھیں۔ اور نیچے خط لکھنے والے کا نام اور پورا پتہ تھا۔ ”سوالدار صاف علی۔ بی۔ کینی۔ لاہور قادیانہ ریلوے۔ میرٹھ چھاؤنی۔“

ہے وہیں کاغذات تیار کیے۔ سٹیشن ماسٹر، ٹکٹ کلکٹر اور ایک آدمی نے دستخط کیے، ڈوموں کو ساٹھ لیا اور تھانے کیا۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی اور خود میرٹھ جانے کی تیاری کرنے لگا۔

ریل گاڑی کے سات آٹھ گھنٹے کے سفر نے مجھے میرٹھ پہنچا دیا۔ چاندنی لیا اور راجپوتانہ رائلز کی بارکیں ڈھونڈ لیں۔ رات ہو چکی تھی۔ میں نے رقت صنایع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اُسی وقت آفیسرز میں گیا۔ تمام انسپرنگز کو بلوا کرتے تھے۔ ان میں خوبی یہ تھی کہ پاکستانی افسروں کی طرح ملتے نہیں تھے۔ میں باکر کمانڈنگ آفیسر کے متعلق پوچھا تو مجھے اُس کے جنگلے پر پہنچا دیا گیا۔ برآمدے میں صاحب بہادر کے کتے نے میرا پرہوش استقبال کیا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ صاحب خود ہی باہر گیا۔ میں نے سیارٹ کیا اور اُس نے کی وجہ بیان کی۔ وہ مجھے اندر لے گیا۔ میں نے اُسے نون آلود پوسٹ کارڈ دکھا کر واردات سنائی اور بتایا کہ حوالدار صادق علی سے ملنا چاہتا ہوں۔ اُس سے یہ معلوم کرنا ہے کہ اُس نے یہ خط کسے لکھا تھا اور یہ ایڈریس کیا ہے جو خون سے بچھ گیا ہے اور پھر اُسے ساٹھ لے جا کر لاش کی شناخت کرنی ہے۔

اس انگریز بیفینڈ کرٹل کو جب یہ پتہ چلا کہ میں بہت دُور سے آیا ہوں تو اُس نے میرے انکار کے باوجود فنانسائے کو میرے لیے دیسی کھانا لانے کو کہا اور اردلی کو اُسی وقت بلا کر کہا کہ بی کپنی کے حوالدار صادق علی کو بلا لائے۔ کھانا آنے تک کرٹل میرے ساتھ قتل کی وارداتوں کے متعلق بڑی

پہلا سوال میرے دماغ میں یہ آیا کہ کیا یہ میرا کیس ہے یا اس تھا۔ کا جہاں سے ڈوموں کے بیان کے مطابق، ٹرنک گاڑی میں رکھا گیا تھا اس تھانے کا جہاں سے ڈوم ریل گاڑی میں سوار ہوئے تھے، وہیں سے ڈوموں کے ٹکٹ اپنے تئیں میں سے لیے تھے۔ بالائی حکام سے ہدایت لینے کی بجائے میں نے پولیس آفیسر کی حیثیت سے سوچا کہ وقت ضائع ہوگا، مجھے ابتدائی کارروائی کر لینی چاہیے۔ کیس کسی بھی تھانے کا ہو یا پولیس کا کیس ہے اور قتل کا کیس ہے۔ قتل کی تفتیش میں ایک منٹ ضائع نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے مال ہی میں لاہور کے متعلق اس قسم کی خبریں پڑھی ہیں کہ ایک آدمی قتل ہو گیا تو دو تھانوں کے تھانیدار اس مسئلے میں الجھ گئے کہ یہ کیس کون سے تھانے کا ہے۔ اسی میں کمی گھنٹے ضائع ہو گئے اور ملزم شہر سے نکل گئے یا ردپوش ہو گئے۔

میں نے بڑی دُور کے تھانے کے کیس کی ابتدائی کارروائی شروع کر دی۔ یہ شک تین ملزم میری حراست میں تھے لیکن انہوں نے مجھے شک میں ڈال دیا تھا۔ وہ بہت ہی غریب اور مرے مارے ہوئے لوگ تھے۔ انہوں نے ٹرنک کو لاوارث سمجھ کر اس لالچ سے اٹھایا تھا کہ اندر سے سامان برآمد ہوگا۔ ریل گاڑی سے اتری ہوئی ٹرنک میں بند لاش تھانیداروں کے لیے اکثر لالچ معمہ ہوتا ہے۔ یہ تو بعد کی بات ہوتی ہے کہ قاتل کون ہے۔ پہلا سوال تو یہ ہوتا ہے کہ مقتول کون ہے اور کہاں قتل ہوا ہے۔ ریل گاڑی کے ڈبے اور انجن تو گواہی دے نہیں سکتے....

یہ گزرتی تھی۔ اس میں گھنٹہ بھر وقت تھا۔ میں نے لاش اٹھوائی
 ریلوے سٹیشن گئے۔ میرے ساتھ تینوں ڈوم تھا۔ لاشوں میں اور حوالہ
 ادق ملی بطور گواہ تھا۔ گاڑی آئی۔ لاش سامان کے ڈبے میں رکھوائی اور
 گاڑی میں بیٹھ گئے۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ میں نے ابتدائی کارروائی
 کر دی ہے۔ کیس چونکہ دوسرے قصبے کا ہے اس لیے اب ترائی
 روڈائی کے کاغذات، لاش، تین مشتبه افراد اور ایک گواہ متعلقہ
 جانے کے حوالے کر کے فارغ ہو جاؤں گا۔ یہ کیس میرا نہیں تھا، پھر بھی
 میں نے حوالہ صادق علی سے گاڑی میں باقاعدہ پوچھ گچھ شروع کر دی
 اور تھانے دار کی مجھ مدد ہو جائے۔

پوسٹ، مارٹم رپورٹ یہ تھی کہ لاش کا جس وقت پوسٹ مارٹم شروع
 ہوا موت اس سے اندازاً بارہ گھنٹے پہلے واقع ہوئی تھی۔ مقتول کی عمر
 اسی تیس سال تھی۔ چاروں زخم تین دھاری برچی کے تھے۔ آپ نے
 برچی دیکھی ہوگی۔ اکثر کے پھل دو دھارے یعنی دونوں طرف سے تیرتے
 ہیں۔ بعض پھل تین دھارے اور چار دھارے بھی ہوتے ہیں۔ مقتول کو
 تین دھارے پھل والی برچی سے مارا گیا تھا۔ پیٹھ کا زخم گہرا تھا۔ ریڑھ
 کی ہڈی بھی کٹ گئی تھی۔ پیٹ کے دو زخم معدے کے تھے اور سچو تھا
 زخم جو ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق فوری موت کا باعث بنا دل کا تھا۔
 برچی نے دل کو صحت چیر دیا تھا۔ ان کے علاوہ جسم پر ہلکی سی خراش
 بھی نہیں تھی۔

دل چسپ باتیں کرتا رہا.... کھانے کے دوران حوالہ صادق علی آگیا۔
 نے اس کے کمانڈنگ آفیسر کے سامنے اسے پوسٹ کارڈ دکھایا تو میں نے
 کہ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس نے بتایا کہ اس نے فلاں منغل اور
 کے فلاں گاؤں کے حسین نام سے ایک دوست کو یہ کارڈ ایک ہفتہ پہلے
 تھا۔ اس نے مقتول کی عمر صحیح بتائی۔ مونچھوں کی بناوٹ اور پہرے کے
 نقش و نگار بتائے وہ لاش سے ملنے ملتے تھے۔ میں نے کرنل سے کہا کہ
 تفتیش کے لیے حوالہ کو ساتھ لے جانا ہے۔ اس نے کہا کہ میں صبح دفتر
 جاؤں اور کاغذی کارروائی کے بعد اسے اپنے ساتھ لے جاؤں۔

لاش کس کی تھی؟

میں نے رات جھاڈنی کے تھانہ دار کے گھر گزاری۔ صبح لاہور تھانہ
 راجندر کے دفتر گیا۔ حوالہ صادق علی کو سرکاری پاس پر میرے ساتھ
 کر دیا گیا.... ہم آٹھ گھنٹہ مقتول کے سفر کے لیے اپنے قصبے میں پہنچے تو
 ہو چکی تھی۔ لاش تھانے میں آچکی تھی۔ حوالہ صادق علی نے دیکھتے ہی
 پہچان لی۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرا جگر دوست حسین
 ہے۔“ اس نے اس کے گاؤں کا نام لیا اور بتایا کہ یہاں ستہ تقریباً
 میل دور ہے۔ ایک قصبے کے ریلوے سٹیشن پر اتارنا پڑتا ہے اور
 میل پہیل یا ایک تیر گاؤں جانا پڑتا ہے۔ میں نے وقت دیکھا۔ رات کو ایک

صادق علی نے بتایا کہ گاؤں میں بچانوں سے فیصد گھران کی اپنی
نہ برادری کے ہیں۔ دشمنی عداوت بھی چلتی رہتی ہے۔ قتل کی
باتیں بھی ہو جاتی ہیں لیکن مقتول کے ساتھ کسی کی ایسی دشمنی نہیں
کہ اُسے قتل کر دیا جانا۔ یہ کوئی اور معاملہ تھا۔ میں نے ایک قدرتی
سوال پوچھا۔ ”کیا لڑکی کی شادی ہو گئی ہے؟“ صادق علی نے
کہ شادی نہیں ہوئی ہنگامی ہو گئی ہے۔ یہاں سے میرے دل میں قتل
یہ وجہ آئی کہ مقتول شادی کے بعد بھی فاطمی سے ملتا ہوگا اور فاطمی
باپ یا بھائیوں یا منگیتر نے اُسے قتل کر دیا ہوگا۔ مزوری نہیں کہ
قول نے صادق علی کو صبح نہ بتایا ہو کہ وہ فاطمی سے ملتا رہتا ہے۔
میں نے فاطمی کے باپ اور بھائیوں کے متعلق پوچھا کہ وہ کیسے ہیں؟
صادق علی نے بتایا کہ فاطمی کا باپ سونبلا ہے۔ فاطمی کا صرف ایک
مائی ہے جس کی عمر تیرہ چودہ سال ہے۔ فاطمی کی عمر بیس سال کے
بیب ہے۔ وہ بارہ تیرہ سال کی تھی جب اس کا باپ مر گیا۔ ڈیڑھ دو
مال بعد گاؤں کے ایک آدمی نے جس کی بیوی مر چکی تھی اور بے اولاد
تھا، فاطمی کی ماں کے ساتھ شادی کر لی۔ فاطمی کا باپ بڑا ہی ظالم آدمی
تھا۔ فاطمی کو مارتا بیٹھا رہتا تھا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ وہ گھر میں بیٹی کے
چود کو پسند نہیں کرتا تھا۔

یہ ظالم باپ مر گیا تو ڈیڑھ دو سال بعد سونبلا باپ مل گیا۔ اس
کے متعلق صادق علی نے بتایا کہ عیاش اور شرابی ہے۔ زبندارہ اچھا

تھوڑا لودا پوسٹ کارڈ میں صادق علی نے مقتول کو ایک فقرہ
تھا۔ ”تم اپنی جگہ قائم رہو اور اپنا گھر آباد کرو۔“ اگر میں اتنی
مدت بعد محمول نہیں گیا تو الفاظ کچھ ایسے ہی تھے۔ میں نے صادق
سے کہا کہ وہ مجھے اس فقرے کا مطلب بتائے اور مقتول کے متعلق
کچھ جانتا ہے بتا دے۔ اُس نے اس فقرے کا مطلب یہ بتایا کہ مقتول
ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ لڑکی بھی اسے چاہتی تھی۔ ان کی شادی
ہوسکی۔ مقتول کی شادی اپنے چچا کی بیٹی کے ساتھ ہو گئی۔ مقتول اور
صادق علی میں گہری دوستی تھی۔ مقتول نے صادق علی کو بتایا تھا کہ وہ لڑ
جس کے ساتھ مقتول کی محبت تھی، بڑی سخت اور زہریلی طبیعت کی
لڑکی تھی۔ خوبصورت بھی تھی۔ اُس کا نام فاطمہ لی بی تھا۔ لوگ اُسے
فاطمی کہتے تھے۔ وہ شادی کے بعد بھی مقتول سے ملنا چاہتی تھی اور
اُسے بلاتی رہتی تھی مگر مقتول اپنا گھر برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شادی
کو ابھی دو ہی مہینے گزرے تھے۔ سوا لہر صادق علی ڈیڑھ مہینے کی چچا
پر گاؤں گیا تھا۔ کوئی پندرہ دن گزرے مقتول نے صادق علی کو خط لکھا
تھا جس میں اُس نے لکھا تھا کہ فاطمی اُسے پریشان کرتی ہے۔ مقتول نے
شادی کے بعد ایک بار ملا تھا اور اُسے کہا تھا کہ وہ اب اس کے ساتھ
تعلق رکھنا نہیں چاہتا۔ اس پر لڑکی نے اُسے دھمکی دی ہے کہ اس کا
بتیمہ اچھا نہیں ہوگا۔ اس کے جواب میں صادق علی نے مقتول کو لکھا
تھا کہ تم اپنی جگہ قائم رہو اور اپنا گھر آباد کرو۔

ہے۔ شہر دور نہیں۔ وہاں جا کر ہندوؤں کے ساتھ شراب پیا کرتا تھا۔
 فاطمی بڑی خوبصورت تھی۔ سوتیلے باپ نے اسے بڑے قیمتی کپڑے
 اور زیورات سے سجانا شروع کر دیا۔ لڑکی کھل گئی اور مردوں کے
 آنے لگی۔ صادق علی نے بتایا کہ لوگوں کو شک ہے کہ اس سوتیلے باپ
 نے فاطمی کی ماں کی بجائے فاطمی کو دلہن بنا رکھا ہے اور اسی لڑکی کی
 اُس کی ماں کے ساتھ شادی کی ہے۔ لڑکی کے دلیرانہ لچھن بتاتے ہیں
 کہ اسے سوتیلے باپ کی طرف سے شہ بھی مل رہی ہے۔ پیار بھی مل
 رہا ہے اور منہ مانگے پیسے بھی مل رہے ہیں۔ یہ بھی پتہ چلا کہ سوتیلے باپ
 فاطمی کی ماں کے ساتھ بہت برا سلوک کرتا ہے اور اُسے ڈرا دھمکا
 اُس کی زبان بند رکھتا ہے۔ برادری اس لیے خاموش ہے کہ ایک
 یہ ان کے گھر کا معاملہ ہے۔ دوسرے اس لیے کہ سوتیلے باپ کا بار بار
 کے ساتھ اور شہر کے غنڈوں پر معاشوں کے ساتھ بھی ہے۔ اس
 کے پاس پیسہ اتنا ہے کہ گاؤں میں کسی کو کتنی ہی رقم درکار ہو، یہ شخص
 کسی کو ہندو سا ہو کر سے قرض نہیں لینے دیتا۔ خود رقم دیتا ہے۔ کو
 سود نہیں لینا اور نہ واپسی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس سے گاؤں کے
 لوگ اس کے احسان مند ہیں اور اس کے ذاتی کاموں میں دخل نہیں
 دیتے۔

مقتول بڑا دلیر جوان تھا۔ ساری برادری کی طرح لٹھ باز اور برچ
 باز بھی تھا۔ کوئی ایک سال گزرا فاطمی اسے چاہتے لگی اور ان کی ملاقاتیں

ہونے لگیں۔ صادق علی کی اطلاع کے مطابق ان کی محبت پاک نہیں تھی۔
 میری اپنی رائے بھی یہی تھی کہ ایسی لڑکی پاک ہو ہی نہیں سکتی جسے سکے
 باپ نے ظلم کا نشانہ بنائے رکھا اور سوتیلے باپ نے اسے شہزادی بنا کر
 اپنی دلہن بنا لیا۔ ان حالات میں پلی ہوئی لڑکی یا لڑکے میں حیوانی جذبہ
 زیادہ ہوتا ہے۔ میں نے نفسیات کا مطالعہ تو اتنا گہرا نہیں کیا مگر یہ پختیس
 سال انسانوں کا جو مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اس لڑکی کی نفسیات
 سمجھ گیا۔۔۔ صادق علی نے بتایا کہ مقتول فاطمی کے ساتھ شادی کرتا
 پانتا تھا جو درد و جواہات سے نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک یہ کہ لڑکی بڑا بوجھ
 تھی اور دوسری یہ کہ مقتول کے ایک چچا کی جوان بیٹی تھی۔ دوسرے گھر
 میں شادی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

مقتول کی منگنی چچا کی بیٹی کے ساتھ ہو گئی۔ حوالدار صادق علی چھٹی
 لے کر گاؤں آیا تو مقتول نے اُسے بتایا کہ فاطمی نے اُسے کہا تھا کہ گھر سے
 بھاگ چلیں لیکن وہ ایک بدکار لڑکی کے لیے اپنے ماں باپ کی رسوائی
 نہیں کرنا پانتا تھا۔ فاطمی نے اُسے دھمکی دی کہ اگر اُس نے چچا کی بیٹی
 کے ساتھ شادی کی تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا۔ شادی سے پہلے محبت
 کے ناروا کھیل کے دوران، مقتول نے صادق کو یہ بھی بتایا کہ مقتول کا ہم عمر
 ایک جوان جس کا نام عبدالعلی ہے اور لوگ اسے عید کہتے ہیں، فاطمی کے
 بیچے پڑ گیا اور اسے پھاٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ فاطمی نے اُسے ٹھکرا دیا۔
 عید بڑا دلیر اور زہری جوان ہے۔ اُس نے گوششیں جاری رکھیں اور

فاطمی سے یہ بھی کہا کہ وہ اس کا رشتہ لے لے گا۔ مقتول کے کہنے کے مطابق جو مجھے صادق علی کی زبانی پہنچا، فاطمی نے عبدوسے کہا کہ میرا رشتہ لوگ تو میں نکاح کے لیے بھری محفل میں آسکار کر دوں گی اور اگر انکار نہ کر سکی تو تمہیں مجبور کر دوں گی کہ مجھے طلاق دے دو۔ طلاق نہیں دو گے تو سارا عمر بچھتاؤ گے۔

مقتول نے صادق علی کو یہ بھی بتایا تھا کہ ایک بار مقتول نے عبدوسے طعنے دیا تھا کہ فاطمی اُسے جوئی کی ٹوک پر بھی نہیں لکھتی اور ایک بار مقتول نے اُسے چیلنج بھی کیا تھا۔ مرد اور وہ بھی ایسے خوشخوار قبیلے کا مرد، ایسے طعنے اور چیلنج برداشت نہیں کر سکتا۔ دیہات کے پسماندہ لوگ جو پسماندہ کو غیرت مندی کہا کرتے ہیں، بڑی ہی خطرناک جوانی کا ردوائی کیا کرتے ہیں۔ مقتول نے یہ بتا کر مجھے چونکا دیا کہ مقتول کی شادی کے بعد فاطمی اور عبدوسے کی منگنی ہو گئی ہے۔ شادی کا دن ابھی مقرر نہیں ہوا۔ یہ سن کر میرے دماغ میں آئی کہ منگنی کے بعد عبدوسے نے فاطمی کی بے رنجی دیکھ کر مقتول کو راستے سے ہٹانے کے لیے قتل کر دیا ہو گا۔ لاش غائب کرنے کا یہ طریقہ آج بھی رائج ہے کہ لاش کو ٹرنک میں ڈالا اور ریل گاڑی میں رکھ آئے۔ میرے دُورِ مازمت میں بھی یہی ہوتا تھا کہ جہاں لاش پڑی تھی وہاں کے تختانیدار نے رسمی سہی کا ردوائی کی اور لاش لاوارث قرار دے کر دفن کرادی۔ آج بھی ایسی لاشوں کے ساتھ یہی سلوک ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ عبدوسے کوئی بھی قاتل تھا، بہت ہوشیار آدمی تھا۔

میں نے فاطمی کے متعلق پوچھا تو صادق علی نے بتایا کہ بہت دلیر لڑکی ہے۔ شہروں کے تعلیم یافتہ لوگ ایسی دلیری کو بے حیائی سمجھتے ہیں۔ بے بتایا گیا کہ مقتول گرمیوں میں چھت پر سویا کرتا تھا۔ گھر کے دوسرے زادِ محن میں سوتے تھے۔ دو دفعہ ایسا ہوا کہ فاطمی آدھی رات کے بت پچھو اڑے سے چڑھ کر مقتول کے پاس گئی۔ اس سے زیادہ اور دلیری کیا ہو سکتی ہے۔ عبدوسے کے متعلق صادق علی نے بتایا کہ وہ تو بے خوف جوان ہے اور بگڑا ہوا۔ ماں باپ کا اکیلا بیٹا ہے۔ پیار اتنا لاکھ شہزادہ بن گیا۔ زمین بہت ہے جو بٹائی پر دی ہوئی ہے۔ منہ زور رکھا ہے۔ گاؤں میں کوئی اُس کے منہ نہیں آتا۔ مرنے مارنے پر اتر آتا ہے۔

تینوں ڈوم ہتھکڑیوں میں بندھے مجھ سے تھوڑی دُور پر سے ڈبے میں بیٹھے تھے۔ تین کانسیل سا تھتھے۔ میں نے ڈوموں سے بھی پوچھ گچھ کی۔ ان کی حالت بہت ہی بُری تھی۔ ایک بار وہ ایک دوسرے کو گالی گولج کرنے لگے۔ وہ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ میں نے کہا نہیں تھا کہ ٹرنک کو ہاتھ نہ لگاؤ، پکڑے جلیں گے۔ وہ ایک دوسرے پر الزام لگا رہے تھے کہ ٹرنک اٹھانے کا مشورہ اس نے دیا تھا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، اُس زمانے میں گاڑیوں میں ریش نہیں ہوتا تھا۔ لوگ مسافر گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے ایسا ڈبہ دیکھتے تھے جس میں دو پار مسافر بیٹھے ہوئے ہوں۔ یہ تینوں جھوٹے ڈبے میں تھے۔ رات بھئی، ڈبے میں

ان کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ تینوں ایک ایک سیٹ پر سوتے ہوئے تھے۔ جب وہ پراسرار آدمی ٹرنک رکھنے آیا تو ان تینوں میں سے صرف ایک کی آنکھ کھلی۔ اُس نے کہیں میں پلٹے ہوئے ایک آدمی کو ٹرنک سیٹ کے نیچے رکھتے اور جاتے، دیکھا تھا۔

لاش میرے گلے پڑ گئی

گاڑی نے ہمیں منزل پر پہنچا دیا۔ لاش کے لیے تھانے سے چارپائی منگوائی۔ ٹرنک بھی ساتھ تھا۔ یہ پیزیں ساتھ لیے تھانے گئے۔ وہاں کنور دیوان سنگھ ایک ہندو راجپوت سب انسپکٹر تھانے کا انسپچارج تھا۔ لاش، ٹرنک، ڈوم، حوالدار صادق علی اور کاغذات اُس کے سپرد کرنے لگا تو اُس نے وصول کرنے سے انکار کر دیا۔ کہتے لگا پہلے یہ دیکھنا ہے کہ مقتول اُسی کے تھانے کا ہے اور یہ کیس اُس کا ہے بھی یا نہیں۔ حوالدار صادق علی کے بتائے ہوئے گاؤں سے مقتول کے باپ اور مکھیا (نمبردار) کو بلانے کے لیے کانسٹیبل بھیج دیا۔ فاصلہ تقریباً ڈیڑھ میل تھا۔ مطلوبہ افراد آئے تو مقتول کے باپ کے ساتھ اُس کے چچے آئے، بھائی اور کچھ اور لوگ بھی تھے۔ لاش کا منہ دیکھتے ہی کہرام مچ گیا۔ مقتول کے باپ اور مکھیا نے لاش کی شناخت کی۔ اس کے باوجود کنور دیوان سنگھ نے کیس لینے سے انکار کر دیا۔ یہ صریحاً دھاندلی تھی۔ اُس نے

ٹیلیفون اٹھایا اور ضلع پولیس ہیڈ کوارٹر سے بات کی۔ میں بھی اسی ہیڈ کوارٹر کے ماتحت تھا۔ ادھر ایک انگریز ڈی۔ ایس۔ پی، ایم۔ بی۔ وڈ بول رہا تھا۔ کنور دیوان سنگھ مجھ سے کیس نہ لینے کا بڑا ہی غیر قانونی جواز پیش کر رہا تھا۔ انگریز ڈی۔ ایس۔ پی نے میرے ساتھ بات کی۔ کم سخت نے میری ایک نہ سنی۔ مجھے حکم دیا کہ تفتیش تم نے شروع کی ہے، اسے تم ہی ختم کرو۔

حکم کے آگے میں بول نہ سکا۔ پولیس کے قاعدے قانون کی اس خلاف ورزی پر میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ میں نے یہ ارادہ بھی کیا کہ ایس۔ پی سے بات کروں لیکن اس ڈر سے جرأت نہ کر سکا کہ ایم۔ بی۔ وڈ ایک سمیٹ ڈی۔ ایس۔ پی تھا۔ میں ایس۔ پی سے اپنی بات ضرور منوالیتا مگر ڈی ایس پی اُن چند انگریزوں میں سے تھا جو رشوت اور بدکاری کو جانو سمجھتے تھے۔ کنور دیوان سنگھ کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ایم۔ بی۔ وڈ کو صرف روپے پیسے کی نہیں، لڑکیوں اور شراب کی بھی رشوت دیتا رہتا تھا۔ یہ انگریز ڈی ایس پی اس علاقے میں شکار پر آتا تو کنور دیوان سنگھ ریسٹ ہاؤس کو اندر سبھا بنا دیتا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ تین سال بعد جب جنگ عظیم شروع ہوئے ڈیڑھ دو سال گزر گئے تھے، ایک مجاکوڑے فوجی نے کنور دیوان سنگھ کو ایسے وحشیانہ طریقے سے قتل کر دیا تھا کہ اُس کا سراگ تھا، دونوں بازو اور دونوں ٹانگیں الگ تھیں۔ پیٹ اس طرح کھلا ہوا تھا کہ دل، جگر اور انتڑیاں وغیرہ الگ الگ باہر

دو مہل کو سوالات میں بند کر دیا۔ حوالدار صادق علی کو یہ کہہ کر گاؤں بھیج دیا کہ گاؤں سے غیر حاضر نہ ہو اور درپردہ قاتل کا سراغ لگانے کی کوشش کرے۔ وہ تو بہت جھڑکا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ”قاتل کا سراغ مل گیا تو وہ آپ تک زندہ نہیں پہنچے گا۔ حسنین (مقتول) میرا جگر ہی دوست تھا۔ میں نے اُس کے خون کا بدلہ نہ لیا تو وہ اگلے جہان مجھے شرمسار کرے گا۔“ وہی نہیں مقتول کی لاش لینے کے لیے جو لوگ آئے تھے وہ بھی ایسی ہی باتیں کر رہے تھے۔ بار بار یہی کہتے تھے کہ سامنے آئے تو دیکھیں گے۔ میں نے انہیں کفن و دفن کا وقت دے دیا اور دوسرے دن مقتول کے باپ، ماں، بیوی اور بھائیوں کو ریسٹ ہاؤس میں آنے کے لیے کہا۔ حوالدار صادق علی کو گاؤں میں رہنے کے لیے کہا۔ اُسے میں زیادہ دن روک نہیں سکتا تھا۔ مزدور پوری ہو چکی تھی۔ نمبردار سے کہا کہ وہ چوکیدار کو بلا لے اور میرے ساتھ رہے۔ کنور دیوان سنگھ سے میں نے کہا کہ وہ اپنے خجروں سے کہے کہ گاؤں کے فلاں فلاں آدمی پر نظر رکھیں۔

خون اور منگنی کی انگوٹھی

چوکیدار حسب آیتورات ہو چکی تھی۔ میں نے نمبردار اور چوکیدار سے غامی، مقتول، غامی کے منگیتر عبدو، غامی کے سوتیلی باپ اور مقتول کے گھر کے متعلق معلومات لیں۔ انہوں نے تقریباً وہی باتیں کیں جو حوالدار صادق علی

پڑی تھیں۔ قاتل بھی ہندو راجپوت تھا۔ کنور دیوان سنگھ نے انپکڑی اور ڈی۔ ایس۔ پی، ایم بی وڈ کی دوستی کے فتنے میں قاتل کی غیر شادی شدہ بہن کو ریسٹ ہاؤس میں بلا کر خراب کیا تھا۔ اس کے والدین نے اپنے بیٹے کو خط لکھا۔ وہ جھانسی چھاؤنی میں تھا۔ وہ فوج سے بغیر چھٹی غیر حاضر ہوا۔ کنور دیوان سنگھ کو اُس کے گھر میں قتل کیا لیکن بھاگ نہ سکا۔

ایک بیکار سب انپکڑ اور راشی ڈی ایس پی نے میرے ساتھ زیادتی کی کہ ساتھ میل دور کا کیس میرے سر ڈال دیا۔ اس میں ہندو آنہ ذمہ دیت بھی شامل تھی۔ یہ ہندو مجھے مسلمان سمجھ کر خراب بھی کرنا چاہتا تھا۔ اُس وقت تک میری مسلم دوستی مشہور ہو چکی تھی۔ میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ تہیہ کر لیا کہ ایک ہفتے کے اندر اندر قاتل یا قاتلوں کو پکڑوں گا اور اس کے بعد اس غیر قانونی حکم کے خلاف کارروائی کروں گا۔ مگر ڈی ایس پی نے میری کارروائی کا راستہ اس طرح بند کر دیا کہ چھٹی بھیج دی جس میں لکھا تھا کہ مجھے غامی ڈیوٹی کے لیے اس تھانے میں تعینات کیا گیا ہے۔ ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ اس تھانے کا سٹات تمہاری مدد کرے گا۔ اس طرح یہ حکم قانونی ہو گیا۔

میں نے تھانے کی بجائے ریسٹ ہاؤس میں ڈیرے ڈال دیے۔ مجھے ڈرتا کہ کنور دیوان سنگھ تعاون نہیں کرے گا لیکن وہ میرے آگے بچھا جا رہا تھا۔ اُس نے میرے کھانے اور دیگر مزدور کا پسند و بےست ایسا کیا جیسے میں پولیس کپتان تھا۔ میں نے لاش وارثوں کے حوالے کردی تینوں

بتا چکا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق موت کا جو وقت معلوم ہوا تھا، وہ رات کے پہلے پہر کا تھا۔ قتل ہوئے چوتھا دن گزر گیا تھا۔ میں نے نمبر دار اور چوکیدار سے کہا کہ گاؤں سے یہ پتہ کر س کہ مقتول کو فلاں رات اور فلاں وقت گاؤں سے باہر جانے کسی نے دیکھا تھا؟ اگر دیکھا تھا تو کیا وہ کسی کے ساتھ تھا؟ — انہیں اسی وقت گاؤں بھیج دیا اور خود دباغ پر زور دینے لگا۔ میں اس علاقے میں اجنبی تھا۔ کسی سے جان نہ پہچان۔ مخبروں کی ذہنیت اور فطرت سے واقفیت نہیں تھی۔ لاش اور ٹرنک تو گواہی دے نہیں سکتے تھے۔

دوسرے دن میں نے جن افراد کو بلایا تھا، وہ آ گئے۔ ان کے ساتھ ابھی بہت سے آدمی تھے۔ زیادہ تر آدمیوں کے پاس برچھیاں تھیں۔ میں نے برچھیوں کو غور سے دیکھا۔ زیادہ تر کے پھل تین دھارے تھے۔ سب سے پہلے میں نے مقتول کے باپ کو بلایا۔ میرے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے اُن نے بتایا کہ کسی کے ساتھ ایسی دشمنی نہیں تھی کہ میرے بیٹے کو قتل کر دیا جاتا۔ برادری میں قتل اور زخمی ہوتے رہے ہیں لیکن براہِ راست کسی سے عداوت نہیں تھی۔ فاطمی کے متعلق باپ نے بتایا کہ مقتول کے اس کے ساتھ مراسم تھے۔ باپ نے اُسے کئی بار روکا تھا مگر مقتول نے اپنی ماں سے کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ فاطمی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کی ماں نے اس کے باپ سے بات کی۔ باپ نے مقتول کو ڈانٹ کر کہا کہ لڑکی بدنام ہے اور اس کا سوتیلا باپ بھی اچھے چال چلن کا انسان نہیں۔ شراب بھی پیتا ہے۔ باپ نے فاطمی کا رشتہ:

ان کے سب سے بڑی وجہ یہ بتائی کہ اُس کے سگے بھائی کی بیٹی جوان تھی جسے دستور کے مطابق مقتول کے گھر آنا تھا۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ کیا مقتول شام کے بعد گھر سے نکلنے اور دیر تک باہر رہنے کا عادی تھا باپ نے کہا کہ شادی سے پہلے کبھی کبھی نکل جاتا تھا اور ذرا دیر سے آتا تھا۔ شادی کے بعد ایسا موقع کبھی نہیں آیا۔ باپ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ مقتول شادی کے بعد بھی فاطمی سے ملتا رہا یا نہیں۔

باپ کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ قتل کی رات مقتول کس وقت گھر سے نکلا کیونکہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ الگ کمرے میں ہوتا تھا۔ اس کی بیوی نے آدھی رات کے بعد اُس کے باپ کو جگا کر بتایا تھا کہ مقتول کچھ تباہے بغیر باہر چلا گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا۔ گاؤں والوں کو اُس کی گشت گی کا علم ہو گیا۔ انہوں نے تین دن انتظار کیا پھر پولیس کو رپورٹ دینے کا فیصلہ کیا۔ اسنے میں انہیں مقتول کی لاش مل گئی۔

مقتول کی ماں نے اُس کے باپ کے بیان کی تائید کی۔ یہ بھی کہا کہ وہ فاطمی کے ساتھ شادی کرنے کی ضد کرتا تھا۔ اُسے اس نے بڑی ہی مشکل سے سمجھایا اور چچا کی بیٹی کے ساتھ شادی کے لیے راضی کیا تھا۔ شادی کے بعد گھر میں مقتول کا رویہ اچھا تھا۔ اُس نے اپنی بیوی کے ساتھ بھی بدسلوکی نہیں کی۔ شادی کو ابھی دو مہینے ہی ہوئے تھے، ماں کو بھی علم نہیں تھا کہ مقتول کس وقت گھر سے نکلا تھا۔ اُسے آدھی رات کو پتہ چلا تھا کہ وہ گھر نہیں ہے۔ ماں کی جذباتی حالت بہت بُری تھی۔ بولتی کم اور

اُسے ایسی کوئی آواز یاد نہیں تھی۔ دیہات میں کسی کو چوری چھپے بلانے کے لیے مختلف آوازیں استعمال ہوتی ہیں۔ میں نے لڑکی سے چند اور باتیں پوچھیں اور اُسے باہر بھیج دیا۔ اس سے گھنٹہ ڈیڑھ بعد نمبردار اور چوکیدار آگئے۔ وہ اپنے ساتھ گاؤں کے تین آدمی لائے تھے تینوں غریب سے کسان تھے۔ ان میں سے ایک نے بتایا کہ اُس نے قتل کی رات مقتول کو گاؤں سے باہر جاتے دیکھا تھا۔ ہلکی ہلکی چاندنی تھی۔ ان کا آنا سامنا اچانک ہو گیا تھا۔ اُس نے مقتول سے پوچھا تھا کہ اس وقت کدھر جا رہے ہو۔ اُس نے اتنی دھیمی آواز میں جواب دیا تھا جو اس آدمی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ مقتول کھینچوں کی طرف چلا گیا تھا۔ اس آدمی نے یہ بھی بتایا کہ تین چار گھنٹے دُور اُسے کوئی اور بھی جانا نظر آیا تھا۔ سر پر کپڑی نہیں دوپٹہ لگتا تھا۔ وہ دلی عورت لگتی تھی۔ یہ آدمی دونوں کو دیکھتا رہا تھا۔ دونوں کا رخ ایک ہی سمت تھا اور وہ ایک دوسرے سے دُور دُور جا رہے تھے۔ اس آدمی نے اُن کا پیچھا نہ کیا۔

نمبردار کے ساتھ جو دوسرے دُور آدمی تھے وہ میرے لیے رحمت کے فرشتے ثابت ہوئے۔ یہ چوکیدار کا کمال تھا کہ دو روز پہلے کپ شپ کے انداز میں سُنی ہوئی ایک بات کو اس نے اہمیت دی اور ان دو آدمیوں کو ساتھ لے آیا۔ ان دونوں میں سے ایک نے قتل کی رات کے اگلے روز کسی کے ساتھ باتوں باتوں میں ذکر کیا تھا کہ اس نے گاؤں اور شہر کے درمیان ایک جگہ بہت سا خون دیکھا ہے۔ یہ بات چوکیدار کے کان میں بھی پڑی

روتی زیادہ تھی۔ اُسے باہر بھیج کر مقتول کی بیوی کو بلایا۔ سولہ سترہ سال عمر کی اس لڑکی پر مجھے ترس آ گیا۔ اسی عمر میں دو ہی ماہ بعد بیوہ ہو جانا بڑا حادثہ ہوتا ہے۔ اُس نے میرے سوالوں کے جواب میں بتایا کہ اُس کے ساتھ مقتول کا سلوک اچھا تھا۔ کبھی بے رخی بھی نہیں کی تھی۔ اسے ملتا تھا کہ مقتول شادی سے پہلے غامی سے ملتا جلتا تھا۔ اُس نے شاید دوسری تیسری رات مقتول سے پوچھا تھا کہ وہ اُسے دھوکہ تو نہیں دیا؟ مقتول نے اُسے قسم کھا کر یقین دلایا تھا کہ اُس نے غامی سے نفرت دیا ہے۔ قتل کی رات جب لوگ سو گئے، مقتول اپنی بیوی کے پاس تھا بستر سے اٹھا اور یہ کہہ کر باہر نکل گیا کہ ابھی آتا ہوں۔ پھر نہیں آیا۔

”وہ کوئی ہتھیار لے کر نکلا تھا؟“ میں نے پوچھا۔
 ”نہیں۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ ”خالی ہاتھ گیا تھا۔“

”اس سے پہلے وہ غصے میں تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”تم نے اس کے ملاپ میں کوئی تبدیلی دیکھی تھی؟“

”نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”وہ روزمرہ کی طرح تھا۔“

”باہر سے کوئی آواز آئی تھی؟“ میں نے پوچھا۔ ”مثلاً کسی نے باہر کسی کو آواز دی ہو یا کسی نے گلی میں سے گزرتے گزرتے ہوک لگائی ہو؟“

لڑکی نے یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”نہیں، بالکل خاموشی تھی۔“

”ذرا اور یاد کرو۔“ میں نے کہا۔ ”باہر کپڑے بولا تھا؟ ہلکی میاؤں سا دی گئی؟ یا کوئی اور آواز خواہ کسی جانور یا پرندے کی ہو؟“

پر جالگا تھا۔ دونوں آدمیوں کے رنگ اڑ گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پولیس آفیسر جہدوں کے بدلتے ہوئے رنگ کو خوب پہچانتے ہیں۔ مجھے اس کا خصوصی تجربہ تھا۔ میں نے نہیں سنبھلنے نہ دیا نہ ان کے جواب کا انتظار کیا۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر کہا۔ ”شہاب، وہ چیز مجھے دے دو۔“ وہ بیچارے غریب سے کسان تھے۔ پولیس کے خوف نے انہیں ہپناٹا تر کر دیا۔ ایک کے منہ سے سرگوشی کے لہجے میں نکل گیا۔ ”اُن دانا! وہ چیز ہمارے پاس نہیں۔ سنا کہ وہ دس سدی تھی۔“ دونوں نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور رد کر لیا کرتا کرنے لگے کہ انگوٹھی انہیں زمین پر پڑی ملی تھی، انہیں بخش دیا جائے کیونکہ وہ بہت غریب ہیں اور انگوٹھی انہوں نے چوری نہیں کی۔ دراصل یہی وجہ تھی کہ انہوں نے خون دیکھا، انسانی پاؤں کے نشان بھی دیکھے اور گاؤں والوں کو نہ بتایا۔ وہ انگوٹھی ہضم کرنا چاہتے تھے۔

مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ انہیں موقعہ واردات سے انگوٹھی ملی تھی، اور مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اگر انگوٹھی ملی تھی تو وہ کس کی تھی۔ مقتول کی ہی ہو سکتی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ شہر کے ایک سناہ کے پاس انہوں نے انگوٹھی سولہ روپوں میں بیچی اور آٹھ آٹھ روپے تقسیم کر لیے تھے۔ میں اُسی وقت انہیں ساتھ لے گیا۔ ان کی رہنمائی میں سناہ کی دکان پر گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ سناہ کسی سے زیور خریدیں تو فوراً پگھلا ڈالتے ہیں تاکہ مال چوری کا ہونے کا نشان ہی نہ رہے۔ سناہ نے بنا دیا کہ

تھی۔ قتل کے پانچویں روز اُسے اچانک یاد آگئی۔ اس نے نمبردار کو بتائی۔ نمبردار نے اس آدمی سے پوچھا۔ اُس نے ایک اور آدمی کا نام لیا جو اُس کے ساتھ تھا۔ نمبردار اور چوکیدار ان دونوں کو میرے پاس لائے۔ میں نے انہیں پورن بات سنانے کو کہا تو انہوں نے مختصر سی یہ بات سنا لی کہ ایک نشیبی جگہ پر انہوں نے خون دیکھا تھا۔ انسانی پاؤں کے نشان بھی تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے کسی آدمی کو یہاں زخمی کیا گیا ہو اور زخمی یہاں پڑا رہا ہو۔ انہوں نے دیکھا کہ اپنے گاؤں میں سب خیریت سے ہیں تو انہوں نے کسی سے بات نہ کی۔ غریب آدمی پولیس سے ڈرتے تھے ایک روز بعد انہیں حسنین کی گمشدگی کا علم ہوا تو وہ اس ڈر سے خاموش رہے کہ اس کے گھر والے ماریں گے کہ انہیں اُسی روز کیوں نہ بتایا۔ ان میں سے ایک نے کسی کے ساتھ دیسے ہی بات کی تھی۔

میں نے آپ کو پہلی کہانیوں میں سنایا ہے کہ موقعہ واردات سے اکثر کام کی کوئی چیز مل جاتی ہے۔ خواہ وہ ایک بال ہی کیوں نہ ہو۔ عادی اور استاد جرم ایسے سراغ نہیں چھوڑا کرتے۔ اتفاقیہ جرم کرنے والے کوئی نہ کوئی سراغ چھوڑ جاتے ہیں۔ میرے لیے اب اس واردات کی جگہ بیکار تھی۔ پانچ دن گزر گئے تھے۔ گھر سے کھوج کی امید بے معنی تھی۔ میں نے ان آدمیوں سے پوچھا۔ ”موقعہ واردات پر تم نے کوئی سپر پڑی دیکھی تھی؟“ میں نے یہ سوال عادت کے تحت کر ڈالا تھا۔ میرے ذہن میں کچھ بھی نہ تھا لیکن میں نے دیکھا کہ ہوا میں چلایا ہوا تیر غالباً کسی نشانے

اُس نے ان دونوں سے سونے کی ایک انگوٹھی خریدی تھی۔ اس نصبے میں ستاروں کی کل تین دکانیں تھیں۔ ستار ایک۔ ۱۰ سر۔ ۱۰ نیارے ہوئے زیورات پہچان لیتے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”انگوٹھی نئی تھی؟ اور اگر نئی تھی تو کس کی بنی ہوئی تھی؟“۔ اتفاق سے انگوٹھی اسی کی دکان کی بنی ہوئی تھی اور نئی تھی۔ وہ مجھے بتا نہ سکا کہ اس کا خریدار کون تھا۔ اُن دنوں زمانہ انگوٹھیوں کا یہ نیا ڈیزائن نیار ہوا تھا۔ میں نے اُسے مقتول کے گاؤں کا نام لے کر کہا کہ یاد کر کے بتاؤ کہ انگوٹھی اس گاؤں میں تو نہیں گئی تھی؟

اُس نے ذہن پر زور دیا تو اُسے فاطمی کے منگیترا کا نام یاد آ گیا۔ اس نے کہا۔ ”دس بارہ روز گزرے وہ اپنی ماں کے ساتھ آیا تھا اور اُس نے عامسا زیور خریدا تھا۔ اس سے پہلے اس نے یہ انگوٹھی خریدی تھی۔ کہتا تھا کہ منگنی کے لیے لڑکی کو پہنانی ہے۔ اس کے پاس انکلی کا صبح ساتر نہیں تھا۔ اپنی چھوٹی انکلی میں انگوٹھی ڈال کر اُس نے کہا تھا کہ یہ پوری ہوگی۔“ ستار نے یہ انگوٹھی اکیس روپے اور دو چار آنے پر بیچی تھی۔ اُس زمانے میں سونا بہت سستا تھا۔ یہ انگوٹھی ننگ اور پتھر کی وجہ سے ہنگی بیچی گئی تھی۔ میں نے ستار سے یہ نہ کہا کہ اُس نے یہ جانتے ہوئے کہ انگوٹھی کسی اور کی تھی، اس نے خرید کر حرم کیا ہے۔ مجھے تو اس پر خوشی تھی کہ اندھیرے میں خدا نے روشنی دکھادی تھی۔ یہ انگوٹھی عبدونے فاطمی کو منگنی پر دی تھی جو موقعہ واردات پر گر پڑی۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ انگوٹھی کھلی تھی اور یہ بھی

کہ موقعہ واردات پر فاطمی موجود تھی، مگر سوال یہ تھا کہ قاتل کون ہے؟ میرے دماغ میں پہلا خیال یہ آیا کہ فاطمی اور مقتول اکٹھے پکڑے گئے اور مقتول قتل ہو گیا۔ اگر یہی صورت تھی تو فاطمی سے قاتل کی نشاندہی کرائی جاسکتی تھی۔۔۔ میں نے ستار سے کہا کہ اُس نے چوری کا مال خرید کر حرم کیا ہے۔ بہر حال میں اُسے کچھ نہیں کہوں گا بشرطیکہ وہ منہ بند رکھے۔ اگر عبدو آجائے تو اُسے نہ بتائے کہ میں یہاں آیا تھا یا انگوٹھی یہاں آئی تھی۔ اُس نے میرے کہنے پر مجھے بالکل اسی ڈیزائن کی ایک انگوٹھی دکھائی۔

میں نے دونوں آدمیوں کو اور ستار کو بھی گواہوں کی فہرست میں لکھ لیا اور انہیں خبردار کر دیا کہ کسی سے کوئی بات نہ کریں اور ہر وقت گھر دل میں حاضر رہیں ہیں۔ سیٹ ہاؤس جا کر سو کیلار کے ساتھ دوکانیٹیل اس ہدایت کے ساتھ گاؤں روانہ کر دیئے کہ عبدو، فاطمی، فاطمی کی ماں اور اُس کے باپ کو بلا لائیں لیکن عبدو کو الگ اور پہلے لائیں۔ وہ جب گاؤں سے نکل آئے تو چھ دوسروں کو لائیں۔ میں بہت ہی خوش تھا۔ میری آدمی انتہیش مکمل تھی۔ اب قاتل کا سراغ لگانا مشکل نہیں تھا۔

لڑکی نے مجھے پریشان کر دیا

سب سے پہلے عبدو آیا۔ اچھا خوب رو جوان تھا۔ عمر مقتول جتنی تھی۔

کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟ وہ مجھ سے پوچھ لیں۔

”محترم!۔ میں نے اُسے کہا۔“ میں بہتر سمجھتا ہوں کہ مجھے کس سے کیا پوچھنا ہے۔ ایک جوان آدمی قتل ہو گیا ہے جسے میں آپ کی طرح یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کر سکتا کہ لڑکا بدچلن تھا۔ اگر بدچلن کو قتل کرنے کی کھلی چھٹی ہوتی تو آج آپ زندہ نہ ہوتے۔ آپ باہر نشر لیتے جاویں۔ وہ باہر گیا تو میں نے کانسٹیبل سے کہا کہ غلطی کو اندر لے آؤ۔ لڑکی اندر آئی تو میں نے اُسے کرسی پر بٹھایا۔ مجھے معلوم تھا کہ اُس کی انگلی میں منگنی کی انگوٹھی نہیں ہوگی۔ اُس کے ہاتھ دو گھوڑا ہوسکی کی چادر میں تھے۔ میں نے پہلے تو اُس سے گپ نشپ لڑائی۔ پھر کہا کہ اس کی منگنی ہو گئی ہے۔ میں نے خوشی کا اظہار کر کے کہا کہ بچیاں اپنے خاندانوں کے گھروں میں اچھی لگتی ہیں۔ میں نے منگنی کے متعلق جذباتی سی باتیں کہیں۔ اُس کا خوف دور ہو چکا تھا۔ میں نے مذاق بھی کیا۔ وہ کھل کر ہنسی۔ اُس میں شرم و حجاب نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ میں نے یہ جانتے ہوئے کہ منگنی کی انگوٹھی اُس کی انگلی میں نہیں ہوگی اس سے کہا۔ ”منگنی کی انگوٹھی تو دکھاؤ۔“ مجھے توقع تھی کہ وہ کہے گی انگوٹھی گھر پڑی ہے، پھر میں اُسے گھر لے جاؤں گا اور کہوں گا کہ انگوٹھی دکھاؤ، مگر اُس نے چادر سے ہاتھ باہر نکال کر میری امیوں اور منسوبوں پر پانی پھیر دیا۔ انگوٹھی اُس کی انگلی میں تھی اور وہ بالکل ویسی ہی تھی جیسی ستار نے مجھے دکھائی تھی۔ گھبراہٹ جو لڑکی پر طاری ہوئی تھی وہ مجھ پر

اُسے میں نے الگ بٹھا دیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد غلطی، اس کی ماں باپ آگیا۔ باپ کی عمر چالیس سے ذرا کم ہی ہوگی۔ غلطی کی ماں کی عمر اُس سے کم تھی لیکن ابھی جوان لگتی تھی۔ خدائے اسے بڑا صاف رنگ اور اچھے شکل دی تھی۔ غلطی کی خواہش ورنہ کو میں اچھی طرح بیان نہیں کر سکتا گا۔ کچھ اور ہی قسم کا حسن تھا مگر یہ حسن پورا سرا رنم کا تھا جس میں مجھے کنوارے پن کی معصومیت نظر نہیں آتی تھی۔ اُس کی آنکھیں بہت ہی دلکش تھیں مگر اُن میں کوئی مطمئن تھا۔ مختصر یہ کہ وہ غیر معمولی لڑکی تھی۔ اس کا کردار اس کے چہرے پر لکھا تھا۔ چہرہ شناسی کی معمولی سی سوجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی کہہ سکتا تھا کہ یہ لڑکی مردوں کے سر کھلوا سکتی ہے اور یہ بھائی کو بھائی کا دشمن بنا سکتی ہے۔

اُس کا باپ میرے پاس آیا۔ تپاک سے ہاتھ ملا یا۔ میرا نام پوچھا۔ پھر یہ پوچھا کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں۔ میں برخورداری سے اُس کے سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ اس نے کنوڑ دیوان سنگھ کے ساتھ اپنے گھر سے دور جانے کا اظہار کیا۔ ڈی۔ ایس۔ پی، ایم۔ بی۔ وڈ کا بھی نام لیا اور کہا کہ وہ اُس کے ساتھ شکار پر جایا کرتا ہے۔۔۔ کچھ دیر مجھ پر اپنی پوزیشن کا رعب گانٹھ کر اُس نے کہا۔ ”آپ نے میری بیوی اور بیٹی کو بلایا ہے۔ اس سے میری بہت بے عزتی ہوئی ہے۔ یہ جو لڑکا قتل ہو گیا ہے کسی نے شہنی سے مار ڈالا ہوگا۔ لڑکا بدچلن تھا۔ اُس نے اپنے کئے کی سزا پائی۔ مجھ جیسے عزت داروں کو تو ہاتھ کھسینا حار ہے۔ آپ میری بیوی اور بیٹی سے

گاؤں ہے۔“

”رات کا وقت تھا؛

”ہاں!“

”اُسے تم نے بلایا تھا؛

”ہاں!“

”کس طرح؟“ میں نے پوچھا۔ ”کسی کی زبانی پیغام بھیجا تھا؛“

اُس نے ایک خاص اشارہ بتایا جو اس نے دن کے وقت کیا تھا۔ یہ ان کا پرانا اشارہ تھا۔ اس نے ملاقات کی جگہ شہر اور گاؤں کے درمیان بتائی۔ مجھے ابھی وہ جگہ دیکھنی تھی۔ جن دو آدمیوں کو انکھوٹھی ملی تھی، انہوں نے بھی شہر اور گاؤں کے درمیان ایک جگہ کی نشاندہی کی تو میں نے اُس جگہ فوراً جانا فائدہ مند نہیں سمجھا تھا کیونکہ قتل کو اتنے دن گزر گئے تھے۔ اب وہاں جانے سے کچھ نہیں مل سکتا تھا۔ وہ جگہ تو بہر حال دیکھنی ہی تھی کیونکہ وہ جہاں واردات تھی لیکن لڑکی نے بھی ایک جگہ کی نشاندہی کی تو میں نے اُسی وقت وہ جگہ دیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ معلوم ہوا کہ وہاں تک جاکر جاسکتا ہے۔ میں نے دو بیکے منگوائے۔ ایک میں لڑکی کو اپنے ساتھ بٹھایا، دوسرے میں انکوٹھی اٹھا کر بیچنے والے دوڑوں آدمیوں کو دو دکانیٹیوں کے ساتھ بٹھایا۔

قبضے سے چار پانچ فلائنگ دھڑلڑکی نے بیکہ رکوایا۔ ہم اترے۔ اُس نے مجھے ایک جگہ دکھا کر کہا کہ اُن کی بیشتر ملاقاتیں یہاں ہوتی تھیں۔ دوسرا بیکہ بھی رک گیا تھا۔ میں نے اشارے سے انہیں دُور رہنے کو کہا۔

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ میں نے اُس کی حوصلہ افزائی کی۔ اُس نے کہا۔ ”اُس کی نشاندہی ہو جانے تک۔“

”وہ اس کے بعد بھی تمہیں ملتا رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”عبداللہ نے تمہیں دوستی کے لیے کہا تھا تو تم نے انکار کیوں کیا تھا؟“

اُس نے چونک کر فحشہ دیکھا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اُس نے آہستہ سے پوچھا۔ ”آپ کو یہ باتیں کس نے بتائی ہیں؟“

”جس نے حسین کو قتل کیا ہے۔“ میں نے جواب دیا اور اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا اور وہ آنکھیں جھکا کر اُدھر دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ ”مجھ سے کچھ نہیں چھپا سکو گی فاطمی!“

”لیکن مجھے یہ تو پتہ نہیں کہ قاتل کون ہے۔“ اُس کی آواز کانپ رہی تھی

”کیا عبداللہ نے تمہیں حسین کے ساتھ پکڑ لیا تھا؟“

”نہیں۔“

”تمہیں حسین کے ساتھ کسی نے نہیں پکڑا تھا؟“

”نہیں۔“

”یکب کی بات ہے؟“

”اُس کی نشاندہی سے ایک مہینہ بعد کی بات ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”قتل سے بہت دن پہلے میں اُسے ملی تھی۔“

مظلوم ماں، اوباش بیٹی

میرے عقیدے کے عین مطابق خدائے فردا الجلال نے میری مدد کی۔
 سیٹ ماؤس کے برآمدے میں سنار ہیڈ کانسیٹیل کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔
 اُس نے فاطمی کو ایک کانسیٹیل کے حوالے کر دیا اور ہیڈ کانسیٹیل اور
 ٹار کو اندر لے گیا۔ ہیڈ کانسیٹیل نے کہا۔ ”عبداللہ اس سے ایک
 اور انگوٹھی خریدی تھی۔“ آپ میری خوشی کا اہواز نہیں کر سکتے ہیں
 نے سنار سے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ عبداللہ اس کے پاس آیا تھا اور یہ
 ہر کوئی ہی ایک اور انگوٹھی لے گیا تھا کہ کھلی تھی، کہیں گم ہو گئی ہے۔
 ٹار نے جو دن بتایا وہ قتل سے ایک روز بعد کا دن تھا۔ میں نے سنار
 پوچھا کہ اُس نے یہ بات مجھے اُس وقت کیوں نہ بتائی جب میں اس کی
 ان پر کیا تھا؟ اس نے ہاتھ جوڑ کر بھکاریوں کی طرح جواب دیا۔ ”کار دیار
 رکاب کی کا معاملہ ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ کسی کو بتانا نہیں کر میں نے ایک
 اور انگوٹھی خریدی ہے۔ میں گالک کو ناراض نہیں کر سکتا۔“
 ”تم نے اُسے یہ تو نہیں بتایا ہو گا کہ اُس کی جو انگوٹھی گم ہو گئی ہے،
 اب ہمارے پاس فردخت ہوئی ہے؟“

”نہیں“ اُس نے جواب دیا۔ ”یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں کہ میرے پاس
 انگوٹھی آئی ہے۔ وہ عبداللہ کی ہے۔ میری دکان سے ایسی کئی انگوٹھیاں

وہ جگہ کشادہ تھی اور ذرا گہری۔ ارد گرد درخت، جھاڑیاں اور ایک طرف
 کھیت تھیں۔ وہاں پکڑے جانے کا خطرہ کم تھا۔ لڑکی کو پرے بھج کر دوڑنے
 آدمیوں کو بلایا۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں انگوٹھی یہاں سے ملی تھی۔ زمین
 زیادہ کچی نہیں تھی اور کوئی ایسی پکی بھی نہیں تھی۔ خشک خون پر مٹی جم
 گئی تھی۔ پاؤں کے نشان اکڑ گئے تھے۔ زمین یہ بتا رہی تھی کہ یہاں دو تین
 آدمیوں کی دھینکنا مشتقی ہوئی ہے۔ ارد گرد زمین کو بڑی ہی غور سے
 دیکھا مگر کوئی سرخ نہ ملا۔ مجھے یہ کامیابی ضرور حاصل ہوئی کہ فاطمی کے
 متعلق یقین ہو گیا کہ اگر یہ قتل میں شریک نہیں تھی تو واردات کے ساتھ
 اس کا تعلق ضرور تھا۔

میں نے اُسے کچھ بھی نہ کہا۔ جیسے واردات کا نقشہ تیار کیا اور سب
 کو سیٹ ماؤس لے گیا۔ راستے میں فاطمی نے میرے زانو پر ہاتھ رکھ کر پوچھا
 ۔ ”اب آپ کیا کریں گے؟“ میں نے اُسے تسلی دی۔ میں اُس کے گرد شہر
 کی دیواریں گھڑی کر کے کہنا چاہتا تھا کہ اب کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔۔۔ اُس
 کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میرے ذہن پر انگوٹھی سوار تھی۔
 مجھے سنار کی بات یاد آ رہی تھی کہ عبداللہ کے پاس انگوٹھی کا یعنی لڑکی کی انگی
 کا ناپ نہیں تھا۔ اُس نے اپنی چھوٹی انگلی میں انگوٹھی ڈال کر کہا تھا کہ یہ
 ٹھیک رہے گی۔ میں نے اس سے یہ مطلب حاصل کیا کہ لڑکی کی انگلی میں
 انگوٹھی کھلی تھی جو یہاں گر پڑی۔ سوال یہ تھا کہ جو انگوٹھی لڑکی کی انگلی میں تھی
 وہ کہاں سے آئی۔ میں دعا کر رہا تھا کہ ہیڈ کانسیٹیل میری مرضی کا جواب دے۔

جاچکی ہیں۔ آپ نے ایک گاؤں کا نام لیا تو میں نے بتا دیا کہ اس گاؤں کا ایک آدمی اپنی ماں کے ساتھ آیا تھا اور زیورات لے گیا تھا۔
”کیا تم عبد کو پہچان لو گے؟“

”کیوں نہیں!“ اس نے جواب دیا۔ ”وہ باہر بیٹھا ہوا ہے۔“
اُس نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا تھا۔ شاید یہ کہہ رہا تھا کہ میں دوسری انگوٹھی کا ذکر یہاں نہ کروں۔ اُس نے میری منت سماجت شروع کر دی۔

میں نے اُس کی شہادت کے متعلق چند ایک ہدایات دے کر ایک دکان پر بھیج دیا اور ناٹھی کے منگینتر عبد کو اندر بلایا۔ پہلے تو میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا پھر اس کے چہرے کا گہرا بازوہ لیا۔ میں اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ اس میں اتنا سنگین اور گستاخنا جرم کرنے کی ہمت اور سلاست ہے؟ کچھ ہوئے مضبوط جسم کا نوجوان تھا۔ میں نے اُسے سامنے بٹھا کر کہا۔ ”دیکھو عبد میاں! مجھے چکر دینے کی کوشش نہ کرنا تمہاری زبان تمہیں پچانسی کے تختے پر کھڑا کر سکتی ہے یا کالا پانی بھرا سکتی ہے۔ میں جو کچھ پوچھوں سچ بتا دینا۔ مجھے پریشانی نہ کرو گے تو پریشانی نہ ہو گے۔ میری مدد کرو گے تو میں تمہاری مدد کروں گا۔ میں مسلمان ہوں۔“

”اچھو اچھو! کیا پوچھتے ہو؟“ اُس نے بڑی دلیری سے کہا۔
مجھے کچھ سمجھتا ہی نہ ہو۔ اس ایک فقرے اور اُس کے لہجے سے میں سمجھ

اگر لڑکا اپنے آپ کو بہت دلیر سمجھتا ہے۔
”فاطمی نے تمہیں قبول کر لیا ہے؟“ میں نے اُس پر وار کرنے کے انداز پوچھا۔

”ٹوکی کی کیا مجال ہے کہ قبول نہ کرے؟“

”اُس نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ میں نکاح میں انکار کر دوں گی؟“ میں نے ردِ بے سے کہا۔ ”اُس نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ طلاق لے لوں گی؟“
ذرا سا گھبرایا۔ میں نے کہا۔ ”کیا لڑکی کے ساتھ تم نے عہد نامہ کر لیا کہ وہ تمہیں دل سے قبول کرے گی؟“

”آپ ایسی باتیں کیوں پوچھتے ہیں؟“ اُس نے اپنے رعب کو قائم رکھتے پوچھا۔

”اس لیے پوچھتا ہوں کہ وہ تمہیں دھتکار چکی تھی۔“ میں نے کہا۔
یہ وقت کے نیچے امیری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ اب بھی تمہیں مانیں کر رہی۔ اب بھی اُس کی زبان پر حسین کا نام ہے۔“ میں اُس کے سر پر نظر میں جھلٹے ہوئے تھا۔

”کیا اُس نے آپ کے ساتھ یہ باتیں کی ہیں؟“ اُس نے احمقوں کی طرح پوچھا۔
”اُس نے اور بھی بہت سی باتیں کی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے مانیں کہ وہ میرے ساتھ باہر گئی تھی؟ وہ مجھے جگہ بھی دکھا لائی ہے؟“
”کون سی جگہ؟“ اس نے بچکی لینے کے انداز سے پوچھا۔
”جہاں اس کی انگوٹھی گری تھی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم نے دیکھا

نہیں یہاں سے سنا رہی ابھی گیا ہے؟“ اُس کی زبان بند ہو گئی اور آنکھیں
 ٹھہر گئیں۔ مجھے ایسے ہی رد عمل کی توقع تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”تم نے
 دوسری انگوٹھی کیوں خریدی تھی؟“
 ”پہلی کھلی تھی۔“ اُس کے منہ سے جیسے یہ الفاظ پھسل کر باہر آ گئے
 ہوں۔ ”کام کرنے کی گڑبڑ تھی۔“

”تمہیں کس نے بتایا تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”تمہاری ماں نے؟“
 جواب دو۔ میں دو سیکنڈ میں ثابت کر دوں گا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ وہ
 نمازش رہا۔ سنا رہے تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ کسی کو یہ نہ بتانا کہ تم نے دوسری انگوٹھی
 خریدی تھی؟... کہہ دو پہلی انگوٹھی کھلی تھی اس لیے تبدیل کرائی تھی۔ کہہ دو وہ گم
 نہیں ہوئی تھی۔“ اُس کی دلیری اور روانگی ختم ہو چکی تھی۔ آنکھیں پھلنے
 مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”تمہیں فاطمی نے بتایا تھا کہ انگوٹھی گم
 ہو گئی ہے۔ اُسے شک تھا کہ وہ اس جگہ گری ہے جہاں رات کو تم گئے تھے
 اور جہاں حسین بھی تھا۔“ اُس پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ مجھے چونک
 ابھی بہت سی باتوں کا علم نہیں تھا اس لیے میں نے ہوا میں تیر چلانے مناسب
 نہ سمجھے۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو بلا کر عہد کو اُس کے حوالے کیا اور کہا کہ
 اسے دوسرے دروازے سے پھیلچل برآمدے میں لے جاؤ اور دیوار کے
 ساتھ منہ دیوار کی طرف کر کے بٹھا دو اور خود اس پر پہرہ دو۔

میں نے فاطمی کی ماں کو بلایا۔ اُسے اپنے سانسے بٹھایا ہی تھا کہ اُس
 کا خاندان اندر آ گیا۔ کہنے لگا۔ ”یہ سیدھی اور شریفیت سی عورت ہے۔“
 آپ کے کسی سوال کا جواب ٹھیک طرح نہ دے سکے گی۔ اگر آپ اجازت
 دیں تو میں اس کے پاس بیٹھ جاؤں۔“
 ”دیکھو میاں!“ میں نے اُسے کہا۔ ”تم اس کمرے سے نہیں، اس ڈاک
 بگ کے احاطے سے باہر نکل جاؤ۔ فوراً۔ چلو۔۔۔ نکلو یہاں سے۔“
 اُس نے ذرا سی پس دپیش کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے اُسے
 لانٹ کر باہر نکال دیا۔ مجھے بتایا جا چکا تھا کہ یہ اس عورت کا دوسرا خاندان
 ہے اور یہ عورت پہلے خاندان کے گھر بھی منظر رہی اور دوسرا خاندان بھی اس
 بزم کمرے رہا ہے۔ میں نے اُسے کہا۔ ”میری بات غور سے سنو بہن! تم اس
 رات پوئیس کی حفاظت میں ہو۔ میں جانتا ہوں تمہاری زندگی کس طرح
 زری ہے۔ میں تم سے جو پوچھوں سچ بتانا۔ میں تمہاری حفاظت کا پورا
 ذمہ داری کر کے جاؤں گا۔“
 پہلے اُس کے آنسو نکلے پھر وہ ہچکیاں لینے لگی۔ میں نے اُسے بہانے
 پوشش نہ کی۔ اُس نے منہ پر دھپڑ ڈال لیا۔ کچھ دیر بعد جب اُس کی
 پلایاں ذرا رکنے لگیں تو میں نے اٹھ کر اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کا
 ہر دوسرے ہاتھ سے اُدھر اٹھا کر کہا۔ ”مجھے جانی نہیں سمجھو گی؟ تمہارا
 ازبید کار انسان ہے، اسی لیے میں نے اُسے دھنکار کر باہر نکال دیا
 ہے۔ تم دکھی ہو، اور منظر ہو، اس لیے تمہیں بہن کہہ رہا ہوں۔“ مجھے آج
 مارے الفاظ یاد نہیں رہے جو میں نے اُسے کہے تھے۔ اُس زمانے میں جب
 ہر جسم خون سے بھرا ہوا تھا، میں بڑے اچھے اچھے الفاظ بول لیا کرتا تھا

پڑی رہتی ہوں۔ مجھے کیا خبر وہ گھر میں تھی یا کہیں چلی گئی تھی؟
”تمہارا خاوند اُس رات گھر تھا؟“

”نہیں“ اُس نے فدا سوچ کر کہا۔ ”وہ شرابی شہر گیا ہوا تھا....
ہندوؤں کے ساتھ“ اُس نے ذہن پر اور زور دیا اور کہا۔ ”ہاں، فاطمی
کو میں نے باہر جاتے دیکھا تھا، پوچھا نہیں تھا کہ کہاں جا رہی ہے؟“
”والیس کب آئی تھی؟“

”میں سو گئی تھی“ اُس نے کہا اور جھنجھلا کر کہنے لگی۔ ”میں تو پتھر ہوں۔
مجھ سے آپ ان دونوں کے متعلق کچھ نہ پوچھیں۔“

میں اُس سے فاطمی کے کپڑوں کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا جو اُس نے رات
کو پہن رکھے تھے۔ مجھے شک یہ تھا کہ وہ قتل میں شریک تھی تو لاش ٹرنک
میں رکھنے میں اس نے قاتل کی مدد کی ہوگی۔ اس کے کپڑے خون آلود ضرور
ہوتے ہوں گے۔ فاطمی کی ماں سے میں نے بہت سے سوال کیے تو وہ صرٹ
یہ بتا سکی کہ صبح فاطمی کے جسم پر وہ کپڑے نہیں تھے جو اُس نے گزشتہ رات
پہنے ہوئے تھے۔ میرے سوال کے جواب میں اُس نے یہ بھی بتایا کہ اُس
نے صبح سویرے غسل کیا تھا اور رات والے کپڑے دھوئے تھے۔ ماں کے
بیان کے مطابق گھر کے تمام کپڑے ایک عورت آکر دھو جایا کرتی تھی۔ فاطمی
نے اپنے کپڑے پہلے کبھی نہیں دھوئے تھے.... اس عورت نے میرا کام آؤ
زیادہ آسان کر دیا لیکن اُس کے منہ سے یہ باتیں نکلوانے کے لیے مجھے بے پناہ
کوشش کرنی پڑی، حالانکہ وہ باتیں چھپانے کی ذرہ بھر کوشش نہیں کر رہی تھی۔

اور الفاظ کی ہیرا پھیری سے پتھر کو بھی موم کر دیا کرتا تھا۔ یہ عورت تو بے پارہ
منظوم تھی۔ اتنی اچھی صورت پر غم کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس
کی ہمدردی میں الفاظ میرے دل سے نکل رہے تھے۔ میں نے ان کا اثر
دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پیار اور ہمدردی کے دلفظوں کے لیے تڑپ
رہی تھی۔

اُس نے کہا۔ ”اب میرا کوئی کیا بگاڑے گا۔ میں تو کہتی ہوں کہ میرا یہ نا
مجھے زہر دے دے، میں خوشی سے پی لوں گی یا آپ مجھے پچھانسی کے تختے
کھڑا کر دیں، اپنے ہاتھوں رسمہ گلے میں ڈالوں گی۔“ اُس نے اور بھی بہ
سی باتیں کیں جو سنا نامزدی نہیں۔ ایک جملہ میرے دل میں اتر گیا۔ اُس
نے کہا۔ ”پہلے خاوند نے اس لیے مجھ پر ظلم کیا کہ میں نے لڑکی کو جنم دیا تھا
دوسرا خاوند اس لیے ظلم کر رہا ہے کہ لڑکی جوان اور خوبصورت ہے اور
بوڑھی ہو گئی ہوں۔“ میں نے اُسے کہا کہ وہ تمہاری بیٹی ہے، نام اُسے
منع نہیں کر سکتیں؟ اُس نے جواب دیا۔ ”یہ میری بیٹی نہیں سوت (سوکھ)
ہے۔ میں تو گھر میں نوکرانی ہوں۔ وہ اسے شراب بھی پلا رہا ہے۔ وہ اس کا
سگا باپ تو نہیں۔ سو تیلے باپ کبھی سکے ہوئے ہیں؟“

اُس نے لمبی لمبی تفصیلات سنائیں۔ میں نے پہلے بھی ایسے سونیلے باپ
دیکھے تھے۔ میرے لیے یہ نقصہ نیا نہیں تھا۔ میں آپ کو صرف واردات اور
تفتیش کی تفصیل سنائیں گا۔ میں نے اُسے قتل کی رات یاد کرا کے پوچھا کہ
رات فاطمی باہر نکلی تھی؟ اُس نے جواب دیا۔ ”میں کمرے میں تیلیوں کی لڑ

وہ دراصل دماغی طور پر بہت سست عورت تھی۔ کبھی تو یہ شک نہ ہوا تھا کہ اس کا دماغ سو گیا ہے۔ مجھے بیدار کرنا پڑنا تھا۔ یہ شاید اس بُرے سلوک کا اثر تھا جو اسے در فائدوں سے ملا تھا۔

مال نے پردے چاک کر ڈالے

اُسے باہر بھیج کر میں نے عبد وکی مال کو بلایا۔ وہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے اندر آتے ہی پوچھا۔ ”میرا بیٹا کہاں ہے؟“ اس نے عبد وکی کو اندر آتے دیکھا، باہر جاتے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اُسے سچھے برآمدے میں بٹھا رکھا تھا۔ اُس کی ماں کو میں نے تسلی دلا سے دیئے اور بتایا کہ اسے گرفتار یا قید نہیں کیا گیا۔ اس عورت کے ساتھ بھی مجھے بہت مشکل پیش آئی۔ اُسے اپنے بیٹے کا غم کھائے بار بار پوچھا۔ ”میرا بیٹا کہاں ہے؟“ آپ نے پکڑ تو نہیں لیا؟“ میں نے اس کی اسی کمزوری کو استعمال کیا۔ اُسے جھوٹی تسلیاں دے کر اور طرح طرح کی فریب کا رانہ باتیں کر کے اسے نابل کر لیا کہ وہ میرے ہر ایک سوال کا جواب صحیح دے دی گی تو اس کا بیٹا محفوظ رہے گا ورنہ اسے انگریز ہتھیاروں لگا کر لے جائیں گے اور بے گناہ کالا پانی بھیج دیں گے۔“ ماننا کی ماری ہوئی اور لاڈ سے بگاڑے ہوئے اکوڑے بیٹے کے لیے پریشان عورت نے مجھے سب کچھ بتا دیا جو اُسے معلوم تھا۔ مختصر یہ کہ عبد وکی مال باپ کا اکوڑا بیٹا تھا۔ وہ دس سال کا تھا جب

باپ مر گیا۔ گھر میں دانے تھے جن کی بدولت بچے کو شہزادہ بنایا گیا۔ میری ضد پوری کی گئی جس سے وہ ضدی ہو گیا۔

دس سال تک وہ بگڑ چکا تھا۔ باپ مر گیا تو ماں نے بچے کی خاطر دوسری شادی نہ کی۔ زندگی بچے کے لیے وقف کر دی۔ زمین بہت تھی۔ تیرہ چودہ سال کی عمر تک بچہ آوارہ ہو چکا تھا۔ دودھ، مکھن اور گھی نے اسے چودہ سال کی عمر میں چوبیس سال کا جوان بنا دیا۔ شہر قریب تھا۔ جہاں وہ پیسہ ضائع کرنے لگا۔ جوان ہوا تو خوبرو، دلیر اور مرنے مارنے کے سدا تیار نکلا۔ کوئی اس کے منہ نہیں آتا تھا۔ اُس نے چند مہینوں سے مال کو یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ اس کے لیے غلطی کا رشتہ مانگے۔ مال اس لڑکی کو گھر نہیں لانا چاہتی تھی کیوں کہ اُسے وہ بد چلن سمجھتی تھی۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ غلطی کی بد چلنی کس طرح تھی اور کس کے ساتھ تھی۔ اُس نے کہا وہ بہت ہی منہ پھٹ، چلبلی اور بے حیا لڑکی تھی۔ مقتول کے متعلق اس نے کہا کہ لوگ کہتے تھے کہ اس کے ساتھ لڑکی کے تعلقات ٹھیک نہیں تھے۔ مال کی رائے یہ تھی کہ اس بد معاش لڑکی نے اُس کے بیٹے کو بھی اپنے جال میں پھانس لیا تھا۔ وہ بیٹے کی یہ ضد پوری کرنے کی بجائے خود کشی کے لیے تیار تھی مگر بیٹا کہتا تھا کہ اس لڑکی کا رشتہ کوئی اور لے گیا تو میں گھر سے چلا جاؤں گا یا خود کشی کر لوں گا۔

مال اپنے بیٹے کے ہاتھوں مجبور ہو گئی۔ اسے بہت سمجھایا۔ یہ بھی کہا کہ

رید کر دے چکا ہے۔ میں نے اور بہت سے غیر اہم سے سوال کر کے اُسے
تک کی رات بتائی اور پوچھا۔ ”اُس رات عبدو کہاں گیا تھا؟ تمہیں کچھ
ناکر گیا ہوگا؟“

”مجھے تو وہ کبھی بھی بتا کر نہیں جاتا“ اس نے جواب دیا۔ ”اس
رات بھی مجھے بتائے بغیر نکل گیا تھا“ اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر
پوچھا۔ ”مجھے اللہ کی قسم ہے داروغہ بیٹے! حسنین کے قتل کے ساتھ تو
اس کا تعلق نہیں ہے؟“ میں نے ہنس کر اُسے تسلی دی کہ نہیں،
عبدو بے چارہ کسی کو کیا قتل کرے گا۔ میں نے اُسے دیکھا ہے۔ وہ تو
بھولا بادشاہ ہے۔ مال فوراً مان گئی اور اُس نے مجھے بہت سی دعائیں
دے ڈالیں۔

”مجھے معلوم ہے وہ اُس رات نکل گیا تھا“ میں نے کہا اور پوچھا۔
”وہ برجھی گھر سے لے گیا تھا؟“

”ہاں جی!“ ماں نے کہا۔ ”اُس کی برجھی بڑی خوبصورت ہے“
”اُس کا بچھل تین دھارا ہے“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ”جوان
آدمی کے ہاتھ میں برجھی اچھی لگتی ہے“ ابتدا میں تو اس عورت نے
مجھے پریشان کیا تھا لیکن اسے میری زبان کا کمال کہہ لیں یا ماں کے پیار
کی انتہا کہ اُس پر میرا جادو چل گیا۔ وہ اپنے ہاتھوں بیٹے کو مچھانسی کے
نچتے پر کھڑا کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”وہ واپس بہت دیر سے آیا ہوگا؟“
”بہت دیر سے آیا تھا“ ماں نے جواب دیا۔

فاطمی کا سوتیلے باپ بہت ہی بدنام آدمی ہے، مگر بیٹے کی ضد کے آگے
ماتا جھک گئی۔ اس نے فاطمی کی ماں سے رشتے کی بات کی تو وہ فوراً
ماں گئی لیکن یہ بھی کہا کہ اس کے خاوند سے وہ خود بات کرے۔ ماں
نے فاطمی کے سوتیلے باپ سے بات کی تو اُس نے بھی ہاں کر دی۔ اس سے
عبدو کی ماں کو یہ افسوس ہوا کہ فاطمی کے ماں باپ نے خدا کا شکر ادا کیا ہے
کہ کسی نے فاطمی کا رشتہ مانگا ہے۔ ماں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ گاؤں کا
کوئی گھر اس لڑکی کا رشتہ لینے پر آمادہ نہیں تھا۔ رشتہ طے ہو گیا پھر منگنی
ہوتی۔ ماں نے بیٹے کے ساتھ جائز پہلے منگنی کی انگوٹھی خریدی جو اُس
نے لڑکی کو پہنائی تھی.... یہاں میں نے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔
”عبدو نے مجھے بتایا ہے کہ انگوٹھی ذرا کھلی تھی“ ماں نے اس کی
تائید کی اور کہا۔ ”لڑکی نے کہا تھا کہ انگوٹھی کھلی ہے۔ کام کرتے
گرنے کا ڈر ہے۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ شادی کے بعد دوسری بنوا
دیں گے یا یہ تبدیل کر والیں گے“

”انگوٹھی اُسی وقت بدلوا لیتے“ میں نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے
کہا۔ ”کہیں ایسا نہ ہو کہ گر کر گم ہی ہو جائے۔“
”ہمیں“ ماں نے کہا۔ ”لڑکی ہوشیار ہے۔ اُس نے انار کر رکھ
لی ہوگی۔ سونا کون گم کرتا ہے؟“

اس جواب سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ ماں کو انگوٹھی کے گم ہونے
کا علم نہیں اور اُسے یہ بھی علم نہیں کہ اس کا بیٹا فاطمی کو دوسری انگوٹھی

”نہ تم نے اس کے کپڑے دیکھے تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں!“ ماں نے کہا۔ ”بھیگے ہوئے تھے۔ کہتا تھا چھپر میں گر پڑا تھا۔“

صاف ظاہر تھا کہ اُس نے خون سے لہترے ہوئے کپڑے چھپڑا ندی میں دھوئے اور بچوڑ کو پہن لیے تھے۔ میں نے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میں تفتیش نہیں کر رہا اور مجھے اس کے بیٹے کے ساتھ دلچسپی ہے، میں نے کہا۔ ”اتنی ٹھنڈ میں بے چارہ پانی میں گر پڑا تھا۔ اُسے گرم دودھ پلا دینا تھا۔“ مجھے بالکل توقع نہیں تھی کہ یہ عورت مجھے راز کی ایک اور بات بتا دے گی۔

”وہ رکا نہیں“ ماں نے کہا۔ ”برجھی اندر رکھ کر اس نے کپڑے بدلے اور پھر باہر نکل گیا تھا۔“

”پھر کب واپس آیا تھا؟“

”بہت دیر بعد۔“

اس کے بعد ماں نے کام کی کوئی اور بات نہ بتائی۔ مجھے اب یہ معلوم کرنا تھا کہ ٹرنک کہاں سے آیا تھا۔ ٹرنک ریسٹ ہاؤس میں رکھا تھا۔ میں نے اس عورت کو یہ ٹرنک دکھا کر پوچھا۔ ”اچھی طرح دیکھو۔۔۔ یہ ٹرنک تمہارے گھر کا تو نہیں؟“ میں نے دیکھا کہ وہ پہلے چونکی۔ اُسے یاد آ گیا ہو گا کہ حسین کی لاش ٹرنک سے برآمد ہوئی تھی۔ یہ تو سارے گاؤں کو پتہ چل گیا تھا۔ اُس نے میری طرف دیکھا تو اُس کے چہرے

کاتاثر ہلا ہوا تھا۔ اس نے سرکوشی میں پوچھا۔ ”حسین کی لاش اس ٹرنک سے نکلی تھی؟“

”تم لاش کو بھول جاؤ نا؟“ میں نے پیار سے کہا۔ ”اس ٹرنک کو پہچانو۔ تمہارا لاش کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“

”نہیں داروغہ بیٹے!“ وہ میرے سامنے دونوں ہاتھ بٹھکائی اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ”میرا بیٹا حسین کا قاتل نہیں۔ وہ تو عبد و کا دوست تھا۔ لڑکے ہائے اکٹھے کھیلتے تھے۔“ اُس کے آنسو بہنے لگے۔ میں نے اسے سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر وہ بے قابو ہو چکی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں اس سے بھیدے رہا ہوں۔ میں جان گیا کہ یہ ٹرنک اسی کے گھر سے گیا ہے ورنہ اس کی یہ حالت نہ ہوتی۔

میرے ذہن میں ایک بات آگئی۔ میں نے کہا۔ ”اس ٹرنک میں لاش عبد و نے نہیں ڈالی تھی۔ تمہارے گھر سے یہ ٹرنک چوری ہوا ہے۔ قاتل نے اس میں لاش ڈالتے کے لیے تمہارے گھر سے اٹھوایا ہے۔ میں نے قاتل کو پکڑ لیا ہے۔ تم گھبراؤ نہیں۔“

”میں کیوں نہ گھبراؤں؟“ اس نے ہاتھ ملتے ہوئے اور روتے ہوئے کہا۔ ”یہ ٹرنک تو عبد و خود لے کر گیا تھا۔“

مختصر یہ کہ گھنٹے بھر کی جج جج کے بعد یہ راز کھلا کہ عبد و جب بھینگے ہوئے کپڑے اتار کر اور برجھی رکھ کر پھر باہر نکلا تھا تو وہ یہ ٹرنک اٹھا لے گیا تھا۔ ٹرنک پرانا تھا۔ ایک کوٹھڑی میں پڑا تھا۔ اُسی دن کی بات

ہے کہ عبدو نے ماں سے کہا تھا کہ وہ یہ ٹرنک مرمت کرا کے اسے روٹن کرائے گا۔ ماں یہ سمجھتی رہی کہ وہ ٹرنک کسی کو مرمت کے لیے ویسے گیا ہے لیکن ماں نے یہ نہ سوچا کہ اتنی رات گئے گاؤں میں ٹرنک کون مرمت کرے گا۔ عبدو بے ٹرنک ایک خوشخوار قبیلے کا فرد تھا جس میں قتل کوئی بڑی واردات نہیں سمجھی جاتی تھی لیکن وہ عادی قاتل نہیں تھا۔ انسان انسان کا خون کر کے نیم پاگل ہو جاتا ہے۔ عبدو کے دماغ کی حالت یہی ہو گئی تھی۔ اسی حالت میں اُس نے ماں کے سامنے ٹرنک اٹھایا اور باہر نکل گیا۔ اُس کے دماغ نے اتنا سا بھی ساتھ نہ دیا کہ اس کی ماں کے منہ سے بات نکل سکتی ہے۔ وہ میں نے ٹھکوالی۔

ماں۔ ”یہ سب بد معاشی میری ماں کی ہے۔ وہ مجھ سے بدلہ لے رہی ہے۔“
 ”کیسا بدلہ؟“ میں نے پوچھا۔ ”تم نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟“
 وہ جھجھک گئی۔ میں نے اُسے سٹھایا اور پیار سے کہا۔ ”گھبراؤ میں۔ کوئی قیامت نہیں آگئی۔ لیکن اس کی گھبراہٹ بڑھتی گئی۔ میں ایک بار پھر پوچھا۔ ”ماں تم سے کس گناہ کا بدلہ لینا چاہتی ہے؟“
 ”وہ مجھ سے جلتی ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”ابو مجھ سے پیار لے ہیں۔ ماں کہتی ہے کہ تم انہیں باپ نہیں سمجھتی۔“ میں اُس کی زبردستی افزائی کرتا رہا۔ وہ اپنی صفائی میں بولتی رہی۔ میں نے آہستہ آہستہ اُس کے دماغ پر قبضہ کر لیا۔

لڑکی حوالات میں

”سنو لڑکی!“ میں نے اُسے کہا۔ ”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ باپ سمجھتی ہو یا نہیں یا وہ تمہیں بیٹی سمجھتا ہے یا نہیں۔ وہ تمہارا دین ایمان ہے۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمہاری پہلی انگوٹھی بے پاس ہے۔ باہر دو آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ انگوٹھی انہیں اس جگہ ملی تھی جہاں عبدو نے حسین کو قتل کیا تھا۔ تم وہاں موجود تھیں۔“
 ”کے وقت تم نے اپنے کپڑے خود دھوئے تھے۔ کیوں؟“ میں نے پوچھا۔
 ”ہر دو میں جھوٹ بول رہا ہوں، میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔“

اُس نے انکار نہ کیا لیکن اقرار بھی نہ کیا۔ وہ سر جھکا کر سوچ میں پڑ گئی۔ ابھی سوچ میں پڑ گیا۔ میرے سامنے سوال یہ آ رہا تھا کہ یہ لڑکی مقتول

ماں کو باہر بھیج کر میں نے فاطمی کو بلایا اور اُسے کہا۔ ”تم اب گھر نہیں جاسکو گی، حوالات میں جاؤ گی۔“
 اُس نے آہستہ سے کہا۔ ”کیدل؟“
 میں نے جواب دیا۔ ”کیونکہ تم نے عبدو کے ساتھ مل کر حسین کو قتل کیا اور اُس کی لاش ٹرنک میں بند کی ہے۔“

وہ سر سے پاؤں تک اس طرح کانپی جیسے کسی نے اس کے جسم کے ساتھ بجلی کے ننگے تار لگا دیے ہوں ہر لڑم کی طرح اس نے انکار کیا،

تارے گواہی دیا کرتے ہیں۔ مجھے ستاروں کی گواہی مل گئی ہے۔
 ”میں نے حسین کو قتل نہیں کیا۔“ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔
 اُس نے دو تین ایسی باتیں کہیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس پر عبور
 و نون سوار ہے یا ابھی اس میں انہی دلیری باقی ہے کہ پولیس سے اور سزا
 نہیں ڈرتی۔ میں رسیٹ ہاؤس کے صاف ستھرے اور سجے ہوئے کمرے
 گفتیش کر رہا تھا جہاں انگریز انفر قیام کیا کرتے تھے۔ اس کمرے کا اثر
 باہر نہیں تھا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر فاطمی کو اُس کے حوالے کیا اور
 کہ اسے نکھانے لے جاؤ اور حوالات میں بند کر دو۔ تب وہ ٹڑپی اور
 تھکاؤں مارنے لگی۔ اسے ہیڈ کانسٹیبل نے گھسیٹ کر باہر نکالا اور
 میل کر رسیٹ ہاؤس سے باہر لے گیا۔ اس کا سونپلا باپ دوڑ کر اندر
 اور مجھ سے پوچھا۔ ”اُسے کہاں بھیج رہے ہو؟“ میں نے جواب
 دیا۔ ”جہاں وہ عمر کے چودہ سال گزارے گی؟“

”اس کا قتل کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“ اس نے پوچھا۔
 ”تم بھی اس کے ساتھ جانا چاہتے ہو؟“

غصی سی بحث کے بعد وہ موم ہو گیا اور ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔
 ”آپ کی منہ مانگی خدمت کر دل گا۔ میری عزت بچائیں۔ میں عزت دار
 ہوں۔ اپنے منہ سے کہیے۔ میں ابھی قدموں میں رکھ دوں گا۔“
 میں نے اُسے باہر نکال دیا۔ وہ دوڑتا ہوا رسیٹ ہاؤس کے احاطے
 ابڑا آیا میں نے بند کر دیا۔ اُس کے ساتھ کوئی اور بات نہ کی۔ سرن یہ کہا۔

کو پابندی تھی، اس لیے یہ تو مہو ہی نہیں سکتا کہ اُس نے اُسے قتل
 ہو۔ ہوا یہی ہے کہ عبور اس کا منگیتر ہے۔ اس نے لڑکی کو حسین
 کے ساتھ دیکھ لیا اور حسین کو قتل کر دیا۔ لڑکی نے حسین کو بچانے کا
 کوشش کی جس میں اس کے کپڑوں پر خون پڑا۔ یہ کپڑے اس نے
 خود دسوئے۔ میں لڑکی پر یہ ظاہر نہیں کرنا پاتا تھا مجھے اہل
 معلوم نہیں۔ میں نے اُسے کہا۔ ”زیادہ نہ سوچو فاطمی! میں تمہاری
 کردل گا۔ مجھے معلوم ہے کہ قتل تم نے نہیں کیا۔ مقتول کو برچھیاں
 نے ماری ہیں۔ تم وہاں سرن موجود تھیں۔ مجھے تمام واقعہ کا علم ہے۔ اُسے
 خود مجھے سنا دو گی تو تمہاری بچت کی صورت پیدا کر دوں گا، ورنہ پورا
 ہو گا کہ تمام گواہ عدالت میں بیان دیں گے تو عدالت تمہیں جھوٹے
 نہیں۔ اس وقت میرے ہاتھ میں ہے کہ تمہیں سچانے کے لیے جس کا
 کو پابوں توڑ دوں۔۔۔ بولو۔ ہر ایک بات مجھے سنا دو۔“

وہ کتنی ہی دلیر اور بے حیا کیوں نہ ہوتی، اتنے بڑے جرم کا اعتبار
 کرنا آسان نہیں۔ وہ آخر لڑکی تھی۔ عورت ذات تھی۔ اُس نے بولنے
 کوشش کی تو اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ وہ اقبالی جرم سے انا
 کی رہی تھی۔

وہ عبور کہاں ہے؟۔ اُس نے پوچھا۔ ”اُس نے آپ کو کچھ بتایا ہے؟“
 ”مجھے اس سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ میں نے کہا۔“ جب
 کوئی انسان کسی انسان کو رات کے وقت چھپ کر قتل کرتا ہے تو آسمان

کہا۔ ”اتحالی بیان دو گے یا عدالت میں اپنے خلاف گواہوں سے یا سنو گے؟“ اس نے جواب دیا۔ ”میں نے کیا جرم کیا ہے؟“
 میں نے ایک کانٹیل کو بلایا۔ اُسے کان میں کہا کہ اسے تھانے لے جا کر حوالات میں بند کر دو اور اسے زمانہ حوالات کے سامنے گزارنا تاکہ یہ دیکھ لے کہ فاطمی بھی قید ہو چکی ہے۔ کانٹیل اُسے لے اور میں یہ سوچنے بیٹھ گیا کہ مجھے کس قسم کی شہادت اور کیسے کیسے ثبوت کی ضرورت ہے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ فاطمی اور عبدو اقبالی بیان دیں گے۔ اگر دے بھی دیتے تو بھی ثبوت کی ضرورت تھی۔ آئہ قتل و واردات کے وقت کے کپڑے برآمد کرنے تھے۔

لڑکی کی کہانی، باپ کا گناہ

میں اسی سوچ میں غرق تھا اور مسلسل کام کرنے سے دماغ ہلکا ہوا رہا تھا۔ میں نے ذرا اونگھنے کا ارادہ کیا تو کنور دیوان سنگھ آگیا۔ پھر اُس نے مبارک باد دی کہ میں نے اتنی جلدی ملزم پکڑ لیے ہیں۔ آدمی چلا گیا تھا۔ مجھے موڈ میں لا کر اُس نے فاطمی کی وکالت شروع کر دی۔ پھر اس نے سوتیلے باپ کو بہت ہی باعزت انسان ثابت کرنے کی کوشش کی۔ یہ اس کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ رشوت لینا اور مجھے حصہ دینا چاہتا تھا۔ اس کی نظر لڑکی پر بھی تھی۔ اُس نے بڑے اچھے انداز سے مجھے ایم۔ بی۔ ڈی کی دوستی کا بھی رعب دیا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے نفیثش مکمل کر لینے اور یہ بھی یاد رکھو کہ ایم۔ بی۔ ڈی کے اوپر بھی کوئی افسر ہے اور اُس کے اوپر خدا کی ذات بھی ہے۔ اگر اس کا ڈر نہ ہوتا تو میں تمہاری بات مار

میں رات دو بجے کے بعد تھانے گیا۔ تینوں ڈوم وہیں بند تھے۔ مجھے دیکھ کر بلبلا اٹھے۔ وہ تو بے گناہ رگڑے جا رہے تھے۔ ان کی نجات کا وقت آ گیا تھا۔ میں نے انہیں تسلی دی اور بتا دیا کہ مجرم پکڑے گئے ہیں۔ ان سے فارغ ہو کر فاطمی کو حوالات سے نکالا اور نفیثش کے کمرے میں لے گیا۔ یہ بہت غلیظ کمرہ تھا۔ میں نے لڑکی سے پوچھا۔ ”تم نے کیا سوچا ہے؟ اپنی زبانی ساری کہانی سناؤ گی؟“
 اس کا دم ٹوٹ چکا تھا۔ تھانے، پولیس، حوالات اور جرم کی دہشت معمولی نہیں ہوتی۔ اتفاقاً یہ جرم کرنے والے اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ کنور سی لڑکی گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ اُس نے کنور

میں نے اپنے مخصوص انداز سے اس کے ذہن اور دل سے سزا کا خوف
 اُتار دیا اور سہمہ روانہ بالوں سے اُسے آزادی سے ہر بات اگنے کے لیے
 دلیر بنا دیا۔ وہ جوں جوں بولتی گئی اُس کے چہرے پر سکون اور اطمینان آنا
 گیا۔ یہ لڑکی ایک نفسیاتی کیس تھا۔ جن حالات نے اسے نفسیاتی مریض بنایا
 تھا وہ تفصیل سے سننا ضروری ہیں۔ اس کی اقبالی کہانی یوں ہے:

اس نے اپنے باپ کے گھر میں ہوش سنبھالا تو اس نے محسوس کیا کہ
 باپ اس کا دشمن ہے۔ کچھ پیار ملا تو صرف ماں سے ملا۔ باپ نے اسے
 گھر میں قبول ہی نہیں کیا۔ اس سے بھول کر بھی پیار نہ کیا۔ وہ جب اچھی بُری
 باتیں سمجھنے کے قابل ہو گئی تو اس کے کانوں میں یہ الفاظ پڑے کہ لڑکی بھتی
 اور نحوست کی نشانی ہوتی ہے۔ فاطمی کی ماں کو اس کا باپ کبھی کبھی اس
 لیے مار پیٹ ڈالتا تھا کہ اس نے اس کے لیے بیٹا پیدا نہیں کیا۔ لڑکی باپ
 کے اس ظالمانہ سلوک میں چھ سات سال کی ہو گئی تو اُس کا بھائی پیدا ہوا۔
 باپ بچے کے ساتھ پیار کرنے لگا لیکن بچے کی ماں کے ساتھ اور بچی کے
 ساتھ اُس کا رویہ وہی رہا۔ سچی جب باپ کو دیکھتی تھی کہ اُس کے پاس تو
 بہت سا پیار ہے لیکن وہ صرف بچے کو دے رہا ہے تو اس کے دل پر تڑپیں
 پڑتی تھیں۔ بچی کا ذہن ایک اور وجہ سے بھی خراب ہوا۔ وہ باہر نکلتی اور
 کھیلتی تھی تو کوئی نہ کوئی عورت یا مرد یہ کہتا ہوا گزر جاتا تھا کہ کتنی پیاری
 بچی ہے۔ کبھی کبھی کوئی اس کے سر پر بھی ہاتھ پھیر جاتا تھا۔ گھر میں اس کے
 لیے بھٹکا تھی اور باہر پیار۔ وہ اور سیانی ہوئی تو اُسے سہیلیوں نے بھی

دیوان سنگھ کے متعلق کہا۔ ”یہ دارد غم کہتے ہیں کہ آپ کو کوئی بات نہ
 بتاؤں، آپ کہتے ہیں ساری بات بتا دو“ میں نے اُسے بتایا کہ یہاں
 کا دارد غم ہندو ہے۔ وہ تمہیں مسلمان لڑکی جان کر جیل خانے بھجوانے
 کی کوشش کر رہا ہے۔ میں مسلمان ہوں۔ مجھے ساری بات بتا دو گی تو
 فائدے میں رہو گی.... میں اُس کی اُس وقت کی ذہنی حالت سمجھتا تھا۔ یہ
 مجرم کی بہت بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ میں نے رعب اور تشدد کی بجائے
 پیار اور سہمہ رمدی کا سرمایہ استعمال کیا اور جن بالوں کا مجھے علم ہو چکا تھا
 وہ اشاروں اشاروں میں اُسے بتانا رہا۔ ان اشاروں کا اثر گہرا تھا۔ اُسے
 یہ پتہ چل گیا کہ میں واردات سے پوری طرح واقف ہوں، حالانکہ میں پوری
 طرح واقف نہیں تھا۔

”قتل میں نے نہیں کیا“ اُس کے منہ سے ایسے نکل گیا جیسے وہ خواب
 میں بڑبڑا رہی ہو۔

”کس نے کیا ہے؟“

”عبدونے“

”اُس نے تمہیں حسین کے ساتھ دیکھ لیا ہوگا“

”نہیں“ اُس نے کہا۔ ”میں حسین کو عبدو کے ہاتھوں مروانا چاہتی تھی۔

اسے میں نے مروایا ہے“

میں اننا مضبوط آدمی تھا مگر یہ سن کر کانپ گیا۔ اس لڑکی نے اُس آدمی
 کو جسے وہ پابندی تھی اُس آدمی سے مروایا جیسے وہ پسند ہی نہیں کرتی تھی۔

کہنا شروع کر دیا کہ وہ بہت پیاری ہے، بہت خوبصورت ہے۔

علم نفسیات کو سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ جس بچے کے ذہن پر دو متضاد اثرات پڑتے رہیں اس کی نفسیاتی حالت کیا ہوتی ہے۔ انسان کا پیار لگتا ہے خواہ کہیں سے بھی ملے۔ جس بچے کے لیے بھٹکار اور دھتکار ہے وہ پیار کا اور زیادہ پیاسا ہوتا ہے۔ فاطمی بھی باہر پیار ڈھونڈنے لگی۔ اس باپ باہل تھا جو اپنی بیٹی کے ساتھ نفرت کر کے یہ ثابت کر رہا تھا کہ وہ غیر متدہ ہے مگر یہ نہیں دیکھ رہا تھا کہ اس کی بیٹی پیار کی تلاش میں کہاں کہاں ماری ماری پھر رہی ہے اور یہ پیاس اُسے کتنا بے غیرت بنا دے گی یہ میرا ذاتی مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ جن گھروں اور برادریوں میں لڑکیوں کو بوجھ اور بے غیرتی کی نشانی سمجھا جاتا ہے ان کی لڑکیاں چال چلن کے لحاظ سے تم نہیں ہوتیں اور جن گھروں میں لڑکیوں کو لڑکوں کے برابر سمجھا جاتا ہے اور انہیں پیار کا پورا حصہ دیا جاتا ہے وہ اپنے گھر کی عزت پر مبنی ہیں۔

فاطمی نے میرے گردنے پر بتایا کہ باغ نیچر سال کی عمر میں اُس نے لڑکوں کے ساتھ پیار کا کھیل کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ میری رائے یہ ہے کہ اُس نے بکاری کو ہی پیار سمجھ لیا تھا۔ اس عمر میں اس کا باپ مر گیا جس کا فاطمی کو کوئی افسوس نہیں ہوا۔ اس کی بجائے خوشی ہوئی کہ اسے آزادی مل گئی۔ دو اڑھائی سال بعد اس کی ماں نے دوسری شادی کر لی۔ اسی کے لگ بھگ اس کا دوستانہ حسین (مقتول) سے ہو گیا تھا۔ سونیل باپ اہر اور شراب خور تھا۔ اُس نے فاطمی کو بہت پیار دیا۔ اتنا پیار کہ اُس نے

سکے باپ کی نفرت کے زخم ٹھیک کر دیئے، مگر یہ پیار ایک بدکار، اور بے غیرت آدمی کا دھوکہ کھلا۔ فاطمی جوان ہو چکی تھی۔ وہ سوتیلے باپ کی نیت بھانپ گئی لیکن اسے باپ ہی سمجھتی رہی۔ اس باپ نے اسے رشتہ کی پٹریں اور زیورات سے اندھا کرنا شروع کر دیا۔ آخر ایک رات لڑکی کو شربت میں شراب پلائی اور پھر اُن میں باپ بیٹی کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ باہر حسین کے ساتھ اس کا تعلق بھی اسی قسم کا تھا۔ گھر میں پاکیزگی ختم اور باہر بھی ختم۔ اس کی ماں نے اپنے خاوند کو روکنے کی کوشش کی تو خاوند نے اُس کی بیٹی شروع کر دی۔ بیٹی سے کچھ کہا تو بیٹی نے اس کی بے عزتی کر دی۔

جہاں تک دل کا تعلق تھا فاطمی کو حسین اچھا لگتا تھا۔ وہ اس کا ہم عمر تھا۔ یہ بڑی ہی شدید محبت تھی مگر جسمانی۔ میرے بے شمار سوالوں کے جواب میں اس نے جو انکشاف کیے۔ ان سے میں نے بے رائے فائدہ کی طرح غالب آپ کے تھے۔

ب. پی. سی۔ اس پر جوانی جذبات پاگل پن یا مانیجوریا کی طرح غالب آپ کے تھے۔ یہ بڑی ہی خطرناک کیفیت ہوتی ہے۔ میں نے حیوانیت کے بہت سے جرم دیکھے ہیں۔ اگر آپ کو ان کی وارداتیں سناؤں تو آپ تسلیم نہیں کریں گے کہ کوئی انسان جسے خدا نے انثرت المخلوقات کا درجہ عطا کیا ہے، اتنا درندہ بھی ہو سکتا ہے۔ فاطمی اس حد میں داخل ہو گئی تھی لیکن اس نے پیار اور تسکین کا ذریعہ حسین کو بتایا اور کچھ کچھ سونیلے باپ کو کسی اور کوہرات نہیں ہوتی تھی کہ اس سے اٹھی سیبھی بات کرے۔ اس کی دلیری مشہور ہو گئی تھی اور منہ پھٹ ایسی کہ مروائے دیکھ کر راستہ چھوڑ دیتے تھے۔

اس سے ذرا پہلے عبدو کی ماں نے فاطمی کا رشتہ مانگ لیا جو اُسے دے دیا گیا۔ فاطمی نے عبدو کو صاف کہہ دیا کہ وہ نکاح میں اسکا کر دے گی اور اگر نکاح ہو گیا تو وہ ایسی حرکتیں کرے گی کہ وہ اُسے طلاق دے دے گا یا قتل کر کے بھانسی چڑھے گا اور اگر اُس نے طلاق نہ دی تو اُسے ساری عمر چین نہیں لینے دے گی۔ اس نے عبدو کو یہاں تک کہہ کر وہ اُسے زبرد سے کر مار ڈالے گی۔ ان دھمکیوں سے عبدو کی مردانگی جواب دے گئی۔ کسی مرد کی یہ بے عزتی اُسے خودکشی پر آمادہ کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے کہ نکاح کے وقت لڑکی اُسے قبول کرنے سے انکار کر دے۔ عبدو نے اس کی منت سماجت کی مگر فاطمی نہ مانی۔

محبت اور موت کی آخری ملاقات

اتنے میں حسین کی شادی طے ہو گئی۔ فاطمی کی اُس نے یہ بات نہ مانی کہ کہیں بھاگ چلیں۔ حسین کی شادی سے دو تین روز پہلے فاطمی اس سے ملی اور رو رو کر اُسے منوانے کی کوشش کی کہ کہیں بھاگ چلیں فاطمی نے اس کی گردن دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی جو حسین نے بڑی مشکل سے چھڑائی۔ حسین کو غصہ آ گیا۔ ان میں جھگڑا ہوا۔ حسین نے غصہ میں اُسے کہا کہ تم بے عزت لڑکی ہو۔ تمہاری خاطر میں اپنے چچا کی شریف بیٹی کو کیوں چھوڑ دوں۔ تم تو اُس کی بھی بیوی ہو جسے لوگ تمہارا باپ سمجھتے ہیں۔

موت عبدو نہ تھا جس نے اُسے دوستی کے لیے کہا۔ یہ نوجوان اپنے رنگ کا دلیر تھا۔ خویر دھبی تھا، گاؤں میں اس کا رعب بھی تھا اور اُس کے گھر میں دانے اور پیسے بھی تھے۔ فاطمی نے اُسے دھتکار کر دھمکی دی تو عبدو نے بھی دھمکی دی۔ یہ قصہ حسین کے قتل سے چار پارچہ مہینے پہلے کا ہے۔ عبدو نے بے دھمکی بھی دی کہ وہ حسین کو قتل کر کے اس کی لاش غائب کر دے گا۔ فاطمی نے حسین کو بتایا۔ حسین نے عبدو کو چیلنج کیا۔ دو یاران کی لڑائی بھی ہوئی۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ فاطمی نے عبدو کو قبول نہ کیا۔ عبدو اور حسین کی دشمنی پکی ہو گئی۔ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ حسین کی شادی چچا کی بیٹی کے ساتھ طے ہوئی تو فاطمی نے اُسے شادی سے روکا۔ حسین نے اُسے بتایا کہ اس نے اپنی ماں سے بات کی تھی لیکن وہ نہیں مانی۔ باپ بھی نہیں ماننا کیونکہ چچا کی لڑکی کو باہر نہیں دیا جا سکتا۔ فاطمی نے اُسے کہا کہ چچا کہیں بھاگ چلیں۔ حسین نے اسے کہا کہ بھاگ کر کہاں جائیں گے؟ ان پڑھ دیہاتی اپنے گاؤں اور برادری میں ہی رہ سکتے ہیں مگر فاطمی کی عقل پر حیوانیت سوار تھی۔

”میں جب سوچتی تھی کہ حسین کسی اور لڑکی کا ہو جائے گا تو میرا چہرہ سخت گرم ہو جاتا تھا؟“ فاطمی نے ان الفاظ میں اپنے اُس وقت کے جذبات بیان کیے۔ ”میری کھوپڑی میں کیڑے چلنے لگتے تھے اور میں پکا ارادہ کرتی تھی کہ اس لڑکی کو زندہ نہیں چھوڑوں گی جو حسین کو اپنا خاوند کہے گی“

فاطمی یہ چوٹ برداشت نہ کر سکی۔ وہ عبدوسے ملی تو عبدو نے حسب معمول اس کی منت کی کہ وہ اُسے قبول کرے۔ فاطمی پاگل ہو چکی تھی۔ اُس نے عبدوسے کہا کہ وہ اس شرط پر اُسے قبول کرے گی کہ وہ حسین کو قتل کر کے لاش اس طرح غائب کر دے کہ وہ پکڑا نہ جائے۔ فاطمی نے یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ ساری عمر اس کی غلام رہے گی۔

عبدو کے دل میں پہلے ہی حسین کے خلاف عداوت بھری ہوئی تھی۔ فاطمی کی محبت، دیہات کی جہالت اور قبیلے میں خون خرابے کی روایات نے عبدو کو فوراً تیار کر لیا اور حسین کو قتل کرنے کی ایسی ترکیب سوچنے لگا جس میں وہ پکڑا نہ جاسکے۔ حسین کی شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد ایک بار فاطمی نے حسین کو اُس جگہ آنے کو کہا جہاں اُن کی ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ حسین آ گیا۔ ان کی ملاقات کی جگہ یہی تھی جہاں حسین قتل ہوا۔ حسین نے اُسے کہا کہ اب وہ اُسے نہیں ملا کرے گا۔ عبدو اُسے کسی بھی وقت قتل کر سکتا تھا، لیکن پکڑے جانے کے ڈر سے نہ کر سکا۔ دو مہینے گزر گئے۔ اس دوران حسین اور فاطمی کی ایک اور ملاقات ہوئی۔ آخر عبدو کو یہ ترکیب پسند آئی کہ فاطمی حسین کو اسی جگہ بلائے، عبدو اُسے قتل کرے گا اور لاش ٹرنک میں بند کر کے رات کی گاڑی میں رکھ آئے گا۔

فاطمی کے بیان کے مطابق وہ بہت خوش تھا کہ لاش دنیا کے دوسرے سرے تک جا پہنچے گی اور کسی کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ یہ کس کی لاش ہے۔ عبدو نے کہا کہ وہ اُسے برجھی سے مارے گا۔ فاطمی نے کہا کہ وہ اسے پکڑے

لی اور عبدو اس کا گلا دبا کر مار ڈالے گا۔ اس طرح خون نہیں نکلے گا، مگر عبدو اسے مردوں کی طرح مارنا چاہتا تھا۔ کہتا تھا کہ تم اُسے پکڑو اور میں ملا دوں، یہ مردوں کا کام نہیں۔ لہذا برجھی سے قتل کا منصوبہ طے ہو گیا۔ قتل کے روز فاطمی نے حسین پر نظر رکھی۔ وہ اُسے گھر سے نکلتا نظر آیا تو فاطمی نے اُسے روک کر بتایا کہ آج رات نلال وقت آجانا، میں تمہارے پاؤں پکڑ کر معافی مانگوں گی، پھر تمہیں کبھی تنگ نہیں کر دوں گی۔ حسین دھوکے میں آ گیا۔ فاطمی نے عبدو کو بتا دیا۔ عبدو نے اُسے بتایا کہ ٹرنک یار ہے۔۔۔ فاطمی کا سوتیلا باپ شام کے وقت اکثر شہر جایا کرتا تھا۔ فاطمی نے اس سے معلوم کر لیا تھا۔ اُس شام اُسے شہر جانا تھا۔ وہ چلا گیا۔ ماں کے ساتھ تو فاطمی کی بول چال پہلے ہی بند تھی۔ ماں جلدی ہو گئی۔ فاطمی نے سوتیلی باپ کی شراب کی بوتل نکالی اور اتنی سی پی لی جس سے اُس کے دل سے دنیا کا غم اور فکر نکل گیا۔ وہ کھیتوں میں لگی۔ پہلے اسے عبدو نظر آیا جو موقع واردات کی طرف جا رہا تھا۔ پھر اسے حسین دکھائی دیا۔ وہ مقرر جگہ کی طرف چل پڑی۔ گاؤں سے دُور جا کر وہ اکٹھے ہوئے۔ حسین نے اُسے کہا۔ ”آج کی ملاقات آخری سمجھو فاطمی! میں یوں کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔“ فاطمی نے جواب دیا۔ ”قسم لے لو۔ آج آخری ملاقات ہوگی۔“

دونوں اس شبی جگہ پر اکٹھے ہو گئے۔ فاطمی اس سے ذرا ہٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی پہلی برجھی حسین کی پیٹھ میں اتر گئی۔ وہ اٹھ کر تیجھے

یہ قیسے کا ریلوے سٹیشن تھا۔ فاطمی نے گھر آ کر دیکھا کہ اس کے کپڑوں پر لاش ٹرنک میں رکھتے کہیں کہیں خون لگ گیا تھا۔ اس نے کپڑے بدلے جو اس نے صبح سویرے دھو لیے۔

کپڑے بدلتے وقت اُس نے دیکھا کہ انگلی میں انگوٹھی نہیں ہے۔ اُس نے ادھر ادھر دھونڈی۔ کہیں بھی نہ ملی۔ شک پکڑا ہو گیا کہ جائے واردات پر لاش ٹرنک میں رکھتے گر پڑی ہوگی۔ دوسرے دن اُس نے عبدود کو دیکھا تو وہ خوش ہوئی کہ وہ پکڑا نہیں گیا۔ اُس نے اُسے بتایا کہ لاش دنیا کے دوسرے سرے پر پہنچ گئی ہے۔ فاطمی نے اسے بتایا کہ انگوٹھی شاید وہاں اتر کر گر پڑی ہے۔ عبدود اُسی وقت وہاں گیا۔ اُسے انگوٹھی نہ ملی۔ وہ دوسری غالباً پہلے ہی انگوٹھی اٹھالے گئے تھے۔ عبدود اُسی سندر کے پاس گیا جس سے انگوٹھی خریدی تھی۔ وہ دوسری انگوٹھی لے آیا۔ کسی کو پتہ ہی نہیں چلا کہ پہلی انگوٹھی گم ہو گئی ہے۔

ریلوے سٹیشن پر خون

فاطمی کا بیان ختم ہونے تک صبح ہو گئی۔ اُسے حوالات میں بند کر کے عبدود کو تفتیش کے کمرے میں بلایا۔ اُس نے انتہائی بیان دینے میں پس پش کی۔ میں نے اُسے فاطمی کے دیئے ہوئے بیان کے بڑے ہی نازک

کو مڑا تو عبدود نے اُس کے پیٹ پر برجھی کے تین وار کیے۔ میرا خیال ہے کہ جو وار دل میں لگا اُس نے اُسے فوراً ختم کر دیا۔ وہ گر پڑا۔ فاطمی نے عبدود سے پوچھا کہ ٹرنک کہاں ہے۔ اس نے بتایا کہ ٹرنک گھر ہے۔ وہ اس لیے ساتھ نہیں لایا تھا کہ ہو سکتا ہے حسین نہ آئے اس صورت میں ٹرنک لانا اور واپس لے جانا ٹھیک نہیں تھا۔ بہر حال یہ جرم حماقت اور جذبات کے زور پر کیا جا رہا تھا۔ پیشہ ور مجرموں کی طرح کوئی سکیم نہیں بنائی گئی تھی۔ عبدود ٹرنک لینے کے لیے چلا تو فاطمی سے کہا کہ وہ قریب کہیں چھپی رہے تاکہ کوئی ادھر سے گزرنے لاش دیکھ لے تو پتہ چل جائے کہ وہ کون تھا۔ لڑکی کی دلیری دیکھنے کہ رات کے وقت گاؤں سے دور اکیلی لاش کے پاس بیٹھی رہی۔ ہلکی ہلکی چاندنی تھی۔ عبدود کے کُرتے پر خون کے چھینٹے تھے۔ برجھی لمبی تھی۔ اس لیے برجھی پر چھینٹے زیادہ تر پڑے۔ قریب ایک چھپڑ تھا۔ عبدود نے کُرتہ انا کر لاس میں دھویا، سچوڑ کر پہنا اور کھر کو دوڑ پڑا۔ فاطمی وہاں چھپی رہی۔ عبدود ٹرنک لے کر آ گیا۔ دونوں نے لاش کو دھرا کیا اور ٹرنک میں ڈالا۔ ٹانگیں دبا کر ڈھکنا بند کر دیا۔ یہ بند نہیں ہو رہا تھا۔ عبدود اُس کے اوپر بیٹھ گیا۔ فاطمی نے کنڈی لگائی عبدود تالا بھی لایا تھا جو ٹرنک کو لگا دیا گیا۔ فاطمی نے چابی چھپڑ میں پھینک دی۔ دونوں نے ٹرنک اٹھایا۔ عبدود نے سر پر رکھ لیا اور وہ ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ فاصلہ ایک میل کے لگ بھگ تھا۔

سے غائب ہو گیا۔

میں اُسے اُس کے گاؤں لے گیا۔ نمبردار اور مشیروں کو ساتھ لے کر
عبدو سے برجھی برآمد کرائی۔ اس کے کپڑے برآمد کیے۔ ماں نے انہیں
ابھی دھویا نہیں تھا۔ عبود نے کرتہ چھپر میں صابن کے بغیر دھویا تھا۔
نون کے نشان ابھی باقی تھے۔ اُس نے جو چادر باندھ رکھی تھی اس پر
بھی چند ایک چھینٹے تھے۔ برجھی کو اس نے ابھی طرح صاف کر دیا تھا۔
اس کا تین دھارا پھل بہت تیز تھا۔۔۔ نمبردار مجھے اپنے گھر لے گیا۔
اُس نے میری اور میرے سات کی بہت پُر تکلف دعوت کی۔ اُس نے
مجھے سے رازداری سے پوچھا۔ ”کیا عبود واقعی حسین کا قاتل ہے؟“
— اس نے میرے ساتھ دیانتداری سے تعاون کیا تھا۔ میں نے اُسے
بتا دیا کہ قاتل عبود ہے اور مقتول کی لاش اس نے اور فاطمی نے ٹرنک
میں ڈالی اور عبود نے رات کی گاڑی میں رکھی تھی۔ میں نے اسے قتل
کی کچھ باتیں بھی بتا دیں۔ مجھے بعد میں احساس ہوا کہ اُسے قبل از وقت
یہ بات بتا کر میں نے غلطی کی تھی۔ وہ نمبردار تھا۔ پولیس کی کارروائی کو
اچھی طرح سمجھتا تھا۔ میں نے اُسے یہ بھی بتا دیا کہ دونوں ملزموں نے
اقبال بیان دے دیا ہے۔

”آپ کو اقبالی بیان مجسٹریٹ کے پاس مکھونا ہو گا۔“ اس نے پوچھا۔
”یہاں تو نہیں ہو سکتا۔ آپ انہیں کب لے جا رہے ہیں؟“
”قصہ چھوٹا تھا۔ اقبالی بیان مجسٹریٹ نے ریکارڈ کرنا تھا۔ وہ سیالیں

حصے سنائے اور کہا کہ یہ لڑکی عدالت میں تمہارے خلاف بیان دے
گی، پھر تمہارے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہے گی۔ اس نے بھی
مجھے بتا دیا کہ کنور دیوان سنگھ نے اُسے کہا تھا کہ اقبال جرم نہ کرتا۔ میں
نے جس طرح فاطمی کے دماغ پر قبضہ کر لیا تھا اسی طرح عبود کو بھی رام
کر لیا۔ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر
اُس نے اقبال جرم کر لیا۔ لاش کو ٹرنک میں ڈالنے تک اس نے وہی کہانی
سنائی جو فاطمی کی زبانی آپ سن چکے ہیں۔ اس سے آگے اُس نے بتایا کہ
ٹرنک بہت ہی وزنی ہو گیا تھا۔ اس نے راستے میں تین جگہ ٹرنک کھڑا
کر کے زمین پر رکھا تاکہ اٹھانے میں آسانی ہو۔ ربوے سٹیشن قصبے سے
باہر تھا۔ وہاں تک پہنچتے اس کی ٹانگیں جواب دے گئی تھیں لیکن فاطمی
کی محبت اور پکڑے جانے کے خطرے نے اُسے ہارنے نہ دیا۔

وہ اندھیرے میں پلیٹ فارم کی دوسری طرف بیٹھ گیا۔ سٹیشن ویران
پڑا تھا۔ سردیوں کی رات تھی۔ ایک گھنٹے بعد گاڑی آئی۔ اس نے پہلے
تو دوڑ کر ایک چھوٹا کمپارٹمنٹ دیکھا جس میں صرف تین مسافر تھے۔
تینوں سوئے ہوئے تھے۔ اُس نے دروازہ کھولا۔ انجن نے دسل دی۔
وہ ڈر گیا کہ ٹرنک گاڑی میں نہیں رکھ سکے گا لیکن ننو مند جوان تھا۔
اُس نے ٹرنک اٹھایا اور انجن کی دوسری دسل پر اُس نے ٹرنک
گاڑی میں رکھا اور دھکیل کر سیٹ کے نیچے کر دیا۔ ٹرنک پوری طرح
سیٹ کے نیچے نہیں گیا تھا۔ وہ چلتی گاڑی سے اُترا اور سٹیشن کی حد

میں نے ارادہ کیا تھا کہ ان ڈوموں کو اس مقصد کے لیے استعمال کروں گا کہ تینوں عدالت میں گواہی دیں گے کہ گاڑی میں ٹرنک عبدالوہاب نے رکھا تھا اور انہوں نے اُسے اچھی طرح دیکھا تھا۔ یہ دراصل جھوٹی گواہی تھی لیکن یہ یقین کر کے کہ یہ شخص قتل کا مجرم ہے، اسے سزا دلانے کے لیے جھوٹی گواہی کا سہارا لینے کی سوچی تھی۔ بعض اوقات قتل کے ملزم استغاثہ کی ذرا سی جھول چوک کی وجہ سے صاف بری ہو جاتے ہیں۔ ڈوموں کو تو اب رہا ہی کرنا تھا۔ میں نے فاطمی اور عبدالوہاب کے اقبالی بیان میں ان سے کہلوایا تھا کہ ان ڈوموں کا ان کے جرم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

میں نے فاطمی کو سوالات سے منکوا دیا۔ دو کانٹیل ساٹھ یے اور ریلوے سٹیشن کو چل پڑا۔ میں نے دیکھا کہ تھانے کے احاطے کے باہر دو دیہاتی کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں برچھیاں تھیں۔ مجھے اور میرے قافلے کو دیکھ کر وہ وہاں سے چلے گئے۔ میں ریلوے سٹیشن پہنچا اور ایک کانٹیل کو پیسے دے کر ٹکٹ لینے کے لیے بھیجا۔ بلیٹ فارم پر میں تھا۔ مجھ سے سات آٹھ قدم دُور عبدالوہاب تھا۔ اُس کی ہتھکڑی کی زنجیر ایک کانٹیل نے پکڑ رکھی تھی۔ فاطمی کانٹیل کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ اچانک پانچ دیہاتی، مسافر خانے سے آئے۔ پانچوں کے ہاتھوں میں برچھیاں تھیں۔ میں نے انہیں آتے دیکھا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ مجھے ان کے ارادے کا علم نہ تھا۔ مجھے ہڑلنگ سنائی دی۔ کانٹیل کی پیکار "ملک صاحب"

میل دُور ضلعی شہر میں تھا۔ میں نے وقت دیکھا۔ تین بج رہے تھے۔ ایک گاڑی سوا چار بجے گزرتی تھی۔ میں نے ذلت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہاں کے تین چار مجسٹریٹوں سے میری بڑی اچھی راہ درسم تھی۔ ان میں سے کسی کے گھر لے جا کر بیان ریکارڈ کروا سکتا تھا۔ مجھے خطرہ یہ نظر آ رہا تھا کہ کنور دیوان سنگھ ملزموں کو گمراہ کر دے گا۔ وہ انہیں سمجھا سکتا تھا کہ وہ مجسٹریٹ کے سامنے جا کر اقبالی بیان دینے سے انکار کر دیں اور یہ بیان دیں کہ اس داروغہ نے انہیں بہت مارا پیٹا ہے اور ڈرا دھمکا کر لایا ہے۔۔۔۔ میں نے نمبردار کو بتا دیا کہ میں ملزموں کو اسی گاڑی سے لے جا رہا ہوں۔

میں اسی وقت گاؤں سے روانہ ہو گیا۔ یکے نے جلدی تھانے پہنچا دیا۔ عبدالوہاب ہتھکڑیوں میں تھا۔ فاطمی کو ہتھکڑی نہیں لگائی جاسکتی تھی۔ عورت کو ہتھکڑی نہیں لگائی جاتی تھی۔ آپ میری خوشی کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں نے کنور دیوان سنگھ کو چیلنج کیا تھا کہ ایک ہفتے کے اندر قاتلوں کو پکڑ لوں گا۔ میں نے چیلنج پورا کر دیا تھا۔ میرے لیے اب شہادت اور ثبوت فراہم کرنے کا مرحلہ تھا۔ اقبالی بیان ریکارڈ کرانے کے بعد مجھے یہ مرحلہ طے کرنا تھا۔ گاڑی میں ٹرنک رکھنے والے آدمی کی شناخت ضروری تھی۔ میرے استغاثہ میں یہ خانہ خالی تھا۔ وہ میں نے اس طرح پورا کر لیا تھا کہ عبدالوہاب کو اسی سوالات میں بند رکھا تھا جہاں تین ڈوم بند تھے۔ انہوں نے عبدالوہاب کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔

انتقام خود لیتے تھے۔ نمبر دار نے انہیں بتا دیا تھا کہ عبد و اور فاطمی کو ریلوے سٹیشن پر لے جایا جا رہا ہے۔

عبد و اور فاطمی کے جسموں کا کون سا حصہ ہو گا جہاں برہمی نہ اتری ہو گی۔ خون پلیٹ فارم سے بہہ کر ریلوے لائن پر گر رہا تھا۔ میں نے کنور دیوان سنگھ کو بلوایا۔ وہ آیا تو میں نے اُسے کہا۔ ”لو کنور جی! یہ کیس آپ کا ہے۔ اب میں آپ کا گواہ ہوں۔ اللہ نے میرے کیس کا یہیں فیصلہ کر دیا ہے“

کنور دیوان سنگھ نے کہا۔ ”ملک صاحب! یہی وجہ ہے کہ میں نے اس کیس سے جان چھڑائی تھی اور یہ آپ کے سر ڈال کر آپ کو ناراض کیا ہے۔ اس قبیلے کا کیس کوئی دل والا اسپیکٹر لیا کرتا ہے“

سنائی دی۔ میں نے گھر کر ادھر دیکھا تو پانچول آدمی برہمیوں سے عبد و اور فاطمی کا قیمہ کر رہے تھے۔ کانسیٹیل نہتہ تھا۔ وہ ہتھکڑی چھوڑ کر کھانا کیا تھا۔ عبد و اور فاطمی پلیٹ فارم پر تڑپ رہے تھے اور پانچول آدمی اُن پر برہمیاں برس رہے تھے۔ میرے پاس ریلوے لور تھا۔ میں نے ریلوے لور نکال کر ہوائیں دو فائر کیے۔

ان پانچول نے ایک ایک دو دو وار مزید کر کے میری طرف دیکھا میں انہیں الگ کرتا ہوا ان تک پہنچ گیا تھا۔ اگر خطرہ ہوتا کہ وہ کسی اڈے پر یا مجھ پر حملہ کر دیں گے تو میں اُن پر ریلوے لور خالی کر دیتا، لیکن انہوں نے برہمیاں میرے آگے پھینک دیں اور میرے سامنے اُن کھڑے ہوئے۔ ایک نے کہا۔ ”ہمیں گرفتار کر لو۔ بھاگیں گے نہیں۔ ہم نے اپنے لڑکے کے خون کا بدلہ لے لیا ہے“

ان میں حسین کے بھائی تھے۔ ایک اُس کا چچا تھا۔ ایک حسین۔ بھائی اور ایک اُس کا مامول۔ تب مجھے پتہ چلا کہ نمبر دار نے مجھ سے یہ کیوں پوچھا تھا کہ کیا عبد و ہی حسین کا قاتل ہے اور اُس نے یہ بھی پوچھا تھا کہ میں انہیں مجسٹریٹ کے پاس کب لے جا رہا ہوں۔ میں نے اُسے صحیح جواب دے کر غلطی کی تھی۔ بعد میں نمبر دار نے مجھے بتا بھی دیا تھا کہ اُس سے حسین کے ان رشتہ داروں کا کہا تھا کہ پتہ کرادو کہ کیا یہ ثابت ہو گیا ہے کہ حسین کا قاتل عبد و ہے؟

زندگی کے میلے

اس بدکار خود ساختہ حکیم
نے چھ بار اس لڑکی کو ہنس کاری
کا نشانہ بنا کر زہر دیا تھا مگر لڑکی
کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ دودھ
میں زہر کی کتنی مقدار ڈالے کہ
وہ فوراً نہ مر جائے۔

روز اُس کے ہاں چلا گیا۔ نھانے میں جا کر طبیعت کو سکون آ گیا۔ میں نے اپنے شاگرد سے کہا۔ ”مجھے حوالات میں بند کر دو، گاؤں میں جی نہیں لگتا۔“

اُس نے مشورہ دیا کہ گاؤں میں جب کبھی طبیعت اچاٹ ہو جائے تو میں کچھ دن اس کے ہاں گزار جایا کروں۔ وہ میرا عزیز دوست تھا۔ اب بھی دوست ہی ہے۔ اونچے عہدے پر پہنچ گیا ہے۔ میں نے یہ معمول بنا لیا کہ آٹھ دس روز بعد اس کے ہاں چلا جانا۔ دفتین دن اس کا بہانہ رہتا۔ وارداتوں اور مقدموں میں دل چسپی لیتا تو طبیعت بحال ہو جاتی۔ ایک بار یوں ہوا کہ میں ایک مہینہ اس کے ہاں نہ گیا۔ ایک روز اس کا ایک کانسٹیبل آیا۔ کہنے لگا کہ خان صاحب بلاتے ہیں۔ اُس نے گھوڑا بھیجا تھا لیکن میں اپنے گھوڑے پر گیا۔ اس نے کہا۔ ”ملک صاحب! آپ کے مہلب کا ایک کیس آیا ہے۔ میں نے اسی لیے آپ کو بلایا ہے۔“ میں نے اس کے ہاں ڈیرے ڈال دیئے۔ یہ قتل کی واردات تھی۔ اس تفتیش کی کہانی سنانے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں خان صاحب کا نام نہیں بتاؤں گا کیونکہ وہ ابھی سروس میں ہیں۔ پولیس کے احکام کے مطابق کسی ایسے افسر کا نام کسی کہانی یا مضمون میں استعمال نہیں ہو سکتا جو ابھی سروس میں ہو۔ ان کے نام کو پوری طرح چھپائے رکھنے کے لیے میں واردات کے موقع اور مقام کی بھی واضح نشاندہی نہیں کروں گا۔ آپ کو دلچسپی کہانی سے ہونی چاہیئے۔ نام اور مقام

کہتے ہیں چور چوری سے باز آ جانا ہے، میرا پھیری سے باز نہیں آتا۔ یہی طرح نھانیدار ریٹائر ہو کر گھر آ جانا ہے مگر نھانیدار ی سے باز نہیں آتا۔ یہی حالت میری تھی جب مجھے ریٹائر کیا گیا۔ اتنا عرصہ نھانیداری کرتے کرتے گاؤں میں آیا تو میرے لیے عام قسم کا شہری بلکہ دیہاتی بن کے رہنا بہت ہی مشکل ہو گیا۔ مثلاً ایک روز بیوی نے مجھے کہا کہ بھینس کا آٹا کھل کر باہر نکل گیا ہے۔ بیوی نے یہ بھی کہا کہ مولیشی جو بڑ میں اتر جاتے ہیں۔ کتا وہیں ہو گا لیکن میں نے گھر سے کتے کا کھرا اٹھانا شروع کیا تو گاؤں سے اُس طرف باہر نکل گیا جس طرف جو بڑ نہیں تھا۔ میں نے کتے کے کھل کر نکل جانے کو حرم و جاسوسی کی واردات بنا دیا اور جب میں سراغ رسانی کی کوئی بہتر لائن سوچتا ہوا گھر آیا تو کتا کھڑی پر بندھا ہوا تھا۔

گاؤں میں سلا دن بیکار پڑے رہنے سے طبیعت اکتا جاتی تھی قریبی نھانہ آٹھ میل دور تھا۔ وہاں میرا ایک شاگرد نھانیدار لگا ہوا تھا۔ ایک

کی موت پوسٹ مارٹم کے وقت سے سولہ سے اٹھارہ گھنٹے (اندازاً) پہلے واقع ہوئی ہے۔ پوسٹ مارٹم دن کے ساڑھے بارہ بجے ہوا تھا۔ اس کے مطابق موت شام ساڑھے چھ سے ساڑھے آٹھ بجے کے درمیان واقع ہوئی ہوگی۔ عورت کے جسم پر تشدد کا کوئی نشان نہیں تھا اور نہ اس کی عزت پر حملہ ہوا تھا۔

آدھی رات کے لگ بھگ ایک پنچر ٹرین گزرا کرتی تھی جس کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ ٹائم ٹیبل میں اس کا وقت گیارہ بج کر سبائیس منٹ تھا لیکن گاڑی ٹائم ٹیبل کی پابند نہیں تھی۔ پاکستان بن چکا تھا۔ آزادی کا پچوتھا سال تھا۔ ریلوے کا محکمہ بھی آزاد ہو گیا تھا۔ گاڑیوں کے اوقات کی پابندی ختم ہو چکی تھی۔ خان صاحب ریلوے سٹیشن سے پتہ کر دیا کہ تھے۔ پنچر ٹرین رات بارہ بج کر سترہ منٹ پر سٹیشن سے روانہ ہوئی تھی۔ جائے واردات پر بارہ بج کر پچیس یا ستائیس منٹ پر پہنچی ہوگی۔ اس سے پہلے شام چھ بج کر بیس منٹ پر ایک انجن جس کے ساتھ گاڑی صرف ایک دین تھی سٹیشن سے رن ٹھہر رہا تھا۔

اس وقت تک چونکہ سورج غروب نہیں ہوا تھا اس لیے ممکن نہیں تھا کہ دن کی روشنی میں ناقابلے لاش لائن پر رکھی ہوگی۔ اگر مقتولہ جیتی جاگتی گاڑی کے نیچے آئی ہوتی تو قریب کے کھیتوں میں کام کرنے والے اور گزرنے والے لوگ اس کٹی ہوئی لاش کو دیکھ لیتے لیکن خون موجود نہ ہونے سے کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ عورت کو قتل کر کے پانچ چھ گھنٹے بعد لاش

کو آپ کیا کریں گے۔ خان صاحب ہی کافی سمجھے۔ پولیس میں بے شمار نشان صاحب، ملک اور چوہدری ہیں۔

واردات یہ تھی کہ ایک برلچ لائن سے رات کے وقت ایک پنچر گاڑی گزرا کرتی تھی۔ صبح کے وقت ریلوے لائن پر ایک جوان عورت کی لاش دیکھی گئی۔ سر لائن سے باہر دھڑ سے کٹا پڑا تھا اور دھڑ دونوں لائنوں کے درمیان پڑا تھا۔ میں جب خان صاحب کے پاس پہنچا تو لاش کا پوسٹ مارٹم ہو چکا تھا اور لاش وارٹوں کے حوالے کی جا چکی تھی۔ میں لاش کو ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک آدمی مقتولہ کے گاؤں بھیجا کہ لاش کو ابھی دفن نہ کریں لیکن لاش دفنائی جا چکی تھی۔ خان صاحب نے دو چیزیں نوٹ کی تھیں۔ ایک یہ کہ خن کا ایک قطرہ بھی موقعہ واردات پر نظر نہ آیا۔ دوسری یہ کہ لاش کی گردن پر سے ریل کا پہیہ گزرا تھا۔ اس سے یہ ثبوت ملتا تھا کہ اس عورت کو کسی اور طریقے سے غالباً گلا دبا کر قتل کیا گیا پھر لاش ریلوے لائن پر اس طرح رکھ دی گئی کہ گردن لائن کے اوپر رکھی گئی۔

اگر یہ حادثہ ہوتا تو مقتولہ کے جسم کے کئی ٹکڑے ہو جاتے۔ صرف گردن کٹنے سے یہ کہا جاسکتا تھا کہ مرنے والے نے خودکشی کی ہے لیکن اس صورت میں دہاں بہت خون ہونا چاہیے تھا۔ خون کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ڈاکٹر نے خون کی غیر موجودگی اور لاش کا کٹاؤ اور اندر دینی اور اسے کٹے کٹے دیے تھے۔ مقتولہ

لائن پر رکھی گئی ہوگی۔ جسمانی اکڑاؤ سے ڈاکٹروں نے اسے دی کہ وہ رات بارہ بجے نہیں بلکہ پانچ بجھ گھنٹے پہلے مری ہے۔

گاڑی کے نیچے آنے کا وقت معلوم کرنے کے لیے میں اور خان صاحب سٹیشن ماسٹر سے جا ملے اور اُسے کہا کہ وہ اس انجن کے ڈرائیور کا نام اور پتہ معلوم کر دے جو کارڈ دین کو لے کے شام چھ بج کر بیس منٹ پر رکن ٹھہر رہا تھا، اور پیسنجر ٹرین کے ڈرائیور کا بھی۔ سٹیشن ماسٹر جہان ساد می تھا اور ذہین معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے جواب دیا۔ اگر آپ نہ آتے تو بھی میں آج رات یہ اطلاع دینے میں پہنچا دیتا کہ عورت کون سے ڈرائیور نے ماری ہے۔ وہ انجن جو بریک دین لے کے گیا تھا، تقریباً ایک گھنٹہ بعد واپس آ رہا ہے۔ اسے روک لوں گا۔ لوگوں نہیں دوں گا۔ پیسنجر ٹرین کا جو ڈرائیور تھا وہ کل صبح ساڑھے آٹھ بجے یہاں سے واپس گزرے گا۔ وہ ادھر جانے والی پیسنجر ٹرین لارہا ہے۔“

ڈرائیور نے لاش دیکھی تھی

تفتیش بڑا ہی صبر آزما کام ہوتا ہے۔ اکثر اوقات ایک معمولی سی ضمنی بات معلوم کرنے کے لیے رات رات جاگنا پڑتا ہے، لمبے لمبے سفر کرنے پڑتے ہیں، در در، گلی گلی جھک مارنی پڑتی ہے۔ دماغ ماؤت اور جسم ٹوٹ جاتا ہے۔ اس جھک جھک سے بچنے کے لیے پولیس دو طریقہ استعمال

کیا کرتی ہے۔ ایک وعدہ معات گواہ اور دوسرا تھوڑا ڈگری طریقہ یعنی پھینٹی۔ اگر مشتبه دو یا اس سے زیادہ ہوں تو ان میں سے ایک کو لاپرواہ اذیت یا دونوں دے کر وعدہ معات گواہ بنایا جاتا ہے۔ اگر مشتبه ایک ہی ہو تو اُسے اس قدر اذیت دی جاتی ہے کہ وہ اقبال جرم کر لیتا ہے۔ پاکستان نے تفتیش اور سراغ رسانی میں تو کوئی ترقی نہیں کی، اذیت دینے کے طریقوں میں حیران کن ترقی کی ہے۔ اکثر اوقات بے گناہ بھی اس تشدد کا نشانہ بن جاتے ہیں۔

میرے عزیز دوست اور شاگرد کے لیے بھی آسان طریقہ یہ تھا کہ مقتولہ کے خاوند اور دیگر مشتبه افراد کو بلا کر تھوڑا ڈگری والی پھینٹی چڑھانے تو تفتیش آسان ہو جاتی مگر ان میں میرے والی خرابی تھی۔ وہ کسی بے گناہ کو محض شک کی بنا پر پریشان کرنا تو درکنار تھانے بلانا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

ہم ریلوے سٹیشن پر انتظار کرتے رہے۔ جس انجن کو ایک گھنٹہ بعد آنا تھا وہ پونے دو گھنٹے بعد آیا۔ اس کے ڈرائیور نے بتایا کہ اس کے انجن کے نیچے کوئی عورت نہیں آئی۔ البتہ اس نے یہ املشات کیا کہ رات والی پیسنجر ٹرین کا ڈرائیور اُسے آخری سٹیشن پر ملا تھا۔ اُس نے اس کے ساتھ ذکر کیا تھا کہ رات اُس کی گاڑی کے نیچے ایک عورت کٹ گئی ہے۔

دوسری صبح ہم ساڑھے آٹھ بجے پھر ریلوے سٹیشن چلے گئے۔ گاڑی خامی دیر بعد آئی۔ وہی ڈرائیور تھا۔ سٹیشن ماسٹر نے اسے اپنے دفتر میں

قریب پہنچا تو وہ لائن پر بیٹھ گیا۔ اُس کا جسم قیمہ ہو گیا تھا۔ پھر ایک بار جانبدار سے تین میل دور اُس نے ایک آدمی کو لائن کے ساتھ اُس سمت باتیں دیکھا جس سمت اس کی گاڑی جا رہی تھی۔ ڈرائیور نے دِسل دی لیکن اس آدمی نے دھیان نہ دیا۔ انجن قریب پہنچا تو اس آدمی نے اپنے آپ کو لائن پر پھینک دیا۔ اس کے جسم کے درمیان سے دِگلے سٹھے۔ یہ دونوں دارو آئیں خودکشی کی تھیں مگر اس عورت کے متعلق اس کی رائے یہ تھی کہ وہ زندہ ہیں بلکہ مردہ تھی، درنہ وہ کچھ تو حرکت کرتی۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی پاگل ہو۔

ہم نے ڈرائیور کا بیان لکھ لیا اور اسے گواہوں کی فہرست میں شامل کر دیا۔ گاڑی کے نیچے آنے کا وقت رات ساڑھے بارہ بجے لکھا گیا۔ ڈاکٹر کی رائے کے مطابق موت اس سے چار سے چھ گھنٹے پہلے واقع ہوئی تھی۔ مقتولہ کے متعلق خان صاحب نے جو معلومات فراہم کیں، ان کے مطابق وہ شادی شدہ تھی۔ شادی ہوئے ایک سال گزر گیا تھا۔ وہ مہاجر تھی۔ خاندان بھی مہاجر تھا۔ موت کے وقت اس کی عمر تیس سال تھی۔ رپورٹ درج کرانے اس کا خاندان آیا تھا۔ اس نے بیان دیا تھا کہ وہ صبح اٹھا تو بیوی بستر پر موجود نہیں تھی۔ وہ دونوں چھت پر سوئے تھے۔ خاوند نے سوچا کہ بیوی اس سے پہلے جاگ کر کام کاج میں لگ گئی ہوگی۔ نیچے آیا تو اُسے معلوم ہوا کہ بیوی نیچے نہیں آئی۔ سورج طلوع ہو رہا تھا تو گاڑی کے ایک آدمی نے آکر اطلاع دی کہ فلاں عورت ریلوے لائن پر کٹی پڑی ہے۔ سارا

بلایا۔ ہمارے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ وقوع کی رات اس سٹیشن پر تین منٹ رک اس نے گاڑی چلائی۔ سٹیشن سے کوئی ڈیڑھ میل دور انجن کی روشنی میں اُسے ریلوے لائن پر کوئی لیٹا ہوا نظر آیا۔ ڈرائیور کو وہ اُس وقت نظر آیا جب انجن اور اس آدمی کے درمیان پچیس تیس گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ گاڑی روکی نہیں جاسکتی تھی۔ اس نے کم فاصلے پر بریک لگانا خطرناک تھا۔ گاڑی رفتار کم کر چکی تھی۔ ڈرائیور نے بار بار دِسل بجائی مگر اس آدمی نے کوئی حرکت نہ کی۔ انجن قریب پہنچا تو ڈرائیور نے غور سے دیکھا۔ لائن پر آدمی نہیں بلکہ عورت تھی۔

ڈرائیور انجن کی روشنی میں تھوڑے سے وقت میں جو کچھ دیکھ سکا وہ یہ تھا کہ عورت کے کپڑے رنگ دار تھے۔ اس کے سر سے دوپٹہ بٹا ہوا تھا۔ اس کی گردن لائن پر تھی۔ سر نیچے کو ڈھلکا ہوا تھا۔ دھڑاندی کی طرٹ تھا۔ لاش پیٹھ کے بل تھی۔ دونوں بازو پہلوؤں کے ساتھ تھے۔ انجن اس کے اوپر سے گزر گیا۔ گاڑی میں ڈبلوں میں سے جو روشنی باہر آ رہی تھی اس میں ڈرائیور کو عورت کا سر کھٹ کر گرتا نظر آیا تھا۔

یہ پرانا ڈرائیور تھا۔ میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اس نے بتایا کہ اس کی ساری سروس میں یہ پانچواں انسان اس کی گاڑی تلے آیا ہے۔ ایک آدمی اپنی بھینس کو لائن سے ہٹاتے انجن کی زد میں آ گیا تھا۔ دوسرا اٹاری کے قریب بند پھانک سے گزرتے گاڑی کے نیچے آ گیا تھا۔ امرت سر سے آگے ایک آدمی ریلوے لائن کے قریب کھڑا تھا۔ انجن

گاؤں دوڑ پڑا۔

دھڑکیٹھ لگا۔ وہ جواب ڈھونڈ رہا تھا۔ کچھ کہنے لگا مگر ہکا کر چپ ہو گیا۔ میں نے اُسے کہا: ”گھبراؤ نہیں یار، ہم یہ تو نہیں کہتے کہ تم نے اسے قتل کیا ہے۔ اگر تم اُسے مارتے پیٹتے تھے تو بتا دو۔ ہم کھلیں گے۔ تمہاری بیوی نے خاتمی حالات سے تنگ آکر خودکشی کر لی ہے۔“

اس کا حوصلہ ٹھکانے آ گیا۔ کہنے لگا: ”پہلے تو وہ میرے ساتھ بہت خوش تھی۔ کوئی تین مہینوں سے اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اسے غصہ آ جاتا تھا اور لڑ پڑتی تھی۔ ایک مہینہ گزرا اس نے میری ماں کی بے عزتی کر دی تو میں نے اسے بہت پیٹا تھا۔ اس کے بعد میں نے اسے دو دفعہ پیٹا تھا۔ مرنے سے تین چار روز پہلے اس نے مجھے کہا تھا کہ میں کچھ کھا کر مرجائوں گی۔ میں نے توجہ نہ دی کیونکہ میں اُسے اتنا دیر نہیں سمجھتا تھا۔“

وہ ہمارے ان سوالوں کا کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا کہ ایک سال میں وہ نو مہینے خوش اور مطمئن رہی مگر آخری تین مہینے اس کا رویہ کیوں بدل گیا؟ ہم نے یہ بھی پوچھا کہ کیا اُس کے علم میں کوئی ایسی بات تھی کہ اس کی بیوی نے کسی اور کے ساتھ تعلقات پیدا کر لیے ہوں اور اس کے رویے کی تبدیلی کا باعث یہی تعلقات ہوں؟

اُس نے چر زور طریقے سے کہا کہ اُسے اپنی بیوی پر ایسا کوئی شک نہیں تھا اور نہ وہ اس قسم کی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ایک سال میں اس کی بیوی میں نیچے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اُس نے دیہاتیوں

لاش کے دھڑ پر چادر ڈال دی گئی اور کٹے ہوئے سر کو بھی دھانپ دیا گیا۔ خاوند تختانے چلا گیا۔ خان صاحب موقع پر پہنچے اور جو کارروائی کرنی تھی وہ کر کے لاش پوسٹ۔ مرٹم کے بے بھجوا دی۔ خاوند نے خان صاحب سے تین بار کہا کہ اُس کی بیوی نے خودکشی کی ہے۔ خان صاحب نے اُسے یہ تاثر دیا کہ وہ مان گئے ہیں کہ اس کی بیوی نے خودکشی ہی کی ہے۔ خان صاحب نے مجھے بتایا کہ خاوند اس طرح ہنسی خوشی تھانے سے نکلا جیسے کسی طالب علم نے بڑا مشکل پرچہ صحیح حل کر دیا ہو۔ خان صاحب نے اسے تھوڑی دیر خوش رہنے کے لیے آزاد کر دیا۔

ریلوے سٹیشن سے ڈرائیور کا بیان لے کر ہم تختانے میں گئے تو مقتول کے خاوند گاؤں کے نمبردار اور مقتول کے باپ کو بلا بھیجا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آگئے۔ سب سے پہلے خاوند کو اندر بلایا۔ اسے ہم نے ڈرانے دھمکانے کی بجائے درستانہ طریقے سے بٹھایا۔ وہ دیہاتی آدمی تھا۔ عمر چھبیس اور اٹھائیس کے درمیان، شکل و صورت اور گفتگو سے پتہ چلتا تھا کہ ہے تو دیہاتی لیکن سیدھا سادا نہیں۔ اس سے خان صاحب نے پہلا سوال یہ پوچھا: ”تم نے اتنے یقین سے کس طرح کہہ دیا ہے کہ تمہاری بیوی نے خودکشی کی ہے؟ کیا وہ گھر میں پریشان رہتی تھی؟ تم اسے مارتے پیٹتے تھے؟ یا کوئی اور وجہ تھی؟“

میں اُس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اس پر صاف تبدیلی آئی اور وہ ادھر

لاش کے پاؤں اور جوتی۔

ایک راز

کیا یہ آدمی (مقتولہ کا باپ) اتنا شریف یا کمزور تھا کہ وہ اپنے داماد کچھ کہنے سے ڈرتا تھا؟ دیہات کے لوگ تو ان باتوں پر ایک دوسرے کے رکھول دیتے ہیں۔ ذرا سی بے مزگی پیدا ہو جائے تو شادی شدہ بیٹیوں کو گھر بٹھا لیتے ہیں۔ میں نے اس پر سوال کرنے کی بجائے اس کے اس کیسے کی تقریب شروع کر دی اور ایسی درستانہ باتیں کیں کہ وہ بھول ہی گیا کہ وہ تھا۔ میں دو تھانیاں اوروں کے ساتھ بیٹھا ہے۔ اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے۔ ”ایک روز میری بیٹی روتی ہوئی گھر آئی۔ خاوند نے اُسے بہت پیٹا تھا اور اُس نے یہ بھی کہا کہ خاوند مجھے طلاق دینا چاہتا ہے۔ پھر بھی میں نے اُسے واپس بھیج دیا تھا۔ وہ نہیں جاتی تھی۔

اُس نے اُسے زبردستی گھر سے نکال دیا۔“
”تم نے بہت اچھا کیا۔ ہمیں نے اُس کی پیٹھ تھپکاتے ہوئے کہا درپو چھا۔“ اپنے داماد کے متعلق تمہاری رائے کیا ہے؟ وہ کسی دوسری عورت کے جال میں تو نہیں پھنس گیا تھا؟“

”میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن وہ ایسا آدمی نہیں۔ مارے چوٹے سے گاؤں میں کوئی ایک بھی عورت ایسی نہیں جو خراب اپن کی ہو۔“

کی طرح جواب دیا۔ ”یہ تو اللہ کی مرضی ہے۔“ میں نے اس ضمن میں بہت کر دیا۔ ہیر پھیر کر سوال کیے مگر اس کے منہ سے کام کی کوئی بات نہ نکلی اسے ہم نے باہر نکال دیا۔

میں نے خان صاحب کو منورہ دیا کہ اس کی ماں کو بلا لیں۔ اس دوران ہم نے مقتولہ کے باپ کو اندر بلا دیا۔ اس نے بتایا کہ وہ ہندوستان کے مہاجر ہیں۔ ان کی تقریباً ساری برادری اس گاؤں میں آباد ہوئی ہے ایک سال گزرا اس نے اپنی بیٹی (مقتولہ) کی شادی اس آدمی کے ساتھ کر دی۔ لڑکی آٹھ نو مہینے بہت خوش رہی۔ بہنتی کھیلتی آتی اور بہنتی کھیلتی سسرال جاتی تھی۔ تین چار مہینوں سے وہ پریشان نظر آنے لگی تھی۔ پہلے تو اس نے کچھ نہ بتایا۔ ڈیڑھ ایک مہینہ ہوا اس نے اپنی ماں کو بتایا تھا کہ خاوند نے اسے مارا ہے۔ اس کے بعد اس نے کئی بار اپنی ماں کو بتایا کہ خاوند اس کے ساتھ بہت برا سلوک کرتا ہے۔

”تم نے یا تمہاری بیوی نے کبھی اپنی بیٹی کے خاوند سے پوچھا تھا کہ وہ اُسے کیوں مارتا پیٹتا ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”کبھی نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ہم اپنی بیٹی کو سمجھاتے رہے کہ وہ خاوند کی مرضی کے مطابق چلے اور اسے ناراض نہ ہونے دے۔“

”تمہیں اپنی بیٹی کے چال چلن کے متعلق یقین ہے کہ ٹھیک تھا؟“
خان صاحب نے ہم پھینکا۔

وہ بدگ گیا اور گھبراہٹ کے لہجے میں اُس نے کہا۔ ”جی جی ہاں! اس کا چال چلن بہت اچھا تھا“

میں اپنی کہانیوں میں آپ کو ہنسا چکا ہوں کہ بعض حالات میں ہم مشتبه افراد کی باتیں کم سنتے ہیں اور چہروں کا اتار چڑھاؤ زیادہ دیکھتے ہیں۔ میں اس اتار چڑھاؤ کو بیان نہیں کر سکتا۔ یہ مہارت تجربے اور شاہد سے حاصل ہوتی ہے۔ اس آدمی نے مجھے شک میں ڈال دیا۔ اگر اس کی بیٹی کا چال چلن ٹھیک تھا تو کوئی اور گڑبڑ ہوگی اور یہ گڑبڑ جو کچھ بھی تھی وہ اس آدمی کے سینے میں چھپی ہوئی تھی۔ اگر ریلوے لائن پر خون ہوتا تو اسے خودکشی کی واردات سمجھ لیا جاتا۔ خودکشی کا باعث خانگی تنازعہ لکھ دیا جاتا لیکن اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ مقتولہ قتل ہوئی تھی۔ قتل کا باعث رقابت بھی ہو سکتا تھا۔

میں نے مقتول کے باپ سے پوچھا۔ ”تمہاری بیٹی کا رشتہ کسی اور نے بھی مانگا تھا؟“

اس سوال کا جواب ’ہاں‘ یا ’نہیں‘ ہوتا چاہیے تھا لیکن یہ شخص بوکھلا گیا۔ میں نے اپنا مخصوص طریقہ اختیار کیا۔ وہ یہ تھا کہ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور چپ چاپ اسے ٹکٹلی باندھ کر دیکھتا رہا۔ اُس نے سوائے ہکانے کے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر بالکل ہی چپ ہو کر میرے

منہ کی طرف دیکھنے لگا لیکن میری آنکھوں کا سامنا نہ کر سکا۔ کبھی بائیں دیکھتا کبھی دائیں اور جب میری طرف دیکھتا تو اس کے ہونٹ کانپتے مگر آواز نہ نکالتی.... میں ڈریٹھ دو منٹ اسے ٹکٹلی باندھ کر دیکھتا رہا۔ آخر اس کی ٹھوڑی ختم کر میں نے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا اور نرم سے لہجے میں پوچھا۔ ”تم کیا چھپانے کی کوشش کر رہے ہو؟“

”کچھ نہیں حضور!“ اُس نے جیسے گہری نیند سے جاگ کر کہا ہو۔ آپ سے کیا چھپا سکتا ہوں؟“ اور اچانک اُس کے آنسو نکل آئے اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

میں اور خان صاحب اُسے دیکھتے رہے۔ اُسے تسلی دلا سہ نہ دیا۔ روتے روتے اُس نے کہا۔ ”اللہ کسی عزت دار کو بیٹی نہ دے“

اس کے بعد ہم نے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی مگر اس نے کام کی کوئی بات نہ بتائی۔ خان صاحب نے اس سے پوچھا کہ اس نے یہ کیوں کہا ہے کہ اللہ کسی کو بیٹی نہ دے۔ اس کا جواب اس نے فوراً دیا۔ اُس نے کہا۔ ”اگر میری بیٹی نہ ہوتی تو آپ مجھ سے یہ نہ پوچھتے کہ تمہاری بیٹی کا چال چلن کیسا ہے اور اس کا رشتہ کسی اور نے مانگا تھا یا نہیں“

اس کی یہ بات میرے دل میں اتر گئی۔ میں نے سوچا کہ عزت دار کمزور آدمی ہوتا ہے پھر بھی ہم نے اسے تقیظ سے خارج نہیں کیا۔ اُسے باہر بیٹھنے کو کہا۔ وہ چلا گیا تو خان صاحب نے مجھ سے کہا۔ ”ملک صاحب! آپ

نے ٹھیک کہا تھا کہ اس شخص نے کچھ چھپا لیا ہے مگر آپ اس کے رونے سے دم ہو گئے۔“

”وہ ابھی کیا کہاں ہے؟“ میں نے کہا۔ ”یہیں تو ہے۔ ذرا اسے دم لینے دو۔۔۔ مقتولہ کی سانس کو اندر بلاؤ۔“

وہ اچکی تھی۔ اُسے اندر بلایا اور پوچھا کہ اس کا بیٹا اپنی بیوی کو مارتا پٹیتا کیوں تھا؟ اُس نے جواب دیا کہ لڑکی منہ پھٹ ہو گئی تھی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ آٹھ ذمینیہ وہ ٹھیک تھا کہ رہے، پھر وہ لڑنے جھگڑنے لگے جتان صاحب نے اُس سے پوچھا۔ ”وہ رات کہاں سوتے تھے؟“

اُس نے جواب دیا۔ ”چھت پر۔“

”جس رات تمہاری بہو غائب ہوئی اُس رات یاد نہ کو بھی خاوند نے اُسے پٹیا تھا؟“ خان صاحب نے پوچھا اور سانس نے نفی میں جواب دیا۔

”پھر سوچ کر بتاؤ۔“ خان صاحب نے کہا۔ ”تمہیں اچھی طرح یاد ہے کہ تمہاری بہو تمہارے بیٹے کے ساتھ چھت پر گئی تھی اور وہیں سوئی تھی؟“

”سوچنا کیا؟“ سانس نے کہا۔ ”درازن اور اندر پر سوتے تھے۔“

رات کو تم نے چھت پر سے کسی کو اترتے نہیں دیکھا؟“ خان صاحب نے پوچھا اور اُسے یوں لقمہ دیا۔ ”تمہاری بہو رات کو آٹھ کر ریلوے لائن پر پہلی گئی تھی۔ وہ کس طرف سے اتری ہوگی؟“

”اُسے ہاں۔“ بڑھیا نے چونک کر کہا۔ ”صبح سویرے میرا بیٹا جاگا

اور باہر نکل گیا۔ فوراً واپس آ گیا۔ اُس نے سیڑھی اٹھا رکھی تھی۔ میں بھینس چارہ ڈال رہی تھی۔ میں نے پوچھا کہ بیٹا! یہ سیڑھی کہاں سے لائے ہو؟“

س نے غصے سے کہا کہ یہ سیڑھی باہر کس نے رکھی تھی؟ بڑی مشکل سے یہ چیزیں بنتی ہیں۔ پھر اُس نے اپنی بیوی کے متعلق پوچھا تو میں نے اُسے ہا کہ وہ تو ابھی ادھر سے ہی نہیں آئی۔ میرے بیٹے نے جبران ہو کر کہا کہ وہ دپر تو نہیں ہے۔ پھر اس نے پوچھا کہ یہ سیڑھی اُسی نے تو باہر نہیں رکھی تھی؟ اپنے بیٹے کی گھبراہٹ دیکھ کر مجھے فکر پیدا ہوئی۔ صحن کے اندر سے سیڑھیاں ادھر جاتی ہیں۔ میں ادھر گئی تو ہوا واقعی بسنر نہیں تھی۔ اُس نے جوتی اُس کی چار پائی کے ساتھ پڑی تھی۔ میرا بیٹا اسے دیکھنے کے لیے ہر نکل گیا۔ میں نے چھت پر کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ شاید کہیں کھیتوں کا نظر آجائے۔ کسی سے پوچھتے بھی شرم آتی تھی۔ سورج نکلنے والا تھا، باب گاؤں میں شور مچا ہو گیا کہ میری بہو ریلوے لائن پر کٹی پڑی ہے۔

”وہ کام کاج کے وقت ننگے پاؤں رہتی تھی یا جوتی پہنے رکھتی تھی؟“

ان صاحب نے پوچھا۔ میں بہت دیر سے خاموش بیٹھا تھا۔

”وہ ننگے پاؤں رہنے کی عادی نہیں تھی۔“ اُس نے جواب دیا۔

گھر میں کبھی جوتی اتار دے تو اتار دے۔ باہر جوتی پہن کر نکلا کرتی تھی۔“

خان صاحب آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگے۔ اچانک بیدار ہو گئے۔

اس عورت کو باہر بیٹھنے کو کہا۔ وہ چلی گئی تو خان صاحب نے مجھے کہا۔

”مقتولہ کی جوتی اس کی چار پائی کے ساتھ پڑی تھی لیکن وہ ریلوے

سے پہلے لاش کندھوں پر اٹھائی اور صحن کی طرف والی سیڑھیوں سے اس ڈر سے نہ اترا کہ گھر والے جاگ اٹھیں گے۔ اس مقصد کے لیے اُس نے مکان کے پیچھے یا پہلے کے ساتھ سیڑھی رکھی ہوئی تھی۔ اس سے اُترا اور لاش ریلوے لائن رکھ آیا۔ مقتولہ کو لٹایا اٹھا کر لے جایا گیا تھا جس کا ثبوت یہ تھا کہ لاش کے پاؤں صاف سنکھڑے تھے۔۔۔۔ یہاں دو چیزیں پیش نظر رکھئے۔ دیہات کے مکان کچے ہوتے ہیں۔ بلندی بالکل معمولی۔ دوسری چیز یہ کہ گاؤں کے لوگ اتنے تھکے ہوتے ہیں کہ شام کا اندھیرا گہرا ہوتا ہے ہی سو جاتے ہیں۔

یہ امکان اب خارج از بحث تھا کہ مقتولہ خود چھت سے اتری اور ریلوے لائن پر لیٹ گئی۔ اگر ایسا ہوتا تو اُس کے پاؤں میں جوتی ہوتی یا اس کے پاؤں گرد آلود ہوتے۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ خاوند لہری نیند سو یا رہا۔ ایک یا دو آدمی آئے۔ لڑکی کو اٹھایا اور چھت سے اتر گئے پھر اسے ہلاک کر کے ریلوے لائن پر رکھ دیا۔ لیکن یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق موت کا جو وقت بتایا گیا تھا۔ اس وقت کوئی آدمی حرات نہیں کر سکتا کہ چھت پر چڑھ کر کسی کی بیٹی اٹھا لے جائے۔ اگر اسے زندہ اٹھا کر لے جایا جاتا تو اس پر مجرمانہ حملہ ضرور ہوتا۔

کی روشنی میں واردات کا نقشہ یوں بنتا تھا کہ خاوند نے کسی وقت بیڑی لڑیے واردات ہوئی تو مقتولہ کا خاوند اور اس کا باپ مہزور کسی خود مکان کے باہر رکھی۔ شام کے بعد چھت پر بیوی کا کلا گھونٹ کر ہٹک کا اٹھا کر تے۔ ہمارے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ ان کی کسی ہلاک کیا۔ لاش چارپائی پر پڑی رہنے دی۔ رات گاڑی کے وقت کے ساتھ دشمنی نہیں ہے کہ ان پر ایسا سخت وار ہوتا کہ ان کے گھر کی

لائٹ تک اپنے پاؤں پر چل کر نہیں گئی۔ میں نے لاش بڑی غور سے دیکھی تھی۔ اس کی ساس نے ٹھیک کہا ہے کہ وہ ننگے پاؤں چلنے کی عادی نہیں تھی۔ گاؤں کی عورتوں کے پاؤں کندھے سے اور بجا سے ہوتے ہیں۔ یہ تو معمولی سی قسم کے کسان ہیں لیکن مقتولہ کے پاؤں صاف سنکھڑے تھے۔ اگر وہ ننگے پاؤں چل کر ریلوے لائن تک گئی ہوتی تو اس کے پاؤں ٹخنوں تک گرد سے اٹے ہوئے ہوتے۔ ان پر گرد کا نشان بھی نہیں تھا۔

میں نے تو لاش دیکھی ہی نہیں تھی۔ خان صاحب اُن دانشمند مختا نیداروں میں سے تھے جو لاش کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہیں۔ اکثر اوقات کوئی ایسا نشان یا اشارہ مل جاتا ہے جو نفیث میں بہت مدد دیتا ہے۔ کبھی کبھی لاشیں خاموش زبان میں مجرم کی نشان دہی کر دیا کرتی ہیں۔ اس لاش نے ایسی ہی گواہی دے دی تھی۔ اب کڑیاں لانا ہمارا کام تھا۔ تین چیزیں ہمارے توجہ اور سوچ بچار کا مرکز بن گئیں جوتی جو چھت پر پڑی رہی۔ سیڑھی جو مکان کے باہر باچھوڑے لگائی گئی تھی اور لاش کے پاؤں جو صاف سنکھڑے تھے۔

یہ تینوں چیزیں مقتولہ کے خاوند کے گرد گھومتی تھیں۔ ان معلومات کی روشنی میں واردات کا نقشہ یوں بنتا تھا کہ خاوند نے کسی وقت بیڑی لڑیے واردات ہوئی تو مقتولہ کا خاوند اور اس کا باپ مہزور کسی خود مکان کے باہر رکھی۔ شام کے بعد چھت پر بیوی کا کلا گھونٹ کر ہٹک کا اٹھا کر تے۔ ہمارے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ ان کی کسی ہلاک کیا۔ لاش چارپائی پر پڑی رہنے دی۔ رات گاڑی کے وقت کے ساتھ دشمنی نہیں ہے کہ ان پر ایسا سخت وار ہوتا کہ ان کے گھر کی

عورت کو ہی اٹھالے جاتے۔

لڑکی بھوک کی تھی

میں نے اور خان صاحب نے سوچ بچار کر کے فیصلہ کیا کہ خاوند کے گھر کی تلاشی لی جائے اور اُسے سزا سنائی جائے۔ میں سیڑھی کو ذرا اچھی طرح دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ قتل کے بعد کا دوسرا دن تھا۔ سورج غروب ہونے میں ابھی گھنٹہ بھر باقی تھا۔ ہم نے ان سب کو جنہیں خانا نے بھڑا رکھا تھا، ساتھ لیا، چند ایک کانسٹیبل ساتھ لیے اور مقتولہ کے گاؤں چلے گئے۔ خاوند کی نشان دہی پر ہم اس کے گھر میں داخل ہوئے۔ میں نے سب سے پہلے اس کی ماں سے کہا کہ وہ سیڑھی نیچے دکھائے جو اُس کا بیٹا صبح کے وقت باہر سے اٹھا لایا تھا۔ سیڑھی صحن میں پڑی تھی۔ عجیب ادٹ پٹانگ سی سیڑھی تھی۔ اس میں بانس بھی تھا، درختوں کی ٹیڑھی اور موٹی دو خشک ٹہنیاں بھی اور تین ڈنڈے دیوار کے بھی تھے۔ کہیں سے موٹا کیل باہر نکلا ہوا اور مڑا ہوا تھا اور جو ڈنڈے درختوں کے تھے ان پر کئی کئی توکیں تھیں۔

میں نے سیڑھی کو بڑی غور سے دیکھا اور اسے نیچے والے دوسرے ڈنڈے اور لمبے (بازو والے) ڈنڈے کے درمیان دو بال اٹکے ہوئے تھے۔ زناہ بال تھے کیونکہ لمبے تھے۔ ان سے میں نے ذہن میں یہ تصویر قائم کیا۔ مقتولہ کی لاش قاتل نے کندھے پر اس طرح اٹھائی کہ اس کا سر نیچے

دشمنی کی بجائے اس چھوٹے سے گاؤں میں اتفاق تھا۔ اتفاق ہی ایسا کہ خان صاحب کے منبر کوئی راز کی بات نہ لاسکے۔ گاؤں میں چند گھر مقامی لوگوں کے تھے، باقی مہاجرین کے جو سب ایک ہی برادری کے تھے۔ مقامی اور مہاجر مل جل کر رستے تھے لیکن دونوں اپنے کلچر اور رسم و رواج اور رہن سہن کو ایک دوسرے سے بچانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ لہذا وہ ایک دوسرے کے گھروں کے اندر کی باتوں سے واقف نہیں تھے۔

پاکستان کی عمر ابھی چار سال تھی اور ان مہاجرین کو اس گاؤں میں آئے تین سال ہوئے تھے۔ مجھوں نے صرف یہ بتایا کہ مقتولہ کا باپ برادری کا سربراہ ہے اور برادری پر اس کا اتنا رعب ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی بات باہر نہیں نکل سکتی۔ مقتولہ اور اس کے خاوند کے چال چلن کے متعلق مجھ پر پور نہیں لائے وہ اچھی نہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ مقتولہ کو خاوند نے قتل کیا ہے یا اس قتل میں اس کا ہاتھ ضرور ہے۔ سیرت اس پر تھی کہ مقتولہ کا باپ اپنے داماد پر شک کا اظہار کیوں نہیں کرتا تھا؟ اور یہ سوال ہمیں پریشان کر رہا تھا کہ خاوند نے اپنی بیوی کو کیوں قتل کیا؟ اور کیا یہ ہو سکتا تھا کہ باپ بھی اپنی بیٹی کے قتل میں شامل یا راضا مند تھا؟

کھا لو؟ تمہارے بیٹے نے اسے کہا تھا کہ کھانا کھا لو؟ یا تم دونوں نے کہا تھا کہ نہیں کھاتی تو نہ کھائے۔ جائے جھٹے میں؟“ بڑھیا کچھ گھبرائی مگر اس کے بولنے سے پہلے ہی خان صاحب نے کہا۔ ”میں تمہارے بیٹے کو چھانسی چڑھا دوں گا۔ سچ بتاؤ اُس نے روٹی کیوں نہیں کھائی تھی؟“

”میں نے سو بار کہا تھا کہ روٹی کھا لو۔“ بڑھیا کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے۔ ”مگر اُس نے نہ دوپہر کو روٹی کھائی نہ شام کو“

میں سمجھ گیا کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ڈاکٹر نے معدے کی کیفیت کبھی ہوگی کہ خالی تھا۔ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو ذہین اور دانش مند قاضی خان کی طرح کپڑوں کے اندر چھپا کر رکھتے ہیں اور ایسے موقع پر استعمال کرتے ہیں جہاں اس کا وار مشتبہ یا ملزم کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ منقولہ کے پاؤں کی کیفیت بھی ایسا ہی ایک خفیہ تھا جو خان صاحب نے صحیح موقع پر استعمال کیا اور معدے کی کیفیت کا استعمال بھی وقت پر کیا۔ اس کے ساتھ ماں کو یہ دھمکی دے کر کہ اس کے بیٹے کو چھانسی چڑھا دیا جائے گا، خان صاحب نے ماں کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی۔

ماں نے اپنا سینہ کھول دیا اور بتایا کہ اُس روز اس کے بیٹے نے صبح سچ اپنی بیوی کو مارا تھا۔ ماں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وجہ کیا تھی۔ منقولہ نے دوپہر کو بھی کچھ نہیں کھایا تھا اور شام کو بھی بھوک رہی تھی۔ خان صاحب کے اور میرے بہت سے سوالوں کے بعد یہ نئی بات معلوم

ڈھلکا ہوا تھا یعنی لاش کا پیٹ قاتل کے ایک کندھے پر یا گردن کے نیچے دونوں کندھوں پر تھا۔ سیڑھی سے اترنے لاش کے بال متوازی اور عمودی ڈنڈوں کے درمیان اٹک کر ٹوٹ گئے۔

یہ بال علالت میں پولیس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ یہ نفیث اور مجرم کی نشاندہی اور جرم کا پورا عمل سامنے لانے میں مدد دے سکتے تھے۔ اس دوران خان صاحب نے گھر کی تلاش لے لی مگر کوئی کام کی چیز برآمد نہ ہوئی۔ انہوں نے خاوند کو ہتھکڑی نہ لگائی۔ اُسے کانسیباؤں کے حوالے کر کے تھانے بھجوا دیا۔ منقولہ کی ساس کو انک بلا کر اس سے ایسا سوال پوچھا جو ابھی میرے ذہن میں نہیں آیا تھا کیونکہ میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ نہیں پڑھی تھی۔ خان صاحب نے منقولہ کی ساس سے پوچھا۔ ”جس رات تمہاری بھوکاڑی کے نیچے آئی اُس شام تمہاری یا تمہارے بیٹے کی اُس کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی؟“

”نہیں جی!“

”تمہارے بیٹے نے شام کا کھانا کھایا تھا؟“ خان صاحب نے پوچھا۔

”کھایا تھا۔“

”گھر کے سب لوگوں نے کھانا کھایا تھا؟“

”سب نے کھایا تھا۔“

”تمہاری بہن نے کیوں نہیں کھایا؟“ خان صاحب نے جواب کا انتظار نہ کیا تاکہ بڑھیا سنیں نہ جائے۔ اس سے پوچھا۔ ”تم نے اُسے کہا تھا کہ کھانا

دیری سے کہا۔ ”حرم زادی نے خودکشی کی ہے۔ زندہ رہی تو مصیبت
 بنی رہی، مر گئی تو مجھے پولیس کے حوالے کر گئی۔“

لڑکی کا چلن مشکوک تھا

مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ آدمی سچتہ کار ہے۔ آسانی سے ہاتھ
 نہیں آئے گا۔ میں نے بھی اپنا پورا زور لگا دیا۔ اتنی لمبی سردس کا سارا
 تجربہ آزما دیکھا مگر اُس نے ہر سوال کا جواب یہی دیا کہ مرنے والی کو قتل
 نہیں کیا گیا۔ اُس نے خودکشی کی ہے۔ اس نے خودکشی کی وجہ یہ بیان
 کی۔ ”میں اُس سے تنگ تھا وہ مجھ سے تنگ تھی۔ میں اُسے پٹیا تھا۔“
 خان صاحب نے غصے میں اکر کہا۔ ”ابھی اقبالی ہو جاتا ہے۔ میں مرجیں
 منگو تا ہوں۔“ انہوں نے ایک کانٹیل کو آواز دی، لیکن میں نے انہیں روک
 دیا۔ ہمارے پاس اقبالی بیان لینے کا ذریعہ موجود تھا۔ یہ تھوڑا ڈگری طریقہ
 تھا۔ مرجوں والا نسخہ عموماً کامیاب رہتا ہے لیکن میں اس کے خلاف
 تھا جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ کوئی استاد ہی نہیں تھی۔ ہم فخر سے نہیں
 کہہ سکتے تھے کہ ہم نے ایسے قتل کی کامیاب تفتیش کی ہے جس کی کوئی
 شہادت نہیں تھی۔

دوسری وجہ یہ کہ اقبالی بیان کوئی ایسی دستاویز نہیں ہوتی جو قاتل
 کو سزا دلانے میں ضرور کامیاب ہو۔ اگر کوئی آدمی یہ لکھ دے کہ اُس نے

ہوئی کہ شام کو خاوند نے مقتولہ کو چھت پر لے جانا چاہا تو مقتولہ نے انکار کر
 کر دیا۔ خاوند اسے مزید مارنے پٹینے کی بجائے پہلا پھسلا کر اوپر لے گیا تھا۔
 ہمارا شک یقین میں بدل چکا تھا کہ قاتل خاوند ہے اور ہم نے مقتولہ
 کے باپ کو بھی مشتبہ افراد کی فہرست میں رکھا۔ لڑکی یقیناً بد چلن تھی۔ باپ
 اس کی موت پر خوش تھا۔ یہ ہمارا خیال تھا۔ اس کے تحت ہم اسے بھی
 تھانے لے گئے۔ سیڑھی باقاعدہ کاغذی کارروائی سے قبضہ میں لے لی۔
 مقتولہ کا خاوند پہلے ہی تھانے بھیجا جا چکا تھا۔ ہم جب تھانے پہنچے تو
 رات اندھیری ہو چکی تھی۔ خان صاحب کے کانٹیل بڑے برخوردار تھے
 تھانے میں حاکم پتہ چلا کہ وہ پولیس کی روایات کے عین مطابق گاؤں
 سے چار مرغیاں پکڑ لائے ہیں۔ یہ مرغیاں سالم روٹ کی گئیں۔ ہم نے
 نہا دھو کر کھائیں اور مقتولہ کے خاوند کو بلایا۔

خان صاحب نے اسے کہا۔ ”اقبالی بیان دو گے یا میں مقدمہ قائم کر
 کے عدالت میں بھیج دوں۔ اس صورت میں ایسی شہادت پیش کر دوں گا
 جس سے تم ہزارے موت سے نہیں بچ سکو گے۔ اقبالی بیان دے دو گے
 تو تمہیں پچانسی سے بچا لوں گا۔“

”کیسا اقبالی بیان؟“ اس نے بڑے سچتہ لہجے میں پوچھا۔ ”میں
 نے کیا کیا ہے؟“

”اپنی بیوی کا قتل“

”آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے خان صاحب؟“ ملزم نے نہایت

ہے کہ میری بیٹی نے خودکشی کی ہے۔
”خودکشی کیوں کی ہے اُس نے؟“ میں نے پوچھا۔

”خاوند اُسے بہت تنگ کرتا تھا۔“

”تمہیں یہ معلوم تھا کہ خاوند اُسے کیوں تنگ کرتا تھا؟ اس کے خاوند کو تم نے کبھی روکا کیوں نہیں تھا؟ کبھی پوچھا کیوں نہیں تھا کہ وہ اُسے کیوں تنگ کرتا ہے؟“

”میں تو اپنی بیٹی کو سمجھاتا رہتا تھا کہ بیٹی میری عزت کا خیال کرو اور خاوند کو خوش رکھو۔“

”اور جانتے ہو تمہارا داماد کیا کہہ رہا ہے؟“ میں نے اپنا خصوصی حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ کہتا ہے کہ میرا سسر دھوکہ باز اور مکار ہے۔ اس کی بیٹی شادی سے بہت پہلے بدکار تھی۔ وہ کہتا ہے کہ ہندوستان میں میرا سسر وار دہائیں کیا کرتا تھا اور اپنی اس بیٹی کو رشوت کے طور پر تھانیداروں کے پاس بھیجا کرتا تھا۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اپنی بیٹی پٹواری کے پاس بھیج کر اس نے ایک آدمی کی زمین اپنے نام کرالی تھی اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ یہ باتیں اُسے یہاں آ کر شادی کے بعد معلوم ہوئی ہیں۔ تمہارے داماد نے اقبال جرم کر لیا ہے اور بیان دیا ہے کہ اُس نے بدکاری کی وجہ سے تمہاری بیٹی کو قتل کیا ہے۔“

نمل آدمی کو قتل کیا ہے تو صرف اسی بیان پر قانون اسے سزا نہیں دے سکتا۔ دفعہ ۱۴۳ تعزیرات پاکستان کے تحت مجسٹریٹ کے سامنے دیا ہوا بیان بھی اُس وقت تک بیکار ہوتا ہے جب تک کہ اس کے مطابق شہادت اور ثبوت موجود نہ ہو۔ پولیس کہے۔ جیسے دو دستاویزیں بہت ہی نازک اور خطرناک ہوا کرتی ہیں۔ ایک ہے ابتدائی رپورٹ جسے فسط انفارمیشن رپورٹ (ایبٹ۔ آئی۔ آر) کہتے ہیں اور دوسرا قبائلی بیان۔ نااہل تھانیدار کی قسمی ہوئی ایف۔ آئی۔ آر اور پالاک ملازم کا دیا ہوا قبائلی بیان عدالت میں پولیس کے کیس کو تباہ کر دیتا ہے۔

اس قتل کی واردات میں جہاں کوئی ٹھوس شہادت نہیں تھی نہ کوئی موثر قمر کا گواہ تھا، قبائلی بیان لینا نفی میں سستی کرنے اور عدالت میں ملازم کو شک کا قلمرو دلو کر بری کرانے کے مترادف تھا۔ پنپنا سچ میں نے خان صاحب کو مرچیں محفوظ رکھنے کا اشارہ کیا اور انہیں انگریزی میں کہا کہ میں مقتولہ کے باپ کو الگ لے جا کر لپیٹ میں لینا ہوں اور آپ اسے جرح کے جال میں پھانسنے کی کوشش کرتے رہیں۔ میں نے انہیں یہ کہا کہ آج رات نہ سوئیں گے نہ سونے دیں گے۔ میں مقتولہ کے باپ کو باہر صحن میں لے گیا۔ میں اب ایک اور طریقہ استعمال کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس شخص سے پوچھا۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری بیٹی کو تمہارے داماد نے قتل کیا ہے؟“

”قتل؟“ اُس نے حیران ہو کر کہا۔ ”نہیں جی، مجھے تو یہ معلوم

معرکہ سسر اور داماد کا

نے کہا۔ ”کہاں ہے وہ بوڑھا“ اُس نے گالیاں بکسیں اور کہا۔ ”ذرا اُسے یہاں لے آئیں خان صاحب!“

میں نے اس کی پیٹھ تھپکا کر کہا۔ ”گھبراؤ نہیں جوان! ہم اُسے تمہارے سامنے لے آئیں گے لیکن عدالت میں۔ وہ بیثبات کرنے کے لیے کہ تم چرسی، جواری اور زمری باز ہو، ایک درجن گواہیاں لا رہا ہے۔ اب ہمیں اقبالی بیان کی ضرورت نہیں۔ تمہارا جرم تمہارا سسر بیان کرے گا اور میں اپنے ہاتھوں تمہارے گلے میں پھانسی کا رستہ ڈالوں گا“ یہ کہتے کہتے میں باہر نکل گیا۔ دو کانسٹیبلوں کو بلا کر ایک ہدایت دی اور مقتولہ کے باپ کو اندر بلا کر لے گیا۔ جب سسر اور داماد نے ایک دوسرے کو دیکھا تو بیک وقت نشین گنوں کی طرح پھٹ پڑے۔ داماد شیر کی طرح اٹھا۔ سسر اُس کی طرف پکا۔ میں نے دو کانسٹیبلز انہی کے لیے بلائے تھے۔ انہیں یہی ہدایت دی تھی کہ اگر یہ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑیں تو انہیں پکڑ لیں۔ کانسٹیبلوں نے انہیں پکڑ لیا۔ میں جاننا تھا کہ دیہاتیوں کو بھڑکانا بلکہ پاکستان کی مخلوق کو جسے عوام کہا جاتا ہے، بھڑکانا اتنا ہی آسان ہے جیسے آتش بازی کی ہوائی کے پیچھے انکارہ لگا دو تو وہ شوں کر کے شہرے کھیرتی آسمان پر جا پہنچتی ہے۔ ان دونوں کے پیچھے بھی میں نے ایک ایک انکارہ رکھ دیا تھا۔ وہ بیک وقت ایک ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے۔ خان صاحب میری چال سمجھ چکے تھے۔ پولیس کے لیے یہ چال کوئی انوکھی نہیں تھی کسی

اس کا اثر وہی ہوا جس کی مجھے توقع تھی۔ وہ بھڑک اٹھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ غصے سے اُس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ اُس کے منہ سے صرف تنگی گالیاں نکل رہی تھیں۔ وہ داماد کو وہیں قتل کرنے پر تیار ہو گیا۔ میں نے اُسے بٹھا دیا اور کہا کہ ذرا صبر و کرو، میں ابھی تمہیں اس کے پاس لے جاؤں گا۔ میں اُسے پھانسی سے بچنے نہیں دوں گا۔ اُس نے تم جیسے عزت دار آدمی پر نہمت لگائی ہے۔

اسے یوں ہمدردی کے جال میں پھانس کر اُس کمرے میں گیا جہاں خان صاحب نے مقتولہ کے خاوند کو بٹھا رکھا تھا۔ خان صاحب نے کہا۔ ”ملک صاحب! یہ نہیں ماننا۔ مجھے دوسرا طریقہ اختیار کرنے دیں“ میں نے کہا۔ ”نہ مانے ہمیں پکی گواہی مل گئی ہے۔ اس کے سسر نے مجھے بتایا ہے کہ یہ شخص زانی اور چرسی ہے۔ اپنی بیوی سے بدکاری کرانا چاہتا تھا لیکن وہ ہمیں مانتی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ شہر جا کر یہ جوا کھیلتا تھا۔ میں اپنی عزت کی وجہ سے خاموش تھا۔ میری اتنی نیک بیٹی کو یہ شہر لے جانا چاہتا تھا۔ نہ مانی تو اسے قتل کر دیا اور اس کی لاش ریلوے لائن پر رکھ آیا“

مزم کارنگ سالو لانا تھا مگر غصے سے یہ رنگ بالکل ہی بدل گیا۔ اُس

واردات میں ملزم ایک سے زیادہ ہوں تو یہ طریق اکثر کامیاب رہتا ہے۔ ہم دونوں نمائندائیوں کی طرح ان کی گائیوں اور لغتوں کا تبادلہ سنتے رہے۔ ہمیں دل چسپی اپنے کام سے تھی۔ ان میں ایک یہ فقرہ بھی تھا جو داماد کے منہ سے نکلا۔ ”نیری چھوڑی ہوئی بیٹی کو کوئی قبول نہیں کرتا تھا۔ اُسے میں لے قبول کیا“

سسر نے کہا۔ ”اوتے بھکاری، مجھے میں بیٹی نہ دنیا تو ساری عمر کنوارا رہتا؟“

تقریباً نصف گھنٹہ انہیں ٹکرا کر یہ انکشافات ہوا کہ مقتولہ کی یہ دوسری شادی تھی۔ پہلے خاوند نے اُسے طلاق دے دی تھی کیونکہ اس نے ایک آدمی کے ساتھ آشنائی کر رکھی تھی۔ سسر کو ہم نے باہر بھیج دیا۔ مقتولہ کے خاوند سے ہم نے اس نئے انکشاف کے مطابق سوال کرنے شروع کر دیئے۔ اس سے اس کی تصدیق ہوئی کہ مقتولہ کی غیر مرد سے آشنائی کی وجہ سے طلاق ملی تھی۔ ملزم کو معلوم تھا۔ پھر بھی اس نے اُس کے ساتھ شادی کر لی۔ مقتولہ کا باپ اس لیے ملزم کو بیوی کو مارنے پٹینے سے نہیں روکتا تھا کیونکہ اُسے شک تھا کہ اس کی بیٹی نے از رو کسی سے تعلقات پیدا کر لیے ہیں۔ وہ اپنی بیٹی کو ہی قصودار سمجھتا تھا۔

میں نے خاوند سے پوچھا کہ کیا اس کی بیوی نے کوئی ایسی نازیبا حرکت کی تھی؟ خاوند نے وثوق سے بتایا کہ وہ پاک صاف رہی۔ اُس نے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ پھر میں نے پوچھا کہ وہ اُسے مارتا

پٹینا کیوں تھا؟ اُس نے وہی جواب دیا جو وہ پہلے دے چکا تھا۔ اب کے اُس نے یہ بھی کہا۔ ”میں اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتا تھا۔ اس سے وہ بد دماغ ہو گئی تھی۔ اس نے گھر کا کام کاج چھوڑ دیا تھا“

”اب انبالی بیان دو گے؟“ خان صاحب نے بڑے پیار سے پوچھا۔

”اپنے خدا پر یقین کریں خان صاحب! میں نے اُسے قتل نہیں کیا۔“

اس نے بدستور بڑے سچتے لہجے میں جواب دیا۔

میں نے اُسے سسر کی گواہیوں کی دھمکی دی تو اُس نے گالی دے کر کہا۔ ”اُسے کہو لے آئے گواہیاں، مجھے سولی پر کھڑا کر دو۔ ہاتھوں پر جلتے انگارے رکھ دو۔ میں یہی کہوں گا کہ میں نے بیوی تو قتل نہیں کیا۔“

میں نے پھر بھی خان صاحب کو مرحلوں کے نسخے سے روک دیا۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ مقتولہ کے پہلے خاوند اور اس کے آشنائوں کو بلاتے ہیں۔ خان صاحب نے اکتا کر کہا۔ ”ملک صاحب! آپ تو ریٹائرڈ لائٹ گنزار رہے ہیں۔ آپ کو شغل مل گیا ہے۔ میں پندرہ منٹ میں اس سے انبالی بیان لے لیتا ہوں۔ کل ۱۶۴ کا بیان کرا لوں گا۔“ لیکن میں نہیں مانا۔ مجھے واقعی شغل مل گیا تھا۔ تفتیش اور سرغرضانی کا مجھے چسکا تھا۔

اس کے علاوہ میں نے خان صاحب سے اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی بیوی کو کوئی اور ہی اٹھالے گیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خاوند کی آنکھ لگتے ہی خود ہی میچے آگ لگی ہو اور اُسے نہ شناسنے مار ڈالا ہو۔ مگر خان صاحب نے میرے اس خیال کو رو کر دیا۔

بسات یعنی ریفیوجی کیمپ میں رہے پھر اس گاؤں میں آکر آباد ہو گئے۔ یہاں کچھ مقامی لوگ بھی تھے۔ ابتدا میں مہاجر کنبوں کو قدم م پر مقامی باشندوں کی محتاجی محسوس ہوتی تھی۔ مہاجر گھرانوں ے ان کی آباد کاری میں بہت مدد کی لیکن اس میل جول کا یہ اثر ہوا۔ مقتولہ نے ایک مقامی آدمی کے ساتھ ناجائز مراسم پیدا کر لیے خاوند۔ پتہ چلا تو اس نے بیوی کو میکے بھیج دیا۔ اس کا میکہ اس گاؤں میں باد ہو چکا تھا جہاں اس کا دوسرا خاوند (مردم) بھی آباد ہو گیا تھا۔ ل باپ نے لڑکی کو سمجھا بچھا کر خاوند کے پاس بھیج دیا مگر اس نے ل آدمی سے ملنا نہ چھوڑا۔ آخر خاوند نے اسے طلاق دے دی۔

اس شخص سے کوئی اور بات معلوم نہ ہو سکی۔ میں نے قتل کے بعض بس اس قسم کے بھی دیکھے تھے کہ ایک آدمی نے بیوی کو کسی وجہ سے طلاق دے دی اور جب اس عورت نے دوسری شادی کر لی تو پہلے خاوند نے اسے قتل کر دیا۔ پکڑا گیا تو اس نے بیان دیا کہ میری عزت نے گوارا نہیں کیا کہ لوگ یہ کہیں کہ فلاں عورت اس آدمی کے گھر نہیں سی، اب دوسرے آدمی کے ساتھ خوش ہے۔ ایسے قتل عموماً دیہات میں ہوتے ہیں لیکن اس شخص کے انداز اور باتوں سے مجھے ایسا کوئی شک نہیں ہوا۔ اس نے دوسری شادی کر لی تھی اور مطمئن تھا۔ میں نے اس سے مقتولہ کے آشنا کے متعلق پوچھ لیا اور فارغ کر دیا۔ اُسی وقت کانسٹیبل کو اس دوسرے آدمی کو بلانے کے لیے بھیج

البتہ میری یہ بات مان گئے کہ مقتولہ کے پہلے خاوند اور آشنا کو بلایا جائے۔ مقتولہ کے باپ نے بھی تسلیم کر لیا کہ اس کی بیٹی کو بدکاری کی وجہ سے طلاق ملی تھی۔ اس سے ہم نے اس کے پہلے داماد کا اتنا پتہ پوچھا۔ وہ سات آٹھ میل دُور ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ وقت دیکھا۔ صبح کے پونے چار بج رہے تھے۔ خان صاحب نے اُسی وقت اسے بلانے کے لئے ایک کانسٹیبل کو روانہ کر دیا۔ مقتولہ کے خاوند کو ہم نے سوالات میں بند نہیں کیا۔ اُسے کانسٹیبلوں کے حوالے کر کے سونے کی اجازت دے دی۔ میں اور خان صاحب بھی سونے کے لیے چلے گئے۔

مقتولہ کا پہلا خاوند

اور آخری آشنا

ہم دس بجے تک سوئے اور گیارہ بجے تھانے میں چلے گئے۔ مقتولہ کا پہلا خاوند آیا ہوا تھا۔ اُس سے مقتولہ کے متعلق پوچھا تو اُس نے یہ سن کر کہ وہ قتل ہو گئی ہے کہا۔ ”اُسے خاوند نے قتل کیا ہوگا۔ میں نے اس پر رحم کیا تھا اور طلاق دے دی تھی۔“

اس سے صرف یہ پتہ چلا کہ ہندوستان (مشرقی پنجاب) کے ایک گاؤں میں اس کی شادی مقتولہ کے ساتھ دسمبر ۱۹۴۶ء میں ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک ٹھاک رہی۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں وہ ہجرت کر کے پاکستان میں آ گئے۔

موتی بھی دے دیئے تھے۔ مقتولہ اس کے احسانات اور سلوک سے اتنی متاثر تھی کہ اس آدمی نے ایک روز بدیتی کا اظہار کر دیا۔ مقتولہ نے اسے کہا کہ اس کے احسان چکانے کے لیے اس کے پاس اپنے آپ کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ وہاں سے ان کی خفیہ دوستی شروع ہو گئی۔ اُس کے خاوند کو بہتہ چل گیا تو اس نے مقتولہ کو طلاق دے دی۔

دنگٹوں کی جرح میں ہیں یہ آدمی صاف نظر آیا۔ کیس کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

اب ہمارے پاس مقتولہ کا خاوند رہ گیا تھا۔ مقتولہ کے باپ کو ہم نے گواہوں کی فہرست میں رکھ لیا اور اُسے کہا وہ شہادت مہیا کرنے میں ہماری مدد کرے۔ خان صاحب نے مقتولہ کے خاوند کو حوالہ میں بند کر دیا۔ دوسرے دن شہرے جا کر عدالت سے اس کا سات روز کاریمانڈے لیا۔ مجھے خان صاحب نے اپنے پاس روک لیا۔ کہنے لگے کہ کیس تیار ہو جائے تو میں گھر جاؤں۔

اُسی روز قتل کے دواور کیس آ گئے۔ یہ خاندانی دشمنی کے کیس تھے۔ دن کے وقت دو پارٹیوں کی کھلی لڑائی میں یہ قتل ہوئے تھے۔

ہمیں سی تفتیش کرنی تھی لیکن کام بہت تھا۔ خان صاحب تین روز اس میں مصروف رہے اور میں مقتولہ کے خاوند کو نرم کرنے یا شہادت یا بوث وغیرہ کے متعلق سوچتا رہا کرتے کرتے ریمانڈ کا آخری دن آ گیا۔ سات دن

دیا۔ اس دوران ہم دونوں ملزم (مقتولہ کے دوسرے خاوند) کو جرح دھمکیوں اور لالچ سے قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ ایسا پتھر نکلا جسے دو تختانیدار مل کر بھی نہ توڑ سکے۔ ہمیں ٹھوس شہادت کی ضرورت تھی جو ملزم کے سوا اور کوئی نہیں دے سکتا تھا۔ خان صاحب نے یہ بھی سوچا کہ اس میں چونکہ کوئی شک نہیں کہ یہ ملزم اپنی بیوی کا قاتل ہے اس لیے پیشہ درجہ ٹوٹے گواہوں کی خدمات حاصل کر لی جائیں۔ ہمارے بچہ ناکام ہو چکے تھے۔ مقتولہ کے باپ کے اثر و رسوخ سے جھوٹے گواہ آسانی سے مل جاتے جن میں سے ہم ایک دو کو یقینی شاہد بھی بنا سکتے تھے۔

شام سے ذرا پہلے مقتولہ کا آستانہ آ گیا۔ اس سے مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ مقتولہ سے طلاق کے بعد ملتا رہا۔ ہمیں قتل کا باعث معلوم کرنا تھا۔ یہ شادی شدہ آدمی تھا۔ وجہ یہ سوان تھا۔ عورتوں کے لیے اس میں کشش تھی۔ اس نے بالکل انکار نہیں کیا کہ مقتولہ کے ساتھ اس کی دوستی تھی۔ اس نے چھپانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ مقتولہ کے اُس کے سوا کسی اور کے ساتھ تعلقات نہیں تھے اور وہ اس قماش کی تھی ہی نہیں۔ مہاجر جب ان کے گاؤں میں گئے تو اس آدمی نے ان کی بہت مدد کی۔ مقتولہ اور اس کے خاوند کے ساتھ اس کے دو متانہ تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ وہ نیک بدیتی سے اُن کی مدد کرتا تھا۔ بل کے لیے اُس نے انہیں اپنے

ساتھ لے جانے آیا ہے۔

اُس نے جب اُس آدمی کا نام، ولایت، ذات اور گاؤں بتایا تو میں اور خان صاحب ہلک اٹھے۔ یہ آدمی خان صاحب کی حوالات میں بند تھا اور مقتولہ کا خاوند تھا جو اقبالی بیان دینے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ ہمیں جب پتہ چلا کہ وہ کسی اور کیس میں بھی ملوث اور مطلوب ہے تو ہم سمجھے کہ یہ پیشہ در مجرم ہے، اسی لیے پولیس سے ذرہ بھر نہیں ڈرتا مگر بات کچھ اور نکلی۔

سب انسپکٹر نے بتایا کہ اُس کے تھانے میں ایک عورت نے اپنے خاوند کو اس طرح زہر دیا ہے کہ وہ گھر آیا تو اُس عورت نے اسے پیالے میں دودھ ڈال کر دیا۔ خاوند نے دودھ پینا شروع کر دیا۔ دودھ تھوڑا سا رہ گیا تھا کہ اُس نے اپنے اندر تلخی سی محسوس کی۔ اُس نے باقی دودھ رکھ دیا اور کہا کہ دودھ کا ذائقہ تھیک نہیں ہے اور میرے پیٹ میں درد شروع ہو گیا ہے۔ خاوند کو شک ہوا۔ اُس نے اپنے بھائی کو بلا کر کہا کہ مجھے اس دودھ پر شک ہے۔ یہ دودھ اپنے قبضے میں رکھو۔ اُس کی بیوی نے اُس کے بھائی سے پیالہ چھیننے کی کوشش کی۔ اُس کے خاوند کی حالت تیزی سے بگڑنے لگی۔ وہ کہتا تھا کہ اندر آگ لگ گئی ہے۔

گاؤں کے سیانے کو بلایا گیا۔ اُس نے اُسے گھی میں کالی مرچیں ملا کر پلائیں۔ اُسے قے ہوئی مگر حالت اور زیادہ بگڑ گئی۔ گھر والوں نے اسے

کا مزید ریمانڈ لے لیا گیا مگر چار دن مزید گزر جانے کے باوجود ہمارے کام کی رفتار سست تھی۔ اس برادری میں اتنا سخت اتحاد تھا کہ کوئی بھی گواہی کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔ مقتولہ کے باپ کا اثر اور رعب بے کار ثابت ہو رہا تھا۔

ہمیں بتایا گیا کہ دو آدمیوں نے مقتولہ کے باپ کو یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر تمہارے داماد نے تمہاری بیٹی کو قتل کیا ہے تو اچھا کیا ہے۔ پہلے خاوند نے اُسے طلاق دی تھی، دوسرے نے قتل کر دی۔ وہ اسی قابل تھی۔ برادری میں بدکار عورت کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔

اپنے خاوند کو زہر پلا دیا

اب تو میں قائل ہو گیا تھا کہ مرحیوں اور چھینٹی والا نسخہ استعمال کیا جائے اور اگر یہ بھی ناکام رہے تو مقامی لوگوں سے گواہیے جمائیں۔ قتل ہوئے نیرہ دن گزر گئے تھے۔ اُس رات ہمیں تھوڑی ڈگری والا طریقہ آزمایا تھا۔ دن کے چار بج رہے تھے کہ ایک سب انسپکٹر پولیس دفتر میں داخل ہوا۔ بخان صاحب اُسے اچھی طرح جانتے تھے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ میں اُسے نہیں جانتا تھا۔ اُس نے پچیس چھبیس میل دور کے ایک دیہاتی تھانے کا نام لے کر بتایا کہ وہاں ایس۔ ایچ۔ او ہے اور وہ خان صاحب کے تھانے کے ایک آدمی کو شناخت اور شہادت کے لیے اپنے

حوالات سے نکال کر یہاں لے آتے ہیں۔ اس کے سامنے مکمل اقبالی بیان جو اس عورت نے دیا ہے سنایا جائے۔

ملزم کو حوالات سے نکال کر کمرے میں لایا گیا۔ سب انسپکٹر نے اس سے پوچھا۔ ”تم فلاں ولد فلاں ذات فلاں اور فلاں گاؤں کے ہو؟“ اُس نے جواب دیا۔ ”جی!“

اُس نے خاوند کی قاتلہ کا نام لے کر پوچھا کہ اسے جانتے ہو؟ ملزم نے دبی سی زبان میں لاعلمی کا اظہار کیا۔

سب انسپکٹر نے پوچھا ”مشرقی پنجاب کے فلاں گاؤں میں تم نے اس کے ساتھ شادی نہیں کی تھی؟ نکاح فلاں مولوی نے نہیں پڑھایا تھا؟ وہ ہمارے پاس موجود ہے۔ اسی گاؤں میں اگر آباد ہوا ہے، جہاں نہاری بیوی بیوی رہتی ہے“

”ہاں“ اُس نے خان صاحب سے مخاطب ہو کر جواب دیا۔ ”میں اُسے جانتا ہوں لیکن میں نے اپنی بیوی کو قتل نہیں کیا“

”تم نے قتل کیا ہے یا نہیں؟“ سب انسپکٹر نے کہا۔ ”اُس نے اپنے خاوند کو زہر دے کر قتل کر دیا ہے۔ پکڑی گئی ہے اور اُس نے اقبالی بیان دے دیا ہے۔“ اُس نے کہا ہے کہ اس نے تمہاری خاطر خاوند کو زہر دیا ہے“

یہ سن کر اُس نے سر جھکا لیا۔ میں نے سب انسپکٹر سے کہا کہ اسے ملزمہ کا سارا اقبالی بیان سنا دو۔ میں نے ملزمہ کا سراپہ اٹھایا اور کہا۔

سپار پانی پڑا لا اور شہر کی طرف دوڑ پڑے۔ شہر جو دراصل قصبہ تھا پانچ میل دُور تھا۔ وہ لوگ دودھ کا پیالہ جس میں تھوڑا سا دودھ تھا ساغند ہی لے گئے۔ قصبے کے سرکاری ہسپتال میں پہنچے تو یہ آدمی ابھی زہرہ تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو بیان دیا کہ اُسے بیوی نے دودھ دیا تھا جو پی کر اس کی یہ حالت ہو گئی ہے۔ بیان دیتے دیتے وہ مر گیا۔ پولیس کو ہسپتال میں بلایا گیا۔ دودھ قبضے میں لے لیا گیا۔ لاش کا پوسٹ مارٹم کیا گیا معدے کے ٹکڑے اور اجزاء در دودھ لاہور کیمیکل ایکزیمر کے معائنے اور رپورٹ کے لیے بھیج دیا گیا اور مقتول کی بیوی کو گرفتار کر لیا گیا۔

وہ عورت ذات تھی۔ عادی مجرم نہیں تھی۔ جذبات میں اگر خاوند کو زہر دے بیٹھی لیکن عین موقع پر پکڑی گئی اور جیب تھانے میں آئی تو درو کر پاگل ہو رہی تھی۔ سب انسپکٹر نے کہا کہ رونا محض بیکار ہے، اقبال جرم کر لو۔ میں تمہیں بچانے کی کوشش کروں گا۔ اس نے ملزمہ کو ایسے انداز سے تسلی دلانہ دیا کہ تھانیدار کو وہ اپنا مونس و غم خوار سمجھ بیٹھی۔ اس نے اپنے جرم کی وجہ پوری تفصیل سے سنا دی۔ اُس نے اپنے خاوند کو اس آدمی کی خاطر زہر دیا تھا جس نے اپنی بیوی کو قتل کر کے اُس کی لاش ریلوے لائن پر رکھ دی تھی، ہم سمجھ گئے کہ اس نے بیوی کو کیوں قتل کیا ہے۔ سب انسپکٹر نے اس عورت کا اقبالی بیان مختصر کر کے سنایا تو میں نے اُسے کہا کہ یہ آدمی اپنی بیوی کے قتل میں اس حوالات میں بند ہے مگر اقبالی بیان نہیں دے رہا۔ میں نے کہا کہ اُسے

”اچھی طرح سے سنو“ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

سب انسپکٹر نے سنایا کہ ملزم بڑی اچھی شکل و صورت کی جوان عورت ہے۔ اُس نے یہ اقبالی بیان دیا ہے کہ مشرقی پنجاب (ہندوستان) میں ملک کی تقسیم سے ایک سال پہلے اُس کی شادی اس ملزم کے ساتھ ہوئی تھی مگر اس شادی میں نہ ملزم کے والدین رضامند تھے نہ ملزم کے، کیونکہ ملزم کی ذات ملزم کی ذات سے نیچے سمجھی جاتی تھی۔ ملزم ادنیٰ ذات کا ہے۔ ان کی شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ہندوستان میں ملزم کا گاؤں ملزم کے گاؤں سے بارہ چودہ میل دُور تھا۔ ان کی ملاقات ایک خانقاہ کے عرس پر اس طرح ہوئی تھی کہ ملزم بھیڑ میں اپنی ساتھی عورتوں سے بچھڑ گئی تھی اور باد و باران کا ایسا طوفان آیا تھا کہ عرس پر جو ہزاروں ناظرین گئے ہوئے تھے مری طرح بھاگنے اور پناہیں ڈھونڈنے لگے۔ ملزم نے ملزم کو اکیلے دیکھ کر اس کی مدد کی۔ اُسے اپنے ساتھ ایک جگہ چھپا لیا۔ ملزم اپنی ساتھی عورتوں سے بچھڑ کر بہت پریشان تھی۔ طوفان سے وہ خوفزدہ ہو گئی وہ کمٹاری لڑکی تھی۔ روتی پھرتی تھی۔ ملزم نے اُسے پناہ میں لے کر سنبھال لیا۔ یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ فنان کا نذرین چار گھنٹوں بعد تھا۔ ملزم نے ملزم کو ساتھ لیا اور اُسے اُس کے گاؤں کی عورتیں بڑی مشکل سے تلاش کر دیں۔ ملزم کو یہ آدمی اس لیے بھی اچھا لگا

کہ اس نے اس کی مدد کی تھی اور ویسے بھی یہ اُسے پسند آ گیا۔ ملزم کے بیان کے مطابق پہلی ملاقات میں ہی انہوں نے پھر ملنے کا وعدہ کر لیا۔ اس کے بعد یہ اس طرح ملتے کہ یہ ملزم بارہ چودہ میل کا سفر طے کر کے ملزم کے گاؤں میں سے گزرتا اور ملزم اُسے دیکھ کر ایک خاص جگہ پہنچ جاتی۔ چند ایک ملاقاتوں کے بعد انہوں نے یہاں تک طے کر لیا کہ ملزم گھر سے بھاگ آئے گی اور ملزم اس کے ساتھ شادی کر لے گا حالانکہ ملزم کی منگنی برادری کی ایک لڑکی کے ساتھ ہو چکی تھی۔ اُس نے اپنے والدین سے کہا کہ وہ منگنی منسوخ کر دیں لیکن برادری کا قانون بڑا سخت تھا۔ ملزم نے دلیری کر کے اعلان کر دیا کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کرے گا۔

ایک رات لڑکی گھر سے بھاگ آئی۔ ملزم اس کے گاؤں کے قریب مقربہ جگہ پر کھڑا تھا۔ وہ لڑکی کو اپنے گاؤں میں لے آیا اور اپنے ایک دوست کے گھر رکھا۔ برادری ملزم کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھی۔ ملزم نے برادری سے کہا کہ وہ اس گاؤں سے ہی نکل جائے گا۔ ملزم کے والدین کو یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ ان کا جوان بیٹا ان سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائے۔ بہت تکرار اور بحث مباحثہ کے بعد ان کی شادی کرادی گئی لیکن گاؤں میں دونوں کو اچھوت قرار دے دیا گیا۔ ملزم کے گھر والوں کو پتہ چل گیا کہ ان کی بیٹی کہاں ہے۔ وہ کمزور لوگ تھے۔ گاؤں کی ادنیٰ ذات کے دو چار آدمیوں کو ساتھ لے کر

ملزم کے گاؤں گئے۔ انہیں بتایا گیا کہ اُن کی بیٹی نے باقاعدہ شادی کر لی ہے۔ وہ بیٹی سے ناراض ہو کر چلے گئے۔

تقریباً چھ مہینے بعد ملزم کے والدین نے اس کی خطا معاف کر دی اور اُسے اپنے خاوند کے ساتھ گھر آنے کی اجازت دے دی۔ وہ خاوند کے ساتھ اپنے گاؤں گئی۔ والدین اور گھروالوں نے اُن کی آؤ بھگت کی۔ اس کے بعد وہ دو دفعہ اپنے گاؤں گئی۔ تیسری بار وہ گاؤں گئی تو یہ ۱۹۴۷ء کے وہ دن تھے جب مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو چکا تھا۔ ملزم اپنے گاؤں میں تھا، ملزم نے اپنے گاؤں میں۔ ملزم کے گاؤں پر سکھوں نے حملہ کیا لیکن ملزم کا کنبہ ایک ہی روز پہلے گاؤں کے چند اور لوگوں کے ساتھ ہجرت کر چکا تھا اور ابھی راستے میں تھا۔ بہت سی مشکلات کا مقابلہ کرتے یہ لوگ پاکستان میں آ گئے اور والٹن (لاہور) کے ریفریجی کیپ میں چلے گئے جہاں ملزم کو ملزم کی ساری برادری مل گئی۔

ملزم کا باپ سکھوں کے ہاتھوں شہید ہو گیا تھا۔ ملزم نے اپنے خاوند کے متعلق پوچھا۔ اسے بتایا گیا کہ وہ نہیں آیا۔ ملزم کے گاؤں پر بھی حملہ ہوا تھا۔ اُس وقت ملزم گاؤں میں نہیں تھا۔ کہیں باہر چلا گیا تھا۔ گاتل والے وہاں سے ہجرت کر آئے اور لاہور کے والٹن ریفریجی کیپ میں پہنچ گئے۔ انہوں نے سارے کیپ میں اُسے ڈھونڈا۔ ہر روز نئے تانوں میں اُسے ڈھونڈتے مگر اس کا کہیں آنا پتہ نہ ملا۔ اب ملزم

کیپ میں آگئی تو یہ بھی اُسے ڈھونڈنے لگی مگر سارے لاہور کے اندر، مضافات میں اور کیپ میں لاکھوں مہاجرین میں کسی کو تلاش کرنا ناممکن تھا۔ ایک روز ان کے قریب کے ایک گاؤں کا ایک آدمی کیپ میں آیا۔ اُس کے خاندان کے بہت سے آدمی شہید ہو گئے تھے۔ اس نے ملزم کے متعلق کئی اطلاع دی کہ وہ پاکستان کے راستے میں مارا گیا ہے اور اُس نے اُس کی لاش دیکھی ہے۔۔۔۔۔ اُس نے نشانیاں بتائیں اور ثابت کر دیا کہ ملزم سکھوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ پھر تین ساڑھے تین سال گزر گئے۔ اس عرصے میں ملزم کی برادری اُس گاؤں میں آباد ہو گئی اور ملزم کا خاندان اس گاؤں میں آباد ہو گیا لیکن ملزم کو یہ علم نہیں تھا کہ اس کے خاوند (ملزم) کا خاندان کہاں آباد ہوا ہے۔ اس عرصے میں ملزم کی دوسری شادی بھی کر دی گئی۔ وہ ملزم کو یاد کر کر کے روتی رہتی تھی۔ اس کے گھروالوں نے اور دوسرے لوگوں نے اُسے سمجھا سمجھا کر اس کی شادی کرادی۔ ملزم کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ اس کا خاوند شہید ہو گیا ہے۔

ایک بیوی کے دو خاوند اور زہر کا پیالہ

دوسری شادی کے ایک سال بعد گاؤں پر کہ ملزم اپنے خاوند کے ساتھ پاکستان کے کسی مرحوم پیر کے عرس پر گئی۔ یہ لوگ پیر پرست تھے مشرقی پنجاب میں بھی عرسوں پر جاتے تھے۔ پاکستان میں بھی انہیں پیر، مزار اور

عرس مل گئے۔ ملزم نے اپنے اقبالی بیان میں کہا کہ وہ اپنے دوسرے خاوند کے ساتھ عرس پر گئی تو وہاں اسے پہلا خاوند نظر آیا۔ وہ نظر کا دھوکا سمجھی لیکن وہ واقعی اس کا پہلا خاوند تھا۔ ملزم نے اپنے دوسرے خاوند کو کھانے کی کوئی چیز لانے کے لیے بھیج دیا تاکہ اپنے پہلے خاوند کے ساتھ آزادی سے باتیں کر سکے۔ دوسرا خاوند عرس کی بھیڑ میں غائب ہو گیا تو ملزم اس ملزم سے ملی۔

ملزم اس کا پہلا خاوند ہی نہیں تھا بلکہ یہ دلوں کا سودا تھا۔ ان دونوں نے محبت کی خاطر اپنے والدین اور برادرین سے دشمنی مول لے لی تھی۔ دوسرا خاوند دلوں کے رشتے کو توڑ نہیں سکتا تھا۔ ملزم نے ملزم کو لگی ملاقات کے لیے ایک جگہ بتادی اور جلا ہو گئے۔ ملزم نے اپنے اقبالی بیان میں اپنی جذباتی حالت بیان کرتے ہوئے کہا کہ اسی وقت سے وہ اپنے دوسرے خاوند کو ایسا غیر آدمی سمجھنے لگی جس نے اسے زبردستی اپنا قیدی بنا رکھا ہو۔ اس نے دل کو سمجھا لیا تھا کہ پہلا خاوند مر گیا ہے۔ اس نے دوسرے خاوند کو قبول کر لیا تھا مگر پہلے خاوند کو دیکھتے ہی اس کا دماغ پھر گیا۔ وہ گھر میں خاموش رہنے لگی مگر روتی نہیں تھی۔ یہ سوچتی رہتی تھی کہ وہ دوسرے خاوند سے طلاق کس طرح لے اور اپنے پہلے خاوند کے پاس کس طرح پہنچے۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ اس کا پہلا خاوند (ملزم) بھی شادی کر چکا تھا۔

تین چار روز بعد ملزم پچیس میل کا فاصلہ طے کر کے ملزم کی بتائی

ہوئی جگہ پر چلا گیا۔ ملزم اچکی تھی۔ اس روزان کی باتیں تفصیل سے ہوئیں۔ ملزم نے اسے بتایا کہ کس طرح وہ اسے ڈھونڈتی رہی ہے اور کس طرح اسے اطلاع ملی تھی کہ ملزم سرحد پار ملا گیا ہے اور کس طرح اس گاؤں میں آکر اس کی شادی کی گئی۔ ملزم نے اسے بتایا کہ جب سکھوں کے حملے شروع ہو گئے تو اس کے گاؤں کے لوگ پاکستان کی طرف روانہ ہو گئے لیکن وہ ملزم کے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ وہاں رات کو پہنچا جب اس کا صفایا ہو چکا تھا۔ صبح کے وقت وہ پاکستان کی راہ پر روانہ ہو گیا۔ آدھے راستے میں اسے ملزم کے گاؤں کا ایک آدمی مل گیا۔ اس نے ملزم کو بتایا کہ ملزم کو سکھ لے گئے ہیں۔ یہ ایک غلط فہمی تھی۔

ملزم نے ملزم کو ملاقات پر بتایا کہ وہ وہیں سے واپس چلا گیا اور ملزم ڈھونڈتا رہا۔ ایک سکھ دوست نے اس کی مدد کی۔ آخر اس سکھ نے اسے پاکستان چلے جاتے پر مجبور کیا اور وہ دل پر پتھر رکھ کر ادھر آ گیا۔

پاکستان میں آکر وہ ملزم کے خاندان کو ڈھونڈتا رہا۔ اس دوران اسے لاہور میں اپنی برادری کا ایک آدمی مل گیا۔ اس وقت تک ایک سال گزر گیا تھا۔ یہ آدمی ملزم کو اس گاؤں میں لے گیا جہاں وہ آباد ہو گیا تھا۔ ملزم کو برادری کے چار پانچ آدمیوں نے یقین دلا دیا کہ ملزم اری گئی ہے اور اس کے خاندان کا بھی کچھ ہنہ نہیں۔ شاید سب مارے گئے ہیں۔ یہ حقیقت بعد میں کھلی تھی کہ یہ ایک سازش تھی۔ ملزم کے دل سے ملزم کا نام صاف کرنے اور برادری میں اس کی دوسری شادی

کرنے کے لیے یہ جھوٹ بولا گیا تھا کہ ملزمہ ماری گئی ہے۔ اس جھوٹ کے بعد ملزم کی شادی کر دی گئی۔

ملزمہ نے بیان میں کہا کہ اُسے جب یہ پتہ چلا کہ ملزم کو اس کی موت کی جھوٹی خبر سنا کر اس کی شادی کی گئی ہے تو اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اسے کیپ میں یہ جو اطلاع دی گئی تھی کہ ملزم کو سکھوں نے قتل کر دیا ہے، جھوٹ تھا اور یہ جھوٹ دونوں برادر یوں نے کیپ میں مل کر گھڑا تھا۔ اس خیال نے اُسے بھڑکا دیا۔ ملزم بھی بھڑک اٹھا۔ دونوں نے یہ طے کیا کہ ملزم اپنی بیوی کو طلاق دے دے گا اور ملزمہ اپنے خاوند سے طلاق لے لے گی مگر دیہاتی معاشرے میں طلاق لینا اور دینا ناممکن ہوتا ہے۔ لاشیں اور کلہاڑیاں چلتی ہیں۔ سر کھل جاتے ہیں۔ پھر موت، جیل یا جھانسی کا تختہ میاں بیوی کو چھڑا کرتا ہے۔ ملزم اور ملزمہ نے یہ طے کیا اور اگلی ملاقات کا دن مقرر کر کے مجرا ہو گئے۔

اگلی ملاقات میں ملزمہ نے ملزم کو بتایا کہ اس نے خاوند کو صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ وہ اُسے طلاق دے دے لیکن وجہ نہیں بتائی تھی۔ خاوند نے اُسے بہت مارا پیٹا اور وجہ پوچھی۔ ملزمہ نے یہ وجہ بتائی کہ ”میں اپنے پہلے خاوند کو دل سے نہیں اتار سکتی اور میں تمہیں دھوکا نہیں دینا چاہتی“۔

خاوند نے اُسے خانقاہوں اور مزاروں پر لے جانا شروع کر دیا اور ایک پیر سے تعویذ لاکر اُس کے گلے میں باندھ دیا۔ ملزمہ نے اپنے انتہائی بیان میں یہ الفاظ قلم بند کرائے۔ ”لیکن میرا پیر استاد یہ آدمی تھا جس کی خاطر

میں طلاق لینا چاہتی تھی، مجھ پر اب کوئی تعویذ اثر نہیں کر سکتا“۔ یہ ملزمہ کے جذبات کی شدت کی انتہا تھی، ورنہ دیہاتی لوگ خدا اور رسول کی بجائے پیروں اور خانقاہوں کو زیادہ مانتے ہیں۔ ملزم نے اُسے بتایا کہ اُس نے اپنی بیوی کو کہہ دیا ہے کہ وہ اُسے طلاق دینا چاہتا ہے لیکن بیوی کہتی ہے کہ وہ اسی کے گھر میں رہ کر کھا کر مر جائے گی۔

اس کے بعد وہ ملتے رہے اور ایک دوسرے کو بتاتے رہے کہ اُن کے غروں اور گاؤں میں کیا ہو رہا ہے۔ ملزمہ نے اپنے خاوند کے ساتھ بدسلوکی شروع کر دی تھی۔ خاوند اُسے مارتا پیٹتا تھا۔ جذبات اور جہالت نے اُن کی عقل پر قبضہ کر لیا اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ ملزمہ اپنے خاوند کو اور ملزم اپنی بیوی کو قتل کر دے۔ انہوں نے قتل کا دن مقرر کر لیا اور طے کیا کہ قتل کے دو روز بعد وہ اسی جگہ ملیں گے اور جب قتل کی تفتیش اُبل ہو جائے گی تو وہ ایسا ڈرامہ کھیلیں گے کہ لوگوں کے سامنے اس طرح ایک دوسرے کے سامنے آئیں گے جیسے اچانک اور اتفاقیہ آمانا سامنا ہو گیا ہو۔ پھر اُن کی دوبارہ شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔

دونوں برادریاں اس وجہ سے کوئی اعتراض نہیں کریں گی کہ یہ تو پہلے ہی خیال بیوی تھے اور اتفاق سے پھر اکٹھے ہو گئے ہیں مگر ان جہلوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسے اتفاق کو معجزہ کہا کرتے ہیں اور معجزے کسی قتل کر کے نہیں کیے جاتے۔ ان بد سنجوں کو یہ امید تھی کہ لوگ اس عجیب و غریب اتفاق پر غور ہی نہیں کریں گے کہ ”اتفاق سے“ وہی خاوند قتل ہوا

کیا تھا لیکن قیمت پیسوں کی شکل میں نہیں بلکہ اپنے جسم کی شکل میں دی کیونکہ حکیم کا مطالبہ ہی یہی تھا۔

اس بدکار خود ساختہ حکیم نے چھ بار اس لڑکی کو ہوس کاری کا نشانہ بنا کر زہر دیا تھا مگر لڑکی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ دودھ میں زہر کی مقدار کتنی ڈالے تاکہ وہ فوراً نہ مر جائے۔ لڑکی نے ساری پڑیا دودھ میں ڈال دی جس نے پیٹ میں جاتے ہی اثر دکھا دیا۔ خاوند نے کچھ دودھ چھوڑ دیا اور لڑکی پکڑ لی گئی۔ لاہور سے معدے کے اجزار اور دودھ کی رپورٹ آگئی۔ دودھ اور معدے میں سنگھیا پایا گیا۔ پولیس نے حکیم کو بھی گرفتار کر لیا تھا اور اُس کے گھر کی تلاشی لے کر سنگھیا کی کچھ اور مقدار، چرس، افیون اور اوٹ پٹانگ دوایاں قبضے میں لے لی تھیں۔ لوگ اسے سیانا کہتے تھے۔

سب انسپکٹر ملزم کا انقبالی بیان زبانی سنار یا تھا تو ہمارے ملزم کے آئسو جاری تھے۔ کبھی وہ سر جھکا لیتا اور کبھی سب انسپکٹر کا منہ ٹٹکتی باندھ کر دیکھنے لگتا۔ جب سب انسپکٹر بات ختم کر چکا تو ملزم نے خان صاحب سے کہا۔ ”خان صاحب! میرا بیان کھ لیں۔ میں نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے۔“ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”صرف ایک عرض کرتا ہوں کہ ایک بار مجھے اُس سے ملو ادیں اور اگر آپ کے اختیار میں ہے تو ہم دونوں کو ایک ہی تختے پر کھڑا کر کے بھانسی دینا۔“ یہ کہتے کہتے وہ

جس سے بیوی طلاق لینا چاہتی تھی اور وہی بیوی قتل ہوئی جسے خاوند طلاق دینا چاہتا تھا اور اتفاق ایسا ہوا کہ طلاق لینے اور دینے والے میاں بیوی ایسے نکلے جو دوسری شادیوں سے پہلے میاں بیوی تھے اور پھر سے میاں بیوی بن گئے۔ اگر یہ اردو یا پنجابی کی پاکستانی فلم ہوتی تو پولیس کے ملازم بھی کہنے کہ واہ واہ بڑی اچھی سٹوری ہے مگر یہ کہانی جب حقیقی رنگ میں پولیس کے سامنے آئی تو اس میں نہ خوبصورتی تھی نہ عقل۔ یہ جذبات اور جہالت کا بڑا ہی مہونڈا کھیل تھا۔

ملزم نے عین اُس روز خاوند کو دودھ میں زہر ملا کر پلا دیا جس شام ملزم نے بیوی کا کلا گھونٹ کر اُس کی لاش ریلوے لائن پر رکھی تھی مگر وہ مل نہ سکے۔ ملزم عین موقع پر پکڑی گئی اور ملزم کو میں نے اور خان صاحب نے پسیٹ میں لے لیا۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کی کارگزاری کا بالکل علم نہیں تھا۔ البتہ اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق انہوں نے اپنا اپنا کام کر دیا تھا۔ ملزم نے انقبالی بیان ایسی خوفزدگی کی حالت میں دیا تھا کہ اس نے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ قتل ایسا جرم ہے جو پیشہ ور قاتل کرتے ہیں تو کوئی کئی دن جزیاتی لحاظ سے سنبھل نہیں سکتے۔ اس قدر چرس یا شراب پیتے ہیں کہ اپنے آپ کو بے ہوش کر دیتے ہیں۔ قاتل کو سکون صرف اقبال جرم سے ملتا ہے یا پچھانسی کے تختے پر۔ یہ تو دیہاتی لڑکی تھی۔ اس نے فوراً اقبال جرم کر لیا اور یہاں تک بتا دیا کہ اُس نے گاؤں کے ایک مخدوپ سی قسم کے حکیم سے زہر حاصل

دھڑاڑیں مار مار کر رونے لگا۔
تھوڑی دیر بعد اُس نے پگڑی کے پلے سے آنکھیں مٹا کیں اور پانی مانگا۔ ہم نے اُسے پانی پلایا اور تھان صاحب نے اس کے لیے اپنے گھر سے کھانا منگوایا۔ ابھی ابھی وہ زور رہا تھا، لیکن اُس نے سکون کی آہ بھر کر اور مسکرا کر کہا: ”آپ نے اتنے دل گروے اور اتنی پکی زبان کی عورت کبھی دیکھی ہے؟ یہ بھی سوچو کہ وہ پنج ذات کی ہے۔ ادنیٰ ذات کی ہوتی تو ایسی دلیری کبھی نہ کرتی۔ پہلے خاندان کو قبول کر دوسرے کے ساتھ مست ہو جاتی۔“

ہم نے ان دونوں کی دلیری کی بہت تعریف کی۔
اُس نے پورے اطمینان سے اقبالی بیان دینا شروع کر دیا جو سارے تین گھنٹوں میں ختم ہوا۔ یہ سارے کا سارا بیان سنانے کی ضرورت نہیں۔ جرم کا آدھا پس منظر تو آپ ملزم کے اقبالی بیان میں سُن چکے ہیں۔ اس میں جو باتیں اور واقعات ملزم سے متعلق تھے اور ملزم کو معلوم نہیں تھے، وہ ملزم کی زبانی سُن لیجئے۔ اُس نے اس کی تصدیق کی کہ ملزم کے ساتھ اُس کی پہلی ملاقات عرس کے موقع پر طوفان میں ہوئی تھی۔ لڑکی اپنے گاؤں کی عورتوں سے بچھڑ گئی تھی۔ طوفان بڑے زور کا تھا۔ لڑکی کے پاؤں اکھڑ رہے تھے۔ وہ رو رہی تھی۔ ملزم نے اسے اپنے بازوؤں میں لے کر اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ ملزم ڈرے ہوئے بچے کی طرح اس کے ساتھ چپک لگی تھی۔ وہ اسے ایک مکان کے بچھوڑے لے گیا اور اُسے نسلی دلاسہ دے کر اس کا حوصلہ قائم کر دیا تھا۔ اُس نے ملزم کے ساتھ کوئی

ناروا بات نہیں کی تھی، نہ اُس کے دل میں کوئی بدبینی تھی۔ وہ اُس کی پناہ میں تھی۔ البتہ لڑکی اُسے بہت اچھی لگی تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے سے گاؤں کے نام پوچھے تھے۔

وہ بہت دیر تک وہاں بیٹھے رہے تھے۔ اس دوران ان کی اجنبیت اپنائیت میں بدل گئی اور یہ اپنائیت اتنی بڑھی کہ انہوں نے ملنے کے وعدے کر لیے۔ ملزم کے بیان کے مطابق ملزم نے بھی کہا کہ وہ اُسے ملنے جاتا رہا۔ ملزم نے قرآن کی قسم کھائی کہ انہوں نے محبت کو ناپاک نہیں ہونے دیا کیونکہ انہوں نے فوراً ہی شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لڑکی نے اُس سے ایک روز پوچھا کہ ذات کے اتنے بڑے فرق کا کیا علاج کر دے گا تو ملزم نے کہا تھا کہ تم قائم رہنا، میں جو کچھ کروں گا وہ ساری دنیا دیکھ گی۔

تھوڑے دنوں بعد ان دونوں نے جو کچھ کیا وہ ساری دنیا نے دیکھا۔ لڑکی کی یہ قربانی معمولی نہیں تھی کہ وہ گھر سے بھاگ آئی۔ ملزم کی قربانی یہ تھی کہ برادری نے اس کا حقہ پانی بند کرنے یعنی سوشل بائیکاٹ کرنے کی دھمکی دی اور سجن کی لڑکی کے ساتھ اُس کی سنگینی ہو چکی تھی، انہوں نے اسے قتل کی دھمکی دی۔ یہ دھمکی پوری بھی ہو سکتی تھی لیکن ملزم نے بھرے گاؤں میں کھڑے ہو کر اُن کے چیلنج کو قبول کیا۔ یہ دلیری غیر معمولی تھی۔ دیہات میں انہی باتوں پر خون خرابے ہوا کرتے ہیں۔

ملزم کو کسی نے قتل تو نہ کیا لیکن اس کے ساتھ برادری نے بول چال بند کر دی اور اس کے ساتھ اور اس کی بیوی (ملزمہ) کے ساتھ اچھوتوں کا

سے نکل گئی ہے۔ وہ گاؤں کے ہر ایک مکان میں گیا اور ملزمہ کی لاش ڈھونڈتا رہا مگر وہ اُسے نہ زندہ ملی نہ مردہ۔

رات اسی تلاش میں گزری گئی۔ صبح کے وقت وہ پھر گاؤں کے ہر ایک مکان میں گیا۔ اُسے بڑا ہی بھیاناک منظر نظر آیا۔ اُس نے جیلے ہوئے مکانوں کے کھنڈروں میں جا کے دیکھا۔ اُسے ملزمہ کی لاش نہ ملی۔ گاؤں والوں کی اُس نے کئی لاشیں دیکھیں۔ بارگروہ گاؤں سے نکلا اور اپنے گاؤں چلا گیا۔ اُس گاؤں کو وہ صحیح حالت میں چھوڑ گیا تھا۔ وہاں بھی اب درہی تباہی ختمی جو وہ ملزمہ کے گاؤں میں دیکھ آیا تھا۔

اُس نے اپنے بیان میں کہا کہ اپنے گاؤں میں گھومتے پھرتے اُسے ایسے لگ رہا تھا جیسے ملزمہ کے گاؤں میں گھوم پھر رہا ہو۔ اُسے اپنے گھر کے کسی فرد کی لاش نظر نہ آئی۔ اُس کا گھر خالی تھا اور ٹوٹا ہوا۔ وہ گاؤں سے نکلا۔ اُسے دُور بہت سے لوگ جلوس کی صورت میں جاتے نظر آئے۔ وہ اُن کی طرف چل پڑا۔ راستے میں اسے اپنے باپ کی لاش پڑی نظر آئی۔ اس کے جسم پر برہمچویں اور کلہاڑیوں کے بہت سے زخم تھے۔ ادھر ادھر گاؤں کے چند آدمیوں کی لاشیں پڑی تھیں اور ان میں دس بارہ کھول کی لاشیں بھی تھیں۔ ملزم نے بتایا کہ جب وہ پاکستان میں اپنے خاندان سے ملا تھا تو اُسے بتایا گیا تھا کہ گاؤں کے لوگ گاؤں سے نکلے تو سکھوں نے اُن پر حملہ کر دیا تھا۔ سکھ بہت زیادہ نہیں تھے۔ گاؤں والوں نے سکھوں کو گھر لیا اور جم کر لٹا دی ہوئی تھی۔

سلسلوک کیا۔ مثلاً پہلی بار وہ گاؤں کے کنوئیں پر پانی لینے گئی تو غورتوں نے اُسے کنوئیں کے قریب بھی نہ جانے دیا۔ وہ خالی گھڑالے کے واپس آگئی۔ اُس کے بعد ملزم خود کنوئیں سے پانی لانا رہا۔۔۔ پھر باتیکاٹ ختم ہو گیا۔ لڑکی اپنے گاؤں جانے لگی اور اگست ۱۹۴۷ء آ گیا۔

مشرقی پنجاب میں آگ اور خون کا طوفان آگیا۔ اُس وقت ملزمہ اپنے ماں باپ کے گھر گئی ہوئی تھی۔ مسلمانوں کا خون بہہ رہا تھا۔ گھر ٹٹ رہے تھے، جل رہے تھے اور اُن کی لڑکیاں اغوا ہو رہی تھیں۔ یہ طوفان ملزم کے گھر میں بھی آگیا۔ گاؤں کے لوگ وقت سے پہلے نکل گئے مگر ملزم ملزمہ کے گاؤں کی طرف چلا گیا۔ رات ہو چکی تھی۔ گاؤں کے کئی مکان جل رہے تھے۔ وہ گاؤں میں داخل ہوا تو وہاں چند ایک لاشوں کے سوا اُسے نہ کوئی انسان زندہ نظر آیا نہ کوئی موشی۔ سکھ گاؤں کا صفایا کر گئے تھے۔

وہ پاگلوں کی طرح ملزمہ کے گھر میں داخل ہوا۔ گھر خالی تھا۔ یہ کچا سا اور غریبانہ مکان تھا۔ وہاں کوئی لاش نہیں تھی۔ اُس نے ماچس جلا کر دیکھا۔ وہاں اُسے خون بھی نظر نہ آیا۔ گاؤں میں ڈرا دینے والی خاموشی تھی۔ اُس نے گاؤں کی گلیوں میں ملزمہ کو پکارنا شروع کر دیا۔ جہاں اُسے کسی لاش کے ساتھ ٹھوکر لگتی وہ ماچس جلا کر لاش کو غور سے دیکھتا۔ اُسے مختلف جگہوں پر تین جوان لڑکیوں کی برہنہ لاشیں نظر آئیں۔ اس نے چھوٹے چھوٹے بچوں کی بھی لاشیں دیکھیں۔ بڑی عمر کے آدمیوں کی لاشیں بھی نہیں مگر یہ بہت زیادہ نہیں تھیں۔ ملزم نے یہ اندازہ لگایا کہ گاؤں کی بیشتر آبادی گاؤں

ملزم نے سکھ دوست کو ملزمہ کے متعلق بتایا کہ اُسے اپنے ساتھ لیے بغیر نہیں جائے گا۔ سکھ نے اُسے سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ وہ پاکستان چلا جائے ورنہ اُسے بیوی تو نہیں ملے گی، مالا ضرور جائے گا۔ وہ نہ ملا۔ اس نے سکھ سے کہا کہ اگر مرد ہو تو دوستی نبھاؤ۔ یہ سکھ چونکہ اس کا دوست تھا اس لیے اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ملزم کی شادی ملزمہ کے ساتھ کس طرح ہوئی تھی۔ وہ دونوں کی قربانیوں اور محبت کو جانتا تھا مگر اُس کے لیے سب سے زیادہ ٹیڑھا مسئلہ یہ تھا کہ وہ ملزم کو چھپائے کہاں۔ سکھ مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے۔ ان کی نگاہوں میں دوست اور دشمن میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا۔ ان کی کرپائیں اور برچھیاں مسلمانوں کا خون مانگتی تھیں۔ اس سکھ نے اپنے دو تین سکھ دوستوں کی مدد سے ملزم کو چھپا لیا اور اُس کی بیوی (ملزمہ) کی تلاش شروع کر دی۔ مرن یہ معلوم کرنے میں ایک مہینہ گزر گیا کہ ملزمہ کے گاؤں پر کن لوگوں نے حملہ کیا تھا۔ دو چار سکھوں کے متعلق پتہ چلا تو اُن کے گاؤں جاکر لوٹکی کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ لوٹکی تو نہ ملی، چند ایسے سکھوں کا پتہ چل گیا جو اس حملے میں شامل تھے۔ اس طرح دو مزید مہینے گزر گئے۔

وہ لاشوں سے اُٹھے اور ملے

قصہ مختصر یہ کہ چار مہینے گزر گئے، ملزم کو اپنی بیوی کا سراغ نہ ملا۔

ملزم ایک قافلے کے ساتھ پاکستان کی طرف آرہا تھا۔ وہ ہر ایک آدمی اور ہر ایک عورت کو دیکھ رہا تھا۔ وہ چند قدم آگے چلتا اور مرک جاتا۔ اپنے قریب سے گزرتے لوگوں کو دیکھتا اور وہ کبھی پیچھے کو چل پڑتا اور پناہ گزنیوں کو دیکھتا جاتا۔ اس طرح اُس نے آگے کو کم اور پیچھے کو زیادہ فاصلہ طے کیا۔ یوں ہی لوگوں کو دیکھتے اور آگے پیچھے چلتے دن اور راتیں گزرتے لگیں۔ پناہ گزنیوں کے قافلوں اور نظاروں میں کمی نہیں آرہی تھی۔ ملزم ہوش گم کیے دیں کہیں پناہ گزینیوں کو دیکھتا رہا اسے بالکل یاد نہیں تھا کہ کب اور کہاں اُسے جان پہچان کا ایک آدمی ملا۔ وہ ملزمہ کو جانتا تھا۔ اُس نے ملزم کو بتایا کہ ملزمہ کو سکھ اٹھالے گئے تھے۔ اس خبر نے اُسے باؤ لگ کر دیا۔ اُس کے پاس کھانا ہی تھی۔ وہ سکھوں سے اپنی بیوی لانے کے لیے چل پڑا۔ وہ اب واپس جا رہا تھا۔ اسے ارد گرد کے ایسے گاؤں معلوم تھے جہاں مرن سکھ رہتے تھے یا جہاں اُن کی آبادی زیادہ تھی۔ اُن دنوں سکھ ہر طرف بھیڑیوں کی طرح غراتے پھر رہے تھے۔ ملزم کو ایک سکھ مل گیا جو اُس کا ہم عمر تھا اور اُس کا دوست بھی۔ سکھ دوستی باری مجھول چکے تھے لیکن یہ سکھ اُن چند ایک سکھوں میں سے معلوم ہوتا تھا جن کے دلوں میں دوستی بھی زندہ تھی۔ اُس نے ملزم کو دیکھا تو اُسے گھبرا کر کہا کہ اپنا منہ اور سر گڑھی میں چھپالے تاکہ سکھ اُسے سکھ سمجھیں ورنہ وہ مالا جائے گا۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ سکھ نے اُسے اپنی کرپان دے دی اور اس کی کھاناٹی لے لی۔ کرپان سرٹیفکیٹ تھا کہ وہ سکھ ہے۔

وہ دباں سے آنے پر راضی نہیں تھا لیکن اب اُسے اور زیادہ چھپایا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ سکھ دوست اور اُس کے دوستوں نے اُسے بتایا کہ جس محنت سے انہوں نے لڑکی کو تلاش کرنے کی کوششیں کی ہیں، اگر لڑکی یہاں ہوتی تو ضرور مل جاتی۔ وہ پاکستان چلی گئی ہے۔ ملزم بادل نخواستہ ان سکیموں کی مدد سے پاکستان آ گیا۔ لاہور میں وہ ریفیوجی کیمپ میں گیا۔ اس سے ایک دو روز پہلے ہی اُس کے علاقے کے مہاجرین کیمپ سے جا چکے تھے۔ اُس وقت تک کیمپ کا یہ عالم تھا کہ بارکوں میں، برآمدوں میں، میدانوں میں، دُور دُور تک، لٹیٹی مخلوق پھیل گئی تھی۔ سارا لاہور ریفیوجی کیمپ بن چکا تھا۔ راوی رود کے دونوں طرف پناہ گزین پڑے تھے۔ سرائوں اور گندڑوں میں، ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے مکانات میں اور جہاں کہیں سر چھپایا جاسکتا تھا مہاجرین نے پناہ لے لی تھی۔

ملزم ایسی ہر جگہ گیا جہاں مہاجروں نے پناہ لے رکھی تھی۔ اس کے بیان سے معلوم ہوتا تھا جیسے اُس نے لاہور کی ہر ایک اینٹ اور ہر ایک پتھر اکٹھا کر دیکھا ہو، مگر اُسے ملزم کا اور اپنے خاندان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ پھر وہ واپس اور گنڈا سنگھ والا بھی گیا۔ آخر لاہور میں اُسے ایک آدمی مل گیا۔ اس نے اُسے اس کے خاندان اور برادری کے متعلق بتایا۔ اسی آدمی کی رہائی اور اسی مالی مدد سے وہ اس گاؤں میں پہنچ گیا جہاں اس کی برادری کے کئی آدمی ہو چکے تھے۔ اُسے دیکھ کر سب بہت حیران ہوئے کیونکہ اس کے نام اطلاع ملی تھی کہ مارا گیا ہے۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ جس آدمی

نے اس کی موت کی اطلاع دی تھی، اُس نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اُس نے جولاں دیکھی تھی اس کا سر کھٹا ہوا تھا۔ چہرہ خون سے لٹخا ہوا تھا اور وہ بالکل ملزم کا چہرہ معلوم ہوتا تھا۔ ملزم کی ایک سال کی غیر حاضری بلکہ گمشدگی نے اُس کی موت کی اطلاع پر تصدیق کی مہر ثبت کر دی۔

ملزم نے انبیالی بیان میں کہا کہ ملزمہ کی جدائی اُسے اندر ہی اندر کھا رہی تھی۔ اُس کی بھوک اور نیند ماری گئی تھی۔ برادری نے (بعد کے اُکشان کے مطابق) تین چار ایسے آدمیوں کی زبانی یہ خبر مشہور کرائی کہ ملزم کی بیوی مشرقی پنجاب میں ماری گئی ہے اور اُس کا خاندان لاپتہ ہے۔ ملزم کو یقین دلا دیا گیا کہ ملزمہ ماری گئی ہے۔ اس کے بعد ماں نے اسے دوسری شادی کے لیے راضی کرنا شروع کر دیا۔ ملزم کا باپ مرجکا تھا۔ ماں کے جذبات کا ملزم کو بہت خیال تھا۔ اُس نے ماں سے کہا کہ اس کا دل ذرا سنبھل جائے تو وہ شادی کر لے گا۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ گاؤں میں کوئی ایسا رشتہ بھی نہیں تھا جو ملزم کو ملتا۔ ہندوستان میں ملزم کی مالی حالت اور برادری میں پوزیشن اچھی تھی کیونکہ اس کی اراضی بہت تھی۔ پاکستان میں اگر وہ بات نہ رہی۔ اس کی ماں اکیلی تھی۔ ملزم کے متعلق اطلاع ملی تھی کہ مر گیا ہے۔ گھر میں اور کوئی سیانا مر نہیں تھا، اس لیے انہیں معمولی زمین ملی۔ دوسرے گھرانوں کو خاصی اراضی مل گئی۔ اس وجہ سے ملزم کا شمار کمزور اور غریب لوگوں میں ہونے لگا۔ اُس نے بٹائی پر زمین بے لی۔ اس طرح وہ مزارع بن گیا۔ مقتولہ کو طلاق مل گئی۔ یہ بھی سب کو علم ہو گیا کہ مقتولہ کو بیکاری کے

یہ آپ ملزم کی زبانی سُن چکے ہیں کہ اس کے بعد وہ کس طرح ملتے رہے اور انہوں نے کیسا بھیانگ پروگرام بنایا۔ ملزم نے جس طرح اپنے خاوند سے طلاق مانگی، اُسے پریشان کیا اور پھر اُسے قتل کیا وہ بھی آپ سُن چکے ہیں۔ اب ملزم کی زبانی سنیں کہ اُس نے اپنی دوسری بیوی سے کس طرح آزادی حاصل کی۔

اُس نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ اسے طلاق دینا چاہتا ہے۔ بیوی سمجھی کہ وہ شاید اس کے چال چلن پر شک کر رہا ہے۔ وہ قسمیں کھانے لگی لیکن یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ ملزم نے یہ تو سوچا ہی نہیں کہ کسی عالم سے پوچھ لیتے کہ شریعت کے لحاظ سے اُس کی پہلی بیوی کی پوزیشن کیلئے ہے۔ یعنی ملزم کا پہلا خاوند زندہ تھا لیکن اس کی موت کی غلط خبر نے اسے کسی دوسرے کی بیوی بنا دیا۔ یہ شریعت کا مسئلہ تھا۔ یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں کہ پہلے خاوند کی موجودگی میں طلاق کے بغیر وہ دوسرے آدمی کی بیوی رہ سکتی تھی یا نہیں۔ انہوں نے جذبات سے مغلوب ہو کر ایسی جاہلانہ کارروائی کی جس کی کامیابی کے راستے میں پھانسی کا تختہ بھی تھا۔ ملزم نے دوسری بیوی کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ ملزم کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا کہ اصل وجہ کیلئے ہے۔ آخر یہ لڑکی انتقاماً منہ پھٹ ہو گئی۔ خاوند ایک کہتا وہ دوسنی۔ اس نے دو تین بار ملزم کی ماں کی بھی بے عزتی کی اور اس پر یہ الزام عائد کیا کہ وہ اپنے بیٹے کو اس کے خلاف بھڑکاتی ہے۔

الزام میں طلاق مل گئی ہے۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ اُس کا رشتہ لینے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ لڑکی جوان تھی۔ اس کے باپ نے ملزم کی ماں سے کہا کہ وہ اس کی بیٹی اپنے بیٹے کے لیے قبول کرے۔ ماں نے بیٹے سے کہا اور منت کی کہ وہ اس لڑکی کو قبول کرے۔ لڑکی کے باپ نے ملزم کو جہیز کے طور پر دو ایکڑ نہایت اچھی زمین پیش کی۔ ملزم نے زمین کی خاطر تو نہیں ماں کی خوشنودی کے لیے چھوڑی ہوئی لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔

ملزم نے اسے بیوی کا درجہ دے دیا لیکن ملزم کو دل سے نہ اتار سکا۔ تاہم بیوی کے ساتھ اُس نے کبھی بدسلوکی نہیں کی۔ اُس نے بیوی سے صرف یہ کہا تھا کہ تمہیں بدنامی کی وجہ سے طلاق ملی ہے۔ اگر تم نے مجھے بھی دھوکا دیا تو سارے گاؤں کے سامنے تمہاری گردن پر چھری پھیر دوں گا۔ ہماری نگاہ میں ملزم اتنا دلیر اور غیر متدد تھا کہ اس نے جو کہا وہ کر کے بھی دکھا سکتا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق یہ بیوی ہمیشہ اس کی دفا دار رہی اور اس کی خدمت بھی کرتی رہی۔ ملزم پر پرست اور خانقاہوں کا شیدائی تھا۔ وہ ابھی تک دعائیں کرتا پھر رہا تھا کہ اُس کی پہلی بیوی اُسے زندہ مل جائے۔ اُسے اس خانقاہ کا پتہ چلا جس کا عرس ہونے والا تھا۔ وہ عرس پر چلا گیا اور وہاں اُسے پہلی بیوی نظر آ گئی۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ تھی۔ ملزم بے قابو ہو گیا۔ اگر ملزم اُسے دیکھ کر اشارہ نہ کر دیتی تو ملزم اُسے اٹھا کر دوڑ پڑتا۔

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اس نے کہا کہ اُسے بالکل معلوم نہیں تھا کہ مرنے کے تین چار گھنٹے بعد لاش کو کاٹو تو خون نہیں نکلتا۔

آخری سفر اور زندگی کے میلے

اُس نے بیوی کو اوپر لے جا کر کہا کہ سو جاؤ۔ بیوی نے کہا کہ وہ اُس کے ساتھ باتیں کرنا چاہتی ہے۔ باتوں باتوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ بیوی نے ایسی جلی گئی باتیں کہہ دیں کہ ملزم کو سخت غصہ آیا۔ وہ اُسے تھوڑی دیر بعد قتل کرنا ہی چاہتا تھا۔ اُس نے غصے سے باؤ لاہو کر بیوی کا گلہ دلچ لیا اور چھوڑا اُس وقت جب وہ ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اس نے لاش کو چار پانی پر ڈال کر اوپر چادر ڈال دی اور گاڑی کے وقت کا انتظار کرنے لگا۔ گاڑی کی آخری آواز بھی خاموش ہو گئی۔ تقریباً چار گھنٹے بعد ملزم نے لاش کندھوں پر ڈالی مگر گنوار ہونے کی وجہ سے یہ نہ سوچ سکا کہ مقتولہ کی جوتی بھی سمیٹ لے جانا۔ جوتی وہیں پڑی رہی۔ وہ سیڑھی سے اُترا۔ گاڑی میں کسی کو نظر آئے بغیر باہر جانے کا راستہ اس نے دیکھ رکھا تھا۔ وہ گاڑی سے نکل گیا اور لاش ریلوے لائن پر اس طرف رکھ دی کہ گردن لائن پر اور دھڑ دھڑ لائنوں کے درمیان تھا۔ اُس وقت گاڑی ریلوے سٹیشن پر کھڑی تھی۔ وہاں سے سٹیشن تقریباً ڈیڑھ میل دُور تھا۔ اُسے انجن کی بتی نظر آ رہی تھی۔ وہ لائن سے تھوڑی دُور

آخری روز جس شام ملزم نے ملزمہ کے ساتھ قتل طے کیا تھا، ملزم نے بیوی پر رحم کیا کہ اُسے موت سے بچانے کے لیے کہا کہ وہ طلاق لے لے اور اپنے ماں باپ کے پاس چلی جائے لیکن اُس نے ملزم کو دھکی دی کہ وہ طلاق دے کر تو دیکھے۔ ملزم نے اُسے خوب پیٹا۔ وہ اندر بیٹھی رو رہی تھی۔ ملزم کی ماں باہر نکل گئی۔ ملزم نے قتل کی سکیم پہلے ہی بنا رکھی تھی اور سکیم ایسی بنائی تھی جس کے متعلق اُسے اُمید تھی کہ قتل کو چھپائے رکھے گی اور وہ پکڑا نہیں جائے گا۔

اس کے مطابق اُس نے اندر سے سیڑھی اٹھا کر مکان کے ایک موزوں پہلو کے ساتھ لگا دی۔ اُس روز اس کی بیوی نے دوپہر کو بھی کھانا نہ کھایا اور شام کو بھی نہ کھایا۔ دیہات میں لوگ شام ہوتے ہی سو جاتے ہیں۔ ملزم بیوی کو چھت پر لے گیا۔ وہ روزانہ چھت پر ہی سوتے تھے۔ بیوی (مقتولہ) اوپر جانے پر رضامند نہیں تھی۔ وہ کہتی تھی کہ تم مجھے بیوی ہی نہیں سمجھتے تو مجھے اوپر اپنے پاس کیوں لے جاتے ہو۔ وہ نہیں جا رہی تھی۔ ملزم نے سختی کرنے کی بجائے پیار کی جھوٹی قسمیں کھائیں اور اُسے اوپر لے گیا۔

وہ اُسے فوراً قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُسے گاڑی کے وقت کا علم تھا۔ اُس نے یہ سکیم بنائی تھی کہ گاڑی گزرنے کے وقت سے آدھا پونا گھنٹہ پہلے اُسے گلا گھونٹ کر مارے گا اور وہ آدھی رات کا وقت ہوگا۔ لوگ سوئے ہوئے ہوں گے۔ وہ لاش ریلوے لائن پر رکھ آئے گا۔ میرے

ایک درخت کی اوٹ میں جا کھڑا ہوا۔ گاڑی آئی۔ لاش کے قریب اگر آجین نے دسل سجائی اور پھر ساری گاڑی لاش کے اوپر سے گزر گئی۔

ملزم نے جا کر دیکھا کہ سر دھڑ سے کٹ کر ذرا دُور جا پڑا تھا۔ اُس نے یہ بالکل نہیں دیکھا کہ وہاں خون تھا یا نہیں۔ وہ گاؤں میں گیا اور بیڑھی سے اوپر چلا گیا۔ صحن میں اُس کی ماں سوئی ہوئی تھی۔ صبح کے وقت اُس نے باہر سے بیڑھی اٹھائی اور اندر لے جا کر ماں کو ڈانٹ دیا کہ اُس نے یہ بیڑھی باہر ہی رکھ دی تھی۔ اُسے اب امید تھی کہ کوئی نہ کوئی آکر اطلاع دے گا کہ اُس کی بیوی گاڑی کے نیچے آکر مر گئی ہے۔ ایسے ہی ہوا۔ وہ گاؤں والوں کے ساتھ دوڑتا گیا۔ بیوی کی لاش دیکھی اور جو سکیم اس نے سوچ رکھی تھی، اُس کے مطابق اُس نے مختلے میں اطلاع دی اور کہا کہ اس کی بیوی نے خودکشی کر لی ہے مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ مختلے میں ایک کی بجائے دو مختاں لار بیٹھے ہیں جو بال کی کھال اتار کر دکھا سکتے ہیں۔

ملزم نے بیان سب انسپکٹر کی موجودگی میں دیا تھا۔ پولیس وائے جذبات کے لحاظ سے پتھر مڑتے ہیں۔ پولیس کا کام ہی کچھ ایسا ہوتا ہے۔ لیکن ان دونوں میاں بیوی کی کہانی نے وہیں ہلا کر رکھ دیا۔ ہم انہیں قانون کے تشنگے سے نہیں سچا سکتے تھے۔ سب انسپکٹر اسی آدمی کو لینے آیا تھا، مگر وہ ایسی واردات میں ملوث تھا جو ملزم نے کی تھی۔ اقبالی بیان کسی ملزم کو سزا دلانے کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ ملزم اقبالی بیان میں جن افراد کا ذکر کرتا ہے، اُن کی حیثیت گواہ یا ملزم کی ہوتی ہے۔ اُن سے پوچھ گچھ اور

تصدیق ضروری ہوتی ہے اور اقبال جرم میں جن اشتباہ کا ذکر ہوتا ہے، وہ برآمد کر کے عدالت میں پیش کرنی پڑتی ہیں اور جن واقعات کا ذکر ہوتا ہے انہیں صحیح ثابت کرنے کے لیے شہادت فراہم کی جاتی ہے۔ اگر پولیس اقبالی بیان کی ایک بھی کڑی کمزور رہنے دے تو ملزم بری ہو سکتا ہے۔ ملزمہ کے اقبالی بیان کی کڑیاں ملانے کے لیے سب انسپکٹر ملزم کی شہادت لینے اور ملزمہ سے اس کی شناخت کرانے کے لیے ساتھ لے جانے آیا تھا۔ اب خان صاحب کو ملزمہ کی ضرورت پیش آگئی کیونکہ اُن کے ملزم نے اقبالی بیان میں ملزمہ کا ذکر کیا تھا۔

میں وہ منتظر کبھی نہیں بھول سکوں گا جب ملزم اور ملزمہ ملے تھے۔ یہ اس طرح ہوا تھا کہ ہم ملزم کو سب انسپکٹر کے مختلے میں لے گئے تھے۔ ملزم کو ہتھکڑی لگی ہوئی تھی اور ملزمہ حوالات میں بند تھی۔ قاعدے قانون کے مطابق ہمیں ملزم کو وہاں لے جانا چاہیے تھا یا نہیں یہ الگ بحث ہے۔ ہم تینوں مختاں لاروں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ انہیں کسی بہانے ملوایں گے۔ وہاں لے جا کر سب انسپکٹر نے ملزمہ کو حوالات سے نکال لیا اور اپنے کمرے میں لے جا کر ملزم کے ساتھ بٹھا دیا۔ ملزم کی ہتھکڑی نہیں کھولی جاسکتی تھی اور ایک کانٹیل کا اُن کے پاس ٹھہرا لازمی تھا۔ ہم تینوں باہر نکل آئے تھے۔

دونوں کے اقبالی بیان ایک ہی مجسٹریٹ نے قلمبند کیے تھے۔ دونوں مختالوں کی کچھری ایک ہی تھی۔ خان صاحب نے استغاثہ نہایت

مستحکم تیار کیا تھا۔ مقدمہ چلا۔ مجھے اس کیس سے بہت دلچسپی تھی۔ آخر سات آٹھ ماہ کے بعد دونوں کو عمر قید ہو گئی۔ عمر قید چودہ سال ہوتی ہے۔ ہر سال قیدی کو کچھ معافی دی جاتی ہے۔ قید کے عرصے کی معافی ملا کر قیدی دس سال بعد رہا ہو جاتا ہے۔

۱۹۶۳ء کے وسط کا ذکر ہے۔ ان دونوں کو جیل میں گئے گیارہ سال سے چند مہینے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ مجھے ایک روز یہ واردات یاد آ گئی۔ میں اُس نھانے میں گیا جہاں کبھی خان صاحب ہوا کرتے تھے۔ جب کوئی آدمی کسی جرم میں قید کاٹ کر گھر آتا ہے تو متعلقہ نھانے والے اُس کا نام ریکارڈ میں لکھ لیتے ہیں اور تھوڑا عرصہ درپردہ اس کی نگرانی کرتے ہیں کیونکہ یہ خطرو ہوتا ہے کہ جیل میں عادی مجرموں کے ساتھ رہ کر وہ بھی عادی مجرم نہ بن گیا ہو۔ میں نے وہاں کے نھانیار سے پوچھا کہ اپنی بیوی کا قاتل عمر قید پوری کر کے آچکا ہوگا۔

اُس نے ریکارڈ دیکھ کر بتایا کہ آٹھ تو مہینے ہوئے وہ آگیا تھا۔ گاؤں قریب ہی تھا۔ میں وہاں چلا گیا۔ اُس سے ملا۔ وہ بڑے پیار سے ملا اور مجھے گھر لے گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ خاوند کی قاتلہ اُس کی بیوی تھی۔ دونوں دس دس سال پورے کر کے رہا ہوئے تھے۔ یہ آدمی اُسے اپنے گاؤں لے آیا تھا اور انہوں نے اسے نو سکاچ پڑھا لیا تھا۔ ان کی عمر ستیس اتریس سال ہو گئی تھی مگر وہ اپنی عمر سے کم لگتے تھے۔ مقتولہ کا باپ بھی مرچکا تھا اور قاتل کی ماں بھی۔ بڑا دسری انہیں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتی تھی لیکن وہ آپس میں مطمئن تھے۔